ماہنامہ

# اطراف

کراچی

چیف ایڈیٹر: محمود شام

انتہاؤں میں رابطہ

جولائی 2024


120

"چھٹیاں نمبر"

ٹھنڈے پانی
کی ندیاں
ننگے پاؤں
کرسیاں
چارپائیاں

پاکستان کے حسین ترین مقامات۔ اور زندہ دل عوام

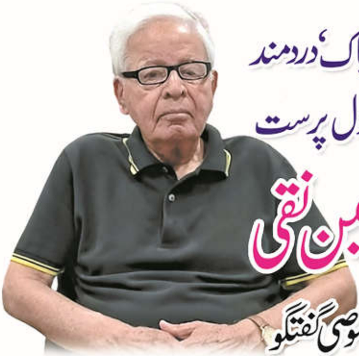

بے باک، دردمند
اصول پرست
حسین نقی
خصوصی گفتگو

اب بھارتی پارلیمنٹ میں ایک طاقت ور اپوزیشن لیڈر موجود ہوگا

پاکستانی ٹی وی ڈراما 20 سال سے ایک ہی جگہ کھڑا ہے

ہر باپ عظیم لائق تعظیم ۔ ملک بھر سے سعادت مند بیٹوں بیٹیوں کی اپنے والد کے احترام میں تحریریں


قیمت: پاکستان میں 400 روپے
بیرون پاکستان ۔ 5 ڈالر

WE CATER

FOR THE WHOLE FAMILY

VISIT OUR

SHOWROOM

ON

ZAIBUNISA STREET SADDAR

*For All Your*

*Footwear Needs*

**ENGLISH BOOT HOUSE**

SHOP ONLINE

@ WWW.EBHSHOP.COM

باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت ABC certified

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

# اطراف

کراچی

جلد 11: شمارہ: 7

جولائی 2024

قیمت فی پرچہ: 400 روپے۔ سالانہ: 4000 روپے۔ بیرون ملک۔ 50 ڈالر



چیف ایڈیٹر : محمود شام
mahmoodshaam@gmail.com

ایڈیٹر : خان ظفر افغانی

ریذیڈنٹ ایڈیٹرز: تنویر شہزاد (لاہور)، عبدالغفور چوہدری (کینیڈا)

نگراں شعبۂ اولاد۔ تربیت۔ تواضع : رخشندہ محمود نمائندہ خصوصی : محمد اجمل (کوئٹہ)

ڈیزائن : محمد شاہد رفیق : عکاسی : شکیل قریشی : مارکیٹنگ: محمد آصف : 0331-0063311

سرکولیشن منیجر: راجہ شاہد : 0300-8210636 , 0332-2561774

ویب سائٹ اہتمام : www.launchpad.pk

پبلک اور میڈیا ریلیشنز : دی پیسیج : www.thepassagepr.com

قانونی مشیر : نفیس صدیقی ایڈووکیٹ سپریم کورٹ nafislaw@cyber.net.pk



جولائی خاص

## زندگی سے بڑے لوگ

شہری آزادیوں کی جدوجہد کے سرکردہ رہنما حسین نقی سے خصوصی انٹرویو 29-33

پاکستان کے تفریحی مقامات پاکستانیوں کے منتظر
اطرافیہ 05

غذائیت میں افادیت
☆ سید ارتقا احمد زیدی 09

مودی ازم واقعی کمزور؟
☆ اطراف رپورٹ 11-13

کراچی میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں نوجوانوں کا قتل
☆ اطراف رپورٹ 15-21

عمر کا سورج
☆ سعیدہ افضل کی آپ بیتی 25-28

سیاحت، صحت اور معیشت دونوں میں تقویت
☆ صدام ساگر 35-36

جب امریکہ سپر طاقت نہیں رہے گا؟
☆ فرید زکریا 37-38

اسلام آباد سے سوات تک
☆ غزالہ خالد 39-43

اسکردو کا حسن و جمال
☆ ظہیر قندیل 45-49

خیبر پختونخوا میں تفریحی مقامات
☆ پروفیسر شاداب احمد صدیقی 51-53

مری کا سفر اور علی کی جیکٹ
☆ ریحانہ اعجاز، ڈیفنس 54-55

ہر باپ عظیم۔ لائق تعظیم
سکینہ ناصر، رانا محمد شاہد، شاہین رشید، طوبیٰ خلیل، علی فیصل، جویریہ یاسمین، ریحانہ اعجاز، میر حسین علی امام، فرزین لہرا، معذور بچی کا باپ، فریدہ انجم، نذر محمد کی تحریریں 57-66

لوٹ سیل۔ چھینا چھپٹی
☆ نسیم انجم، کراچی 73-74

قدیم سیدوں کی زبان۔ ہندکو
☆ ڈاکٹر محمد عادل 79-80

تذکرہ کتابوں کا
☆ خان ظفر افغانی 91-94


یونیورسٹیاں | تربیت | ٹی وی ڈرامہ | حسن و زیبائش | تیمارداری | یادداشتیں

لائبریریاں | سائنسی ادارے | معیشت | سیاحت | مشترکہ خاندان | بین الاقوامی کتابیں


ایڈیٹر پبلشر: طارق محمود شام۔ پرنٹر: اسلم ذکی عائشہ پرنٹرز۔ مقام اشاعت : اے 262 بلاک 3 گلشن اقبال کراچی۔

خط و کتابت صرف اس پتے پر: اے 262، بلاک 3 گلشن اقبال، کراچی۔ فون: 0300-8210636

ای میل: Mahmoodshaam@gmail.com ویب سائٹ: www.atraafmagazine.com

# Kundun

**Now Introduces 3 - 5 Pieces New Design Trolly Bags With Small Beauty Case Different Colour Original Fiber Material JIAN LUGGAGE Is The Best Way For Travelling**

**Also Deals in Shawls , Kashmir Shalws, Pashmina, Embroidery Shahtoosh, Kalamkar & Jamawar**

**Address: Adullah Haroon Road Opp. Hotel Metropole.**
**Ph: +92 21 35686641-42 Fax: +92 21 35684349**

## اطرافیہ

# پاکستان کے تفریحی مقامات پاکستانیوں کے منتظر

جنوبی ایشیا میں انتہائی حساس محل وقوع۔ اور 60 فی صد نوجوان آبادی والے عظیم ملک پاکستان کی آزمائشیں جاری رہتی ہیں کیونکہ یہاں 1985 کے غیر جماعتی انتخابات کے ذریعے تاریخ پاکستان کے سب سے سفاک فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق جس اشرافیہ۔ اور جن انتخابیوں کو مسلط کر گئے ہیں ان کی ہوس زر اور اقتدار کی بھوک ختم ہی نہیں ہوتی ہے۔ 2024 کے انتخابات میں عوام کی اکثریت کی رائے کو جس طرح اس اشرافیہ انتخابیہ اور مقتدرہ نے روند کر نااہل مخلوط حکومت کا تجربہ کیا ہے اس کی بدولت پاکستان ہر روز نئی نئی مشکلات سے دوچار ہو رہا ہے۔

پاکستان کے جفاکش۔ پرعزم عوام لائق تحسین ہیں کہ اپنی مٹی کی محبت میں وہ ملکی اور غیر ملکی آقاؤں کا ہر جبر برداشت کر رہے ہیں مگر اپنا ضمیر بیچنے سے انکاری ہیں۔

ماہنامہ 'اطراف' کی بنیادی کوشش یہ ہے کہ ہم ہر پاکستانی کو بلا جواز نسل و مذہب۔ بلا امتیاز قبیلہ و صوبہ اس کی اہمیت کا احساس دلائیں۔ ہر پاکستانی غریب ہو یا امیر۔ سرمایہ دار ہو یا ملازم۔ جاگیردار ہو کہ ہاری۔ وہ اپنی ایک اہمیت۔ حیثیت اور قدر کا حامل ہے۔ ملک کے اصل مالک عوام ہیں۔ پاکستان کا ہر گھر ایک قلعہ ہے۔ جہاں والدین اپنے کنبے کی سربراہی کرتے ہیں۔ اپنے گھر کو مستحکم بنا رہے ہیں ہم ہر پاکستانی گھر کے سربراہ پر زور دیتے ہیں کہ وہ اپنے بیٹوں بیٹیوں پوتوں پوتیوں نواسوں نواسیوں۔ بہوؤں دامادوں سے ہر اتوار کی دوپہر کھانے پر اکٹھے ہوں۔ ان کے ذہنوں میں تڑپتے سوالات کے تشفی بخش جوابات دیں۔ اس طرح ہر محلے والے اتوار کو نماز عصر کے بعد آپس میں ملیں۔ ایک دوسرے کی خیریت جانیں۔ اپنے مسائل کو اپنے وسائل سے حل کرنے کا آغاز کریں۔ محلے داری ایک ذمہ داری بھی ہے۔ ایک معاشرتی طرز رہائش بھی۔ آپس میں ایک دوسرے کو سمجھیں۔ پھر اس اجتماعی مفاہمت کو اپنے محلے اور شہر کے مسائل حل کروانے کے لیے۔ بلدیاتی۔ صوبائی اور قومی حکومتوں سے روابط اختیار کریں۔ ایک کونسلر سے لے کر یونین کونسل کے چیئرمین۔ شہر کے میئر۔ صوبے کے وزیر اعلیٰ۔ گورنر سے ملنے کے لیے وفد تشکیل دیں۔ شہری۔ صوبائی۔ قومی فیصلہ سازی میں اپنی شرکت کو یقینی بنائیں۔

ہر سال جولائی میں 'اطراف' ایک 'چھٹیاں نمبر' شائع کرتا ہے۔ پاکستان اپنے زمینی حسن سے دنیا کے چند خوبصورت اور حسن فطرت رکھنے والے ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب نیشنل ہائی وے اتھارٹی کے زیر اہتمام ملک بھر میں شاہراہوں کا ایک محفوظ۔ آرام دہ۔ سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ سڑک کے ذریعے خاندان اپنی گاڑیوں میں بھی سفر کرتے ہیں۔ آرام دہ بڑی بسوں میں بھی شمالی علاقوں کا رُخ کرتے ہیں۔ بہت معقول سیاحتی سہولتیں۔ اور پیکج دے رہے ہیں۔ 'اطراف' کی کئی برس سے یہ کوشش ہے کہ جو خاندان خاص طور پر متوسط طبقے کے گھرانے جن قابل دید تفریحی مقامات کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس میں قارئین 'اطراف' کو بھی شامل کریں۔ ہم ایسی تحریریں 10 سال سے شائع کر رہے ہیں کہ ان تفریحی۔ پہاڑی علاقوں میں ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کو کیا کیا مشکلات ہیں۔ کیا کیا سہولتیں ہیں۔

'اطراف' کو فخر ہے کہ ہم نے عام متوسط گھرانوں کی مالی استطاعت کے مطابق اپنے عظیم وطن کے حسین ترین مقامات کے نہ صرف حسن بلکہ تاریخ۔ معاشرت اور سہولتوں کی تفصیلات شائع کی ہیں۔ جن کے توسط سے چھٹیوں میں اپنے ملک کی سیاحت کا مزید شوق پیدا ہوا ہے۔ یہ امر تو سالہا سال سے توجہ طلب ہے کہ وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے زیر اہتمام سرکاری سیاحتی محکموں کے سربراہ افسر اور عملہ اتنی دلچسپی اور اشتیاق سے خدمات انجام نہیں دیتا جو ہمارے ہم وطن یورپ۔ امریکہ کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے شہروں میں دیکھتے ہیں۔ مہمان نوازی تو مشرق کی ہمیشہ سے ایک خصوصیت رہی ہے۔ اب میزبانی باقاعدہ ایک صنعت کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ پاکستان کے حکمران اگر نیک نیتی سے ملک کے تاریخی۔ روحانی۔ مذہبی مقامات۔ تفریحی جگہوں پر مہمان نوازی کے انتظامات کو معیاری کر لیں۔ شاہراہیں پہلے اتنی عمدہ نہیں تھیں۔ اب ان تفریحی مقامات تک شاہراہیں اعلیٰ معیار کی ہیں۔ اب ضرورت ان علاقوں میں رہائشی سہولتوں کے معیاری اور معقول بنانے کی ہے۔

آج کل چھٹیاں ہیں۔ بڑے شہروں میں خاندان بڑی تعداد میں اندرون ملک لطف اندوز ہونے کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ اگر ان سب کو تحفظ کا یقینی احساس ہو۔ سوات میں حالیہ واردات نے بہت سے خدشات اور سوالات پیدا کر دیے ہیں۔ مقامی انتظامیہ کا فرض ہے کہ وہ حالات پر نظر رکھیں۔ ایک طرف دور دراز علاقوں سے اپنے بچوں کے ساتھ آنے والے اہل خانہ کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ دوسری طرف ایک سال سے چھٹیوں کا انتظار کرنے والے تاجروں۔ ہوٹل مالکوں۔ اور دوسرے لوگوں کی مالی ضروریات کا معاملہ ہے۔ حسد رقابت میں مذہب کا سہارا لے کر اس علاقے کو غیر محفوظ کرنے کے لیے ایسے اقدامات کا قلع قمع شروع میں ہی ہو جانا چاہئے۔ علمائے کرام اس رویے پر ملکی مذمت کر چکے ہیں۔ ان مساجد کی انتظامیہ سے بھی باز پرس ہونی چاہئے جن کے لاؤڈ اسپیکر مقامی لوگوں کو مشتعل کرنے کے لیے استعمال کیے گئے۔

ماہنامہ 'اطراف' کے چھٹیاں نمبر سے ہماری خواہش یہی ہوتی ہے کہ دردمند پاکستانیوں کو اپنے ملک کی خوبصورتی۔ بلند چوٹیوں۔ پُرفضا مقامات سے آگاہی ہو۔ وہ اپنے سمندر پار پاکستانیوں کو بھی ان مقامات کی دلکشی سے روشناس کروائیں۔ وہ یہاں آ کر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سوئٹزرلینڈ۔ بلجیم۔ ڈنمارک۔ فن لینڈ۔ آئس لینڈ سے بھی زیادہ حسین بلندیاں عطا کی ہیں۔

ہم منتظر ہیں کہ جن خاندانوں کو بھی ان مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا ہے وہ اپنی تصویریں اور ان لمحات کی رُوداد 'اطراف' کی صفحات کے لیے عنایت کریں۔

محمود شام

Invest In Unforgettable Travel Experiences
Air Ticket
VISA Processing
Tour Packages
Hotel Booking
Car Rentals
PASSPORT
POLANI'S
PRIVATE LIMITED
TRAVEL AGENT & TOUR OPERATOR
Mr. Abdul Jabbar
0333-2115420
Mr. Arsalan
0345-9996683

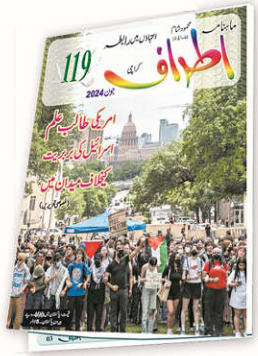


# السلام علیکم اطراف

## عبدالحکیم ثمر۔ ’اطراف‘ کے خیرخواہ چل بسے

میں نوید حسین آپ کو یہ اطلاع دینے کے لیے خط ارسال کر رہا ہوں کہ یکم مئی کو میرے والد عبدالحکیم ثمر صاحب کا انتقال ہوگیا ہے میں نے آپ کے رسالے پر دیے گئے نمبر پر فون کر کے اطلاع دینے کی کوشش کی مگر آپ سے رابطہ نہ ہوسکا۔ آپ نے بلا معاوضہ کئی سال ’اطراف‘ ارسال کیا ان کے شوق کو تسکین بخشی اس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ اب مزید آپ رسالہ نہ ارسال کریں۔ میرے والد کی میرے والد کے ساتھ یہ سلسلہ بھی اب ختم ہوگیا۔ (نوید حسین، کراچی)

(آپ سوچ لیں ۔ ’اطراف‘ کا یہ سلسلہ اب بھی جاری رہ سکتا ہے۔ عبدالحکیم ثمر صاحب کی روح خوش ہوگی کہ ان کے اہل خانہ یہ رسالہ پڑھ رہے ہیں۔ ادارہ)

## پاکستان خطے میں بھرپور قائدانہ کردار ادا کرے

برادر محترم افغانستان کا معاملہ اس کی وجوہ، اس کے ممکنہ اثرات اور اس کا ممکنہ حل اتنا آسان نہیں بلکہ بہت پیچیدہ ہے۔ لیکن ایک بات اٹل ہے کہ اللہ رب العزت کی ذات اقدس کے بعد روئے زمین پر کوئی قوم، ریاست یا حکومت افغان قوم، ریاست یا حکومت کی مددگار ہوسکتی ہے یا ان کے معاملات کو حل کرنے میں ان کی معاونت کرسکتی ہے یا خطے میں دہائیوں سے پھیلی ہوئی بدامنی کا خاتمہ کرسکتی ہے تو وہ صرف اور صرف پاکستان ہے۔ یہ بات کوئی مانے یا نہ مانے، کسی کو اچھی لگے یا بری حقیقت صرف یہی ہے۔ لیکن اگر ہمارے افغان بھائی یا آپ جیسے ہمارے لوگ باقی ساری طاقتوں بشمول افغان طالبان کو کلین چیٹ دیکر سارا کا سارا ملبہ پاکستان پر ڈالیں گے یا محض پاکستان کو فساد کی جڑ سمجھیں گے یا دنیا بھر میں پھیلی ہوئی بدصورتی و بدبختی کو پس پشت ڈال کر ہمارے چہرے پر موجود چھوٹے سے تل کو دیکھ کر ہم سے کراہت بھرے انداز میں گفتگو کریں گے یا ہمارے افغان بھائی روس، امریکہ، ہندوستان اور ایران جیسے ممالک کی انتہاء درجے کی زیادتیوں کو فراموش کر کے صرف ہمیں آنکھیں دکھائیں گے یا اپنی بندوقیں ہم پر تانیں گے یا ہماری سرزمین کو جہنم کدہ بنانے کی تگ و دو کریں گے تو یہ بات نا قابل قبول ہے۔ اب ہمیں اس گھسے پٹے فلسفے کو ردی کی ٹوکری میں پھینکنا ہوگا کہ افغانستان ایشیا کا دل ہے اور یہ کہ افغانستان میں امن ہوگا تو ایشیا میں امن ہوگا بلکہ اب ہمیں اس فلسفہ اور نظریہ کی ترویج کرنی ہوگی کہ ایشیا سمیت پورے شرق وغرب کا دل پاکستان ہے اور جب تک پاکستان میں امن و استحکام نہیں ہوگا اس وقت تک پورے خطے میں امن و استحکام ناممکن ہوگا اور ہمیشہ جنگ و جدل اور عدم استحکام کے خطرات منڈلاتے رہیں گے۔ اس خطے کے معاملات بشمول عربوں کے معاملات اور وسطی ایشیا کے ممالک کو درپیش معاملات اس وقت تک حل نہیں ہوسکتے جب تک پاکستان مصلحت کی تمام چادریں تار تار کر کے اس خطے میں اپنا بھرپور قائدانہ کردار ادا نہ کرے۔ اس معاملے پر میں اپنی سوچ، فکر، نظریئے اور سیکیورٹی پیراڈائم سے آپ کو وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہوں گا۔ آخر میں میں صرف ایک بات کہنا چاہوں گا کہ پاکستان کو نظرانداز کر کے یا پاکستان کو آنکھیں دکھانے سے مزید تباہی پھیلے گی۔ (عزیز خان، بانی و چیئرمین، دی گریٹر پاکستان موومنٹ، اسلام آباد، پاکستان)

## جناب طارق محمود کی انتہائی قیمتی تجاویز

السلام علیکم۔ امید ہے آپ اور سب وابستگانِ اشاعتِ ماہنامہ ’اطراف‘ بخیریت ہوں گے۔

10 مئی 2024 تک شمارہ نہیں پہنچ سکا۔ آپ اور تمام تر قلم کار جن کی تحریروں سے ’اطراف‘ مزین ہوکر زیورِ طباعت سے آراستہ ہوتا رہا سے استفادہ کے لیے شروع سے لے کر اب تک جتنے بھی شُمارے شائع ہو چکے، کا اشاریہ بھی مرتب دیا جانا چاہئے۔ تاکہ قارئین تحریروں جو کبھی پرانی نہیں ہوتی ہیں سے مستفیض ہوتے رہیں۔ اب 118 سے زائد شُمارے شائع ہو چکے ہیں۔ خریدکنندہ اور قاری کو نہیں معلوم کہ ان سب کے اندر کیا کسی عنوان سے کس موضوع‘ کس کس نے اظہار خیال کیا ہے۔

خریدار اور قاری کی حیثیت سے مجھے تمام شُماروں کی قدر و قیمت معلوم ہے کہ ان سب میں معلومات کے خزانے ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ اپنی اہمیت افادیت نزاکت کے اعتبار سے تاریخ کا حصہ بنیں گے۔

آپ نے ایک مرتبہ تحریر فرمایا تھا کہ میرا صحافت سے عشق بہ صورت اجرائے ماہنامہ آخری ہے۔ تو پھر مشورۃً عرض ہے کہ اپنے محبوب کے حسن میں ایک اور اضافہ کردیتے وہ آج تک کے تمام شماروں کا اشاریہ۔ شمارہ نمبر، مہینہ و سال اشاعت نام تحریر کنندہ، عنوان، موضوع، صحت، تعلیم،

# قارئین کے خطوط

دین، معیشت، مصاحبے، انٹرویوز، فلم، ٹی، شاید یہ کام ہو چکا جس کے بارے میں مشورۂ عرض کیا تھا کہ تمام اطرافیہ علیحدہ سے کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوں، اور آپ کی اسلام آباد کی ڈائری جو آپ اخبار جہاں میں لکھا کرتے تھے۔ آپ کی ایک کتاب روبرو بھی تھی جس میں انٹرویوز شائع ہوئے تھے۔

'اطراف' میں جو تحریریں اقساط میں شائع ہوتی ہیں آئندہ شماروں میں (جب تک اقساط جاری ہیں) ان کی Cross-Referencing ہونی چاہئے۔

متعدد بار مجلسِ ادارت آپ کی سربراہی میں قارئین کرام کی آراء بعض تحریروں کے بارے میں طلب کرتی ہے۔ کبھی اتفاق نہیں ہوا کہ کسی قاری کا جواب تبصرہ تنقیدی نقطۂ نگاہ شائع ہوا ہو۔ البتہ ایک دو بار راقم کے تبصرے شائع ہوئے ہیں جو از خود قاری کی حیثیت سے لکھے تھے۔ اور بعض تبصرے ابھی معرضِ التوا میں ہیں۔

ہر شمارے کا ایک سیریل نمبر ہے جو ماہانہ صحافت میں ایک جدت ہے۔

گزشتہ چند مہینوں سے وہ لفافۂ خاکی عمدہ صنعت کا Superior Quality جس میں ماہنامہ ملفوف ہو کر پہنچتا ہے قابل ستائش قدم ہے۔ اور عقب پر وصولیابی کے ضمن میں ایک سوال نامہ بھی

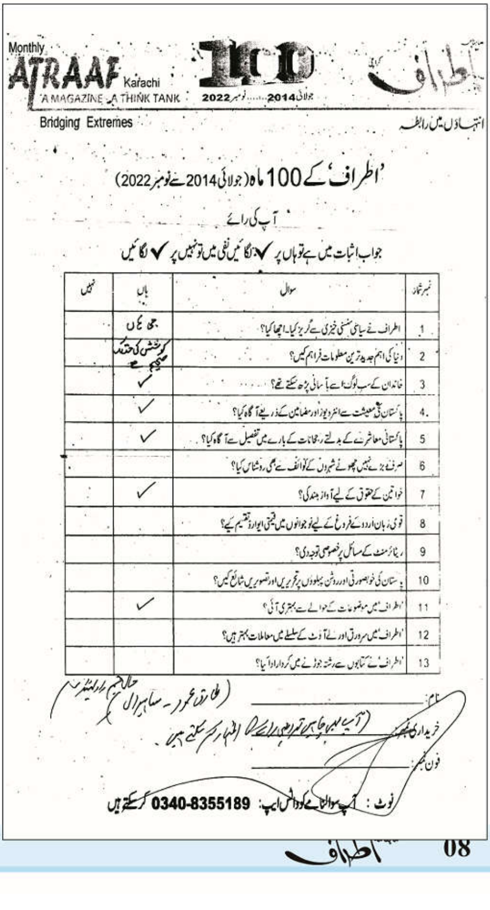

Monthly ATRAAF Karachi
A MAGAZINE A THINK TANK
Bridging Extremes

100

ماہنامہ اطراف کراچی

جولائی 2014 ...... نومبر 2022

انتہاؤں میں رابطہ

'اطراف' کے 100 ماہ (جولائی 2014 سے نومبر 2022)

آپ کی رائے

جواب اثبات میں ہے تو ہاں پر ✓ لگائیں نفی میں تو نہیں پر ✓ لگائیں

| نمبر شمار | سوال | ہاں | نہیں |
|---|---|---|---|
| 1 | اطراف نے سیاسی سنسنی خیزی سے گریز کیا۔ اچھا کیا؟ | جی ہاں | |
| 2 | دنیا کی اہم جدید ترین معلومات فراہم کیں؟ | کوشش کی حتی کہ صحیح ہے | |
| 3 | خاندان کے سب لوگ اسے آسانی پڑھ سکتے تھے؟ | ✓ | |
| 4 | پاکستان کی معیشت سے انٹرویوز اور مضامین کے ذریعے آگاہ کیا؟ | ✓ | |
| 5 | پاکستانی معاشرے کے بدلتے رجحانات کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا؟ | ✓ | |
| 6 | صرف بڑے نہیں چھوٹے شہروں کے کوائف سے بھی روشناس کیا؟ | | |
| 7 | خواتین کے حقوق کے لیے آواز بلند کی؟ | ✓ | |
| 8 | قومی زبان اردو کے فروغ کے لیے نوجوانوں میں قیمتی ایوارڈ تقسیم کیے؟ | | |
| 9 | ریٹائرمنٹ کے مسائل پر خصوصی توجہ دی؟ | | |
| 10 | پاکستان کی خوبصورتی اور روشن پہلوؤں پر تحریریں اور تصویریں شائع کیں؟ | | |
| 11 | 'اطراف' میں موضوعات کے حوالے سے بہتری آئی؟ | ✓ | |
| 12 | 'اطراف' میں سرورق اور لے آؤٹ کے سلسلے میں معاملات بہتر ہیں؟ | | |
| 13 | 'اطراف' نے کتابوں سے رشتہ جوڑنے میں کردار ادا کیا؟ | | |

نام: (طارق محمود۔ ساہیوال)

خریداری نمبر: (آپ میرا جائزہ تبصرہ رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔)

فون نمبر:

نوٹ: آپ سوالنامے کو واٹس ایپ: 0340-8355189 کر سکتے ہیں

ہے۔ قاری کی حیثیت سے میری یہ خواہش ہے کہ تحریروں کے عنوان بھی اسی لفافے کی پشت پر طبع کیے جائیں اور یہ ممکن ہے۔ فائدہ یہ ہوگا کہ قاری کو لفافہ کھولنے سے قبل ہی معلوم (جب بھی ماہنامہ پڑھا جائے) ہو جائے تحریریں کن عنوانات پر مشتمل ہیں۔ وگرنہ فہرست کے صفحے تک پہنچتے ہوئے دو تین صفحات تو اشتہارات کے پلٹنے پڑتے ہیں۔ 'اطراف' کو سرکاری اشتہار کم ہی ملتے ہیں۔

سال بہ سال مشورۂ عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ Postel Address کے Label پر ہی نیچے ایک سطری معلومات کہ مدت شرح خریداری کب سے کب تک ہے۔ راقم کی اس تجویز پر ملک کے دو ماہنامے عمل پیرا ہیں۔

خواتین کے حقوق کے بارے میں آواز بلند کرتے ہوئے فرائض جوان پر بیوی، والدہ، بہن، سالی، خالہ پر عائد ہوتے ہیں ان کا بھی ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ جب والدین دونوں معاشی تگ و دو میں مصروف GDP بڑھانے کے لیے، تو گھر میں تعلیم و تربیت اولاد کا اہم نازک ضروری کام کون کرے گا۔ Gender Gap کم کرنے اور ملک کی مجموعی ترقی میں شامل کرنے کے لیے خواتین کوشانہ بشانہ لانے کی مہم برپا کرنے والے روزانہ کی بنیاد پر بڑھتے ہوئے Street Crimes کے اعداد و شمار بھی دیکھیں۔

فروغِ مطالعہ کی تحریک کمزور ہے اب تو اوراق مقدسہ کے تحفظ کی تنظیمیں زیادہ متحرک ہیں کیونکہ کتابیں الماریوں میں پڑی پڑی دیمک زدہ ہو رہی ہیں۔ یہ اعداد و شمار تو بڑے کروفر سے شائع کیے جاتے ہیں کہ فلانی کتاب کے اتنے اضافے Editions شائع ہو چکے ہیں لیکن ہمارے معاشرے میں یہ جاننے کی کوشش نہ کی گئی کہ کتابیں پڑھنے والے کتنے لوگ ہیں۔

Numbers شائع کرتے وقت حتی الوسع کما حقہ کی کوشش میں گنجائش باقی رہتی ہے۔ Numbers جس موضوع پر شائع ہو رہے ہیں اس میں تسلسل کے رجحان کی تو ستائش ضرور ہے۔ تحریر کی بجائے بڑے سائز کی تصاویر خاصی جگہ گھیر لیتی ہیں۔ اگرچہ چینی کہاوت کے مطابق ایک تصویر کو ایک ہزار الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے تاہم 'اطراف' میں اخبار جہاں، فیملی میگزین کی طرح خاطر خواہ جگہ دی جاتی ہے۔

مشورۂ عرض کیا تھا کہ قیدیوں کے بارے میں بھی کوئی Number شائع کیا جاتا۔ مگر اس نمبر کے لیے اشتہار کون دے گا۔ یہ بھی جاننے کی کوشش کی جائے کہ سبزی فروش، درزی، ٹیکسی، رکشہ ڈرائیور، موچی، دھوبی، تندورچی، ڈاکیا، قلی، چوکیدار، Tea-Boy۔ صحافت سے کتنی دلچسپی رکھتے ہیں کیا ان کے لیے رعایتی قیمت پر اخبار، رسائل مہیا کیے جاسکتے ہیں۔ مگر ہمیں تو صرف عام انتخابات کے موقع پر صرف ووٹ چاہئے۔

خواتین اور بچوں کی سہولت اور دلچسپی کے لیے Indoor Games کے بارے میں تحریریں شائع کی جائیں۔ دفاتر میں Clubs قائم کر دیے گئے ہیں۔ شاید ہمسائیگی کے ضمن میں کوئی نمبر 'اطراف' کی طرف سے شائع ہو چکا ہو۔ سرکاری دفاتر میں حسنِ کارکردگی میں اضافہ کے لیے کیا تدابیر متعارف کروائی جاسکتی ہیں؟ جاپانی طریق انتظامیہ میں حسنِ کارکردگی کا جائزہ ہر مہینے ناگزیر ہے

سرورق اور Layout میں دلچسپی کا سامان بھی ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب مختلف اوراقِ سرکا موازنہ کیا جائے۔ کبھی رمضان ملکوں ملکوں اور کبھی پائل کی جھنکار۔ کتابوں کے تعارف کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی جائے کہ متعارف شدہ کتاب کہاں سے خریدی جاسکتی ہے؟ مع رابطہ کے کوائف۔

معیشت کے ساتھ قوسین Brackets میں رزقِ حلال اور سیاست کے ساتھ لکھا جائے صدقِ مقال۔ قارئین کے قلوب و اذہان پہ یہ حقیقت منکشف ہوتی رہے کہ سیاست اسلام میں شجرِ ممنوع نہیں۔ (طارق محمود۔ ساہیوال)

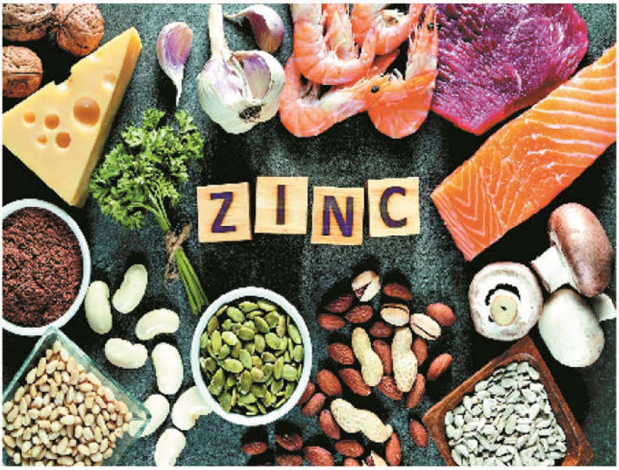


وزارت تجارت کے جائنٹ سیکرٹری کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہو کر سید ارتقا احمد زیدی نے غذائیت کی افادیت پر تحقیق کا انتہائی اہم سلسلہ شروع کیا۔ پہلے پھلوں پھر سبزیوں پھر بیجوں میں صحت مند جسم کے لیے افادیت بیان کی گئی ہے۔ آخر میں منرلز پر توجہ دی گئی ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

# جست (زنک)۔ مقدار کم۔ اہمیت زیادہ

## صحت مند جسم کو روزانہ کم از کم 11 ملی گرام جست ضروری

☆تحریر: سید ارتقا احمد زیدی

اگرچہ جست کی انسانی جسم کو بہت تھوڑی مقدار میں ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ بہت ہی اہم کام انجام دیتا ہے تقریباً 100 سے زیادہ اینزائم Enzymes کے کیمیائی ردعمل جست کی موجودگی میں ہی ممکن ہے۔ جو جسم کے خلیوں کی افزائش پروٹین کی بناوٹ۔ زخموں کے جل مندمل ہونے کے لیے ضروری ہے۔ جست کی بدولت بچوں کا قد بڑھتا ہے اور جسم میں بیماریوں کے خلاف مدافعت پیدا ہوتی ہے۔

**کاجو۔ چنے۔ مسور کی دال۔ انڈے میں جست کی مقدار**

ایک صحت مند جسم کو روزانہ کم از کم 11 ملی گرام جست کی ضرورت ہوتی ہے۔

مندرجہ ذیل 100 گرام غذائی اشیا میں جست کی مقدار یہ ہوتی ہے۔

1۔ کدو کے بیج Pumpkin seeds۔ 64.7 ملی گرام

2۔ کاجو۔ 5.78 ملی گرام...... 3۔ چنے۔ 1.53 ملی گرام...... 4۔ مسور کی دال۔ 1.27 ملی گرام...... 5۔ انڈے۔ 1.0 ملی گرام

## معالج کی تجویز کردہ ادویات ترک نہ کریں

عام طور پر لوگ کسی ایک پھل یا سبزی کی افادیت سے متاثر ہو کر اس کا استعمال بلا ناغہ شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض لوگ اپنا علاج پھلوں اور سبزیوں سے شروع کر دیتے ہیں اور معالج کی تجویز کردہ ادویات ترک کر دیتے ہیں۔ ❁


## غذائیت میں افادیت

### جلد کتابی شکل میں

اس کتاب کی تصنیف کا مقصد عوام الناس کو مختلف غذائی اشیا میں وٹامنز (Vitamins) اور منرلز (Minerals) کی موجودگی اور ان کی اچھی صحت کے لیے افادیت سے آگاہ کرنا ہے۔ تاکہ ان کی تھوڑی بہت کمی کو ملٹی وٹامنز (Multi Vitamins) کی گولیاں کھانے کی بجائے پھلوں اور سبزیوں کے مناسب استعمال سے پورا کیا جا سکے۔ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ ذیابیطس۔ دل اور جگر یا اور کسی مرض میں مبتلا افراد کسی صورت علاج ترک نہ کریں اور اپنے معالج کی ہدایت کے مطابق دوا اور غذا استعمال کریں۔

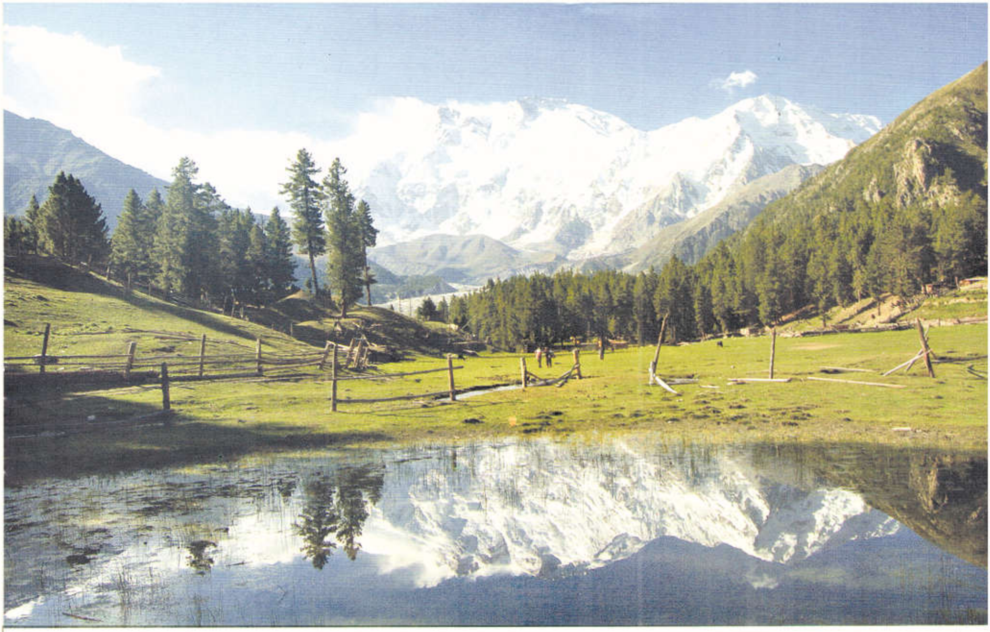

Your Country!

# اک چمن ۔ اپنا وطن

ہر موسم کے دن گزارنے کیلئے دنیا کے بہترین مقامات آپکے وطن پاکستان میں ہیں۔ بلتستان، گلگت، چترال، سوات، کاغان، مری، نتھیا گلی، اسکردو، ہنزا اور زیارت، ان قابل دید مقامات میں شامل ہیں۔ یہاں دنیا کی بہترین چوٹیوں اور پرشکوہ گلیشیرز کے درمیان سرسبز وادیاں ہیں اور پھلوں سے لدے ہوئے باغیچے، بلور کی طرح شفاف جھلیں ہیں اور تاریخی یادگاریں۔ ایسے دلفریب مناظر جن کے آگے دنیا کے مانے ہوئے تفریحی مقامات بھی ماند پڑ جائیں۔ پُرسکون موسم، صاف ستھری ہوا، مہمان نواز لوگ، ایسی جگہیں جہاں کرنے کیلئے بہت کچھ ہے کوہ پیمائی کیجئے یا ٹریکنگ اور ہائیکنگ کیجئے۔ گالف اور پولو کے سنسنی خیز کے مقابلے دیکھئے یا تہواروں میں شرکت کیجئے۔ ہاتھوں سے بنے منفرد کپڑے اور دستکاری کی سوغات خریدیئے۔ نت نئے مقامی کھانوں اور تازہ ڈال کے ٹوٹے پھلوں کا مزہ چکھیئے یا پھر شاہراہ قراقرم کی سیر کیجئے اور سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع درہ خنجراب دیکھئے جہاں وقت گزرتے ٹھہر گیا ہے۔ ایسی جنت آپکو اور کہاں ملے گی۔ آیئے! ہم اس جنت کو دکھانے میں آپکی راہنمائی کریں۔

## زیب ٹریولز

کراچی ہیڈ آفس: یونی پلازہ، گراؤنڈ فلور، حسرت موہانی روڈ۔
**Tel:** (92-21) 32411204-32415043-32417054 **Fax:** (92-21) 32424348-32425181.
**Email:** zeb@cyber.net.pk, **Website :** www.zebtravels.com.pk

لاہور برانچ: 29، پہلی منزل، اللطیف سینٹر، 88/D-1، مین بلیورڈ، گلبرگ 3، لاہور **Tel:** (92-42) 35781314-15
اسلام آباد برانچ: 44، گراؤنڈ فلور، بیورلی سینٹر، بلیو ایریا، جناح ایونیو۔ **Tel:** (92-51) 2814027-28

Zeb Travels

G.L.67

”بھارت میں انتخابات کے نتائج پر پاکستانیوں کی نظر بھی ہونی چاہئے۔الیکشن 2024 نے بھارت میں مودی کو کمزور کیا ہے۔تعصب اور ہندو تواکی یلغار روک دی ہے۔ قارئین ’اطراف‘ کی معلومات کے لیے ہم نے بھارت میں ’اطراف‘ کے خیر خواہوں سے رابطہ کیا۔ان کے خیالات میں آپ کو بھارت کا سیاسی مستقبل نظر آئے گا۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔“

# الیکشن 2024 سے بھارت میں وفاقی سیاست واپس آ گئی

☆اطراف رپورٹ

## کیرن ساہنی

### سینئر بھارتی صحافی۔ دہلی

لوک سبھا کے انتخابات بھارت کو وفاقی سیاست کی طرف واپس لے گئے ہیں۔دوسری حقیقتوں کے علاوہ باہر بھی ایک واضح تبدیل ہے کہ بھارتی جنتا پارٹی نے جو 240 سیٹیں جیتی ہیں بہت ہی کم فرق سے حاصل کی ہیں۔مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بی جے پی نے اپنے دو ادوار میں جو تحکمانہ رویہ اختیار کیا ہے۔اسے ووٹرز کی اکثریت نے مسترد کر دیا ہے۔خاص طور پر بھارت کے مسلمانوں نے یہ تبدیلی لانے میں بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے جس کا مظہر بالخصوص سب سے بڑے صوبے اتر پردیش (یوپی) کے انتخابی نتائج ہیں۔ان انتخابات سے واضح ہو گیا کہ بھارت کی 80 فی صد محرومیوں میں مبتلا اکثریت فلاحی ریاست کے اصولوں پر مبنی اندازِ حکمرانی کی خواہاں ہے۔اور اب صاف نظر آ رہا ہے کہ ’انڈیا الائنس‘ کی صورت میں عوام کو ایک متبادل حکومت بھی نظر آ رہی ہے۔اب مودی کو اپنے ہمسایوں سے بہتر تعلقات والی خارجہ پالیسی مرتب کرنا پڑے گی۔ ایک طرف میانمار۔ بنگلہ دیش دوسری طرف پاکستان ایران افغانستان سے بہتر تعلقات بنانے ہوں گے۔ فلسطین اسرائیل تنازع میں انڈیا کا کردار عوام دوست نہیں رہا ہے۔نواز شریف مودی تعلقات دونوں کے پہلے ادوار میں بہتر رہے ہیں۔اب جو بھی عالمی حالات ہیں ان کے حوالے سے بہتری لانا ہوگی۔ پاکستان اور انڈیا دونوں کے لیے بہتر مستقبل کی ضمانت خوشگوار تعلقات ہیں۔ بھارت نے مشکل وقت میں سری لنکا کو مالی امداد دی ہے۔گزشتہ دو سال میں 5 ارب ڈالر سے زیادہ قرضہ دیا ہے۔ پاکستان کی آبادی اس سے دس گنا زیادہ ہے اس لیے خطے میں امن و امان کے لیے اگر پاکستان کو بھی بھارت قرضہ دے تو خطے میں حالات بدل سکتے ہیں۔

## پروفیسر اختر الواسع

### وائس چانسلر مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور

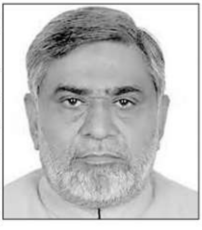

عام انتخابات جمہوریت کا جشن ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس بار بہت ہی حسا فہم و فراست کا مظاہرہ کیا ہے۔ اب وہ ہندوستان کے حاکم ہیں نہ محکوم۔ بلکہ اقتدار میں برابر کا شریک ہے۔ 26 مسلمان رہنما مختلف علاقوں سے جیت کر لوک سبھا میں پہنچے ہیں۔ یہ سب اپنے علاقے کے مستند اور مسلّمہ نمائندے ہیں۔ بنگال۔ یوپی۔ بہار۔ تلنگانہ۔ کیرالہ۔ تامل ناڈو۔ اور کشمیر سے منتخب ہو کر آنے والے ارکان بہت زیادہ منجھے ہوئے لیڈر ہیں۔ اتر پردیش اور

# مودی ازم واقعی کمزور؟

راجستھان جو گزشتہ دو انتخابی ادوار میں بی جے پی کا گڑھ تھے وہاں بی جے پی کو بہت مار پڑی ہے۔ 2014 اور 2019 کے انتخابی نتائج کے برعکس ایک قطعی واضح صورت حال یہ ہے کہ اب پارلیمنٹ میں ایک طاقت ور اپوزیشن لیڈر ہوگا۔ جو مودی ازم کو پہلے کی طرح من مانی نہیں کرنے دے گا۔ مسلمانوں نے اس بار جس تدبر اور حکمت عملی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے انہیں بھارت کی مرکزی سیاست میں ایک توازن حاصل ہوگیا ہے۔


سیف الرحمٰن

چیف ایڈیٹر' انصاف ٹائمز

لوک سبھا انتخاب 2024 یا حقیقی اعتبار سے عوامی ، جمہوری ، وفاقی ،سماجوادی آئین و سرمایہ دارانہ ہندوتوا ریپبلک کے بیچ ریفرنڈم کا جشن ختم ہوا اور نتیجہ ہمارے سامنے ہے،انتخاب کے آخری مرحلہ کے مکمل ہونے کے بعد سے ہی سب کی نظر ٹیلیویژن اسکرین پر تھی،تبھی ٹیلیویژن پر آنے والے ایگزٹ پولس نے سب کو چونکانا شروع کر دیا کیونکہ لوگوں نے جو ماحول تمام انتخابی مراحل میں دیکھا تھا اُسے صاف جھٹلاتے ہوئے یہ ایگزٹ پولس نظر آرہے تھے،مگر پھر چند گھنٹوں بعد ہی جب ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی تو وہ اسی ماحول کے مطابق تھا جو کہ سبھی 07 مراحل میں نظر آیا تھا، اور بالآخر جب رات تک نتیجہ صاف ہوا تو وہ ہم جیسے آزاد صحافیوں کے تجزیہ کے قریب قریب تھا پہلے و دوسرے مرحلے کے بعد لکھے اپنے مضمون میں میں نے لکھا تھا کہ انتخاب اخیر تک ایسا ہی رہا تو بھارتیہ جنتا پارٹی 60 سے زیادہ سیٹیں یقینی کھو رہی ہے لہٰذا ہم نے دیکھا کہ نتیجہ میں بھی 63 سیٹوں کا نقصان بھاجپا کو ہوا، آخری مرحلہ کے بعد ایگزٹ پولس کے ہنگامے کے بیچ لکھے اپنے مضمون میں میں نے کہا تھا کہ بھاجپا 220 سے 240 سیٹوں کے درمیان آئیگی اور نتیجہ میں بھاجپا کو 240 سیٹ حاصل ہونگی، ساتھ ہی میں نے کہا تھا کہ دونوں اتحاد اکثریت کے قریب ہونگے لہٰذا ہم نے دیکھا کہ انڈیا اتحاد سمیت اپوزیشن 240 سے زیادہ حلقوں کے ساتھ اکثریت سے تھوڑا نیچے اور این۔ڈی۔اے اتحاد 291 حلقوں پر قبضہ کر اکثریت سے تھوڑا آگے ہے، میرے تجزیہ میں چند فیصد کمی یہ رہی کہ میں مان رہا تھا کہ آندھرا پردیش میں جگن موہن ریڈی و اڑیسہ میں نوین پٹنا یک ملا کر کم سے کم 20 سیٹیں لائیں گے اور دیگر مل کر یہ لوگ کنگ میکر ہو سکتے ہیں مگر دونوں جگہ یہ دونوں پارٹیاں پوری طرح ناکام رہی جس کی وجہ سے انڈیا تو اکثریت سے نیچے رہا مگر این۔ڈی۔اے اتحاد اکثریت سے اوپر جانے میں کامیاب ہوگیا، جہاں تک بات حکومت سازی کی ہے تو یقینی ہے کہ چونکہ انڈیا اتحاد بھی حکومت بنانے کیلئے کسی طرح کے توڑ جوڑ میں جانے کے بجائے اپوزیشن میں بیٹھنے کو ترجیح دیتے نظر آرہا ہے جو کہ سیاسی نقطہ نظر سے بہتر و مفید پالیسی ہے۔اب اگر ہم ایک شہری کے طور پر اس رزلٹ کو دیکھیں تو یقیناً ملک کے جمہوری ، وفاقی ،عوامی ،سماجوادی آئین کے حق میں اپنا اعتماد جتاتے ہوئے برہمن وادی، سرمایہ دارانہ، ہندوتوا ریپبلک کو خارج کر دیا ہے، ملک میں گذشتہ 10 سالوں سے جس طرح سے ایک تاناشاہی رویہ کا سامنا ملک کے عوام کو اور سیاسی ،سماجی افراد و تنظیموں کو کرنا پڑ رہا تھا اُس سے بہت حد تک راحت ملنے کی اُمید ہے کیونکہ یہ حکومت ایسے سیاسی افراد کے کاندھے پر ٹکی ہے جو کہ سماجوادی و امبیڈکروادی تحریک سے نکلے ہوئے جمہوری اقدار پر اعتماد رکھنے والے ہیں جس میں بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار خصوصی طور پر قابل ذکر ہے ساتھ ہی تیلگو دیشم پارٹی کے صدر چندرا بابو نائڈو، جنتا دل سیکولر کے بانی سابق وزیر اعظم ایچ۔ڈی دیوگوڑا، راشٹریہ لوک دل کے صدر و چودھری چرن کے پوتے جینت چودھری، جیتن رام مانجھی اور رام ولاس پاسوان کے بیٹے چراغ پاسوان شامل ہیں! اس مرتبہ جہاں اپنی اکثریت کے ساتھ حکومت کرنے والے نریندر مودی کی حکومت اتحادیوں وہ بھی نتیش کمار و نائیڈو جیسے مضبوط لیڈران کے کاندھے پر ٹکی ہے تو وہیں دوسری طرف اپوزیشن بھی بہت مضبوط ہے جو کہ اکثریت سے بالکل قریب ہے اور یقیناً یہ بھی ایک جمہوری ملک کیلئے خوش آئند ہے کہ اس میں زیر اقتدار حلقہ کمزور و حزب اختلاف مضبوط ہے! ہم اب اُمید کر سکتے ہیں کہ ملک میں حکومتی سطح پر ہو رہی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں اچھی کمی آئیگی، تعلیمی اداروں میں دانشورانہ کھلی گفتگو کے ماحول کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھ پایا جائے گا اور تعلیمی معیار میں بہتری کی جائیگی خاص کر نئی تعلیمی پالیسی کے منفی نکات کو ختم کر ضروری اصلاحات کیے جائیں گے، احتجاج و اختلاف رائے کی مکمل آزادی سیاسی و سماجی لوگوں و تمام شہریوں کو میسر ہوگی اور صحافیوں و صحافت پر ہو رہے کریک ڈاؤن پر روک لگے گی بلکہ ایسا قانون وضع ہوگا جو کہ صحافت کی آزادی و حفاظت کو یقینی بنا سکے ، ،سماجوادی نظریہ کے لیڈران

## مسلمانوں نے اس الیکشن میں غیر معمولی تدبر کا مظاہرہ کیا

کی مضبوط موجودگی سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ ملک پر کارپوریٹ کی مضبوط ہوئی پکڑ کمزور ہوگی اور منہگائی و بے روزگاری کے خاتمے کی پالیسیاں بنائی جائیگی! نتیش، نائیڈو، مانجھی اور جینت کی موجودگی سے دلتوں، مسلمانوں، آدی واسیوں ،عیسائیوں، سکھوں اور پچھڑوں کے جان و مال، وقار، شناخت اور آئینی حقوق کو تحفظ حاصل ہوگا و کسانوں اور مزدوروں کے مسائل کے حل کے راستے ہموار ہونگے، اس الیکشن کے نتیجہ میں ان امیدوں کے ساتھ یہ مثبت پہلو بھی ہے کہ نفرت و دشمنی اور بدلے کی سیاست کو ملک نے خارج کر دیا ہے یہاں تک کہ ایودھیا والے فیض آباد لوک سبھا سے بھی اُس بھارتیہ جنتا پارٹی کو ہار کا سامنا کرنا پڑا جو کہ رام مندر کے سہارے انتخاب کو جیت لینا چاہتی تھی، ساتھ ہی ایسے بہت سے لیڈران انتخاب ہار گئے ہیں جو کہ نفرت پر مبنی بھاشن دیا کرتے تھے اور ایسے بہت سے حلقوں میں بھاجپا کو ہار کا سامنا کرنا پڑا ہے جہاں پر وزیر اعظم سمیت دوسرے لیڈران نے مسلم مخالف بھاشن دیے تھے ، لہٰذا اُمید ہے کہ اب یہاں سے ملکی سیاست کے مثبت عروج کا دور شروع ہو چکا ہے جس میں کسی طبقہ کے خلاف نفرت کے بجائے عوام کے بنیادی مسائل، سماجی مساوات، عدل و انصاف اور شہریوں کے تحفظ کے مسائل سیاسی مقابلوں و سیاسی مباحث میں بنیادی طور پر نظر آئیں گے! اس الیکشن کا ایک مثبت پہلو یہ بھی رہا ہے کہ جہاں پر ایسے افراد مضبوط اُمیدوار کے طور پر سامنے

## ان انتخابات نے نفرت اور بدلے کی سیاست کو مسترد کر دیا

تھے جو کہ تحریکی مزاج رکھتے ہوں، عوامی مسائل پر متحرک رہتے ہوں اور اِنصاف کی لڑائی لڑنے کا مزاج رکھتے ہوں تو وہاں پر عوام نے دونوں اتحاد کو نکھار دیا جیسے کہ اُتر پردیش کے نگینہ میں آزاد سماج پارٹی کے صدر چندر شیکھر آزاد اور بہار کے پورنیہ سے آزاد اُمیدوار کے طور پر لڑنے والے کانگریسی لیڈر پپو یادو کی جیت ، ان دونوں کی جیت ان دونوں ریاستوں سمیت ملک میں نئی سیاست کی شروعات ہے کہ جہاں اُتر پردیش سمیت ملک بھر میں بسپا کے آخری سانس کے مرحلے تک پہنچ جانے کی وجہ سے ایک مضبوط نظریاتی دلت متبادل کی تلاش تھی اسے پورا کرنے کیلئے چندر شیکھر آزاد سامنے آئے ہیں جو کہ اب اُتر پردیش میں سماجوادی پارٹی کے سامنے بسپا کی جگہ آزاد سماج پارٹی کی قیادت دیں گے، تو وہیں ملک بھر کی دلت سیاست کو ایک نیا رخ دیتے نظر آئیں گے تو وہیں دوسری طرف پپو یادو کی جیت بہار میں کانگریس کے نئے روشن دور کی شروعات کریگا کیونکہ بہار کے ایک بڑے طبقے جس میں مسلمانوں کا بڑا حصہ شامل ہے کو مضبوط متبادل کی تلاش ہے اور اس ضرورت کو کانگریس پورا کر سکتی ہے، لہٰذا سیاسی مبصرین کا ماننا ہے کہ بہار میں کانگریس کے نئے صوبائی صدر پپو یادو بن سکتے ہیں اور اُن کے صدر بننے سے گاؤں گاؤں تک کانگریس کی تنظیم وان کا کیڈر کھڑا ہو جائیگا جس کے بعد ممکن یہ بھی ہے کہ آنے والے دنوں میں جہاں مرکز میں راشٹریہ جنتا دل و کانگریس انڈیا اتحاد کا مضبوط حصہ ہونگے تو وہیں بہار میں دونوں پارٹی الگ الگ راستے پر اپنے اپنے اتحاد کے

ساتھ نظر آسکتے ہیں، جوکہ بہار کی سیاست کو دلچسپ بنا دیگا اور اس سے سب سے زیادہ نقصان بھارتیہ جنتا پارٹی و بہار کی سیاست میں زمین تلاش رہے پرشانت کشور کو ہوگا، اسی طریقے سے راجستھان کے بنسوارا دنگارپور لوک سبھا حلقہ سے بھارتیہ آدیواسی پارٹی کے راجکمار راوت نے جیت حاصل کر راجستھان، مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ، مہاراشٹرا، گجرات سمیت پورے ملک میں نظریاتی آدی واسی سیاست کی ایک مضبوط بنیاد ڈال دیا ہے جوکہ ملک میں سنگھ کی سیاست کیلئے لمحہ فکریہ اور جمہوری سیاست وسماجی مساوات کی لڑائی کیلئے ایک مثبت اُمید پیدا کرنے والا ہے اور پنجاب میں امرت پال (جوکہ ابھی آسام کے ڈبرو جیک میں بند ہے (جیسے متنازع مگر متحرک نوجوان لیڈر کی کھدور لوک سبھا سے آزاد اُمیدوار کے طور پر جیت پنجاب کی صوبائی سیاست میں بڑے انقلاب کی آمد کا اشارہ ہے جس میں پُرانی قیادت کی جگہ نئی قیادت کا ابھار سامنے آئے گا! مسلم قوم کے نظریہ سے یہ مثبت پہلو رہا کہ پپو یادو و چندر شیکھر آزاد جیسے لوگ جو مسلمانوں کے لئے آواز اٹھاتے رہے ہیں اُن کو اس قوم نے جتا کر قرض اُتار دیا ساتھ ہی پارلیمنٹ میں بھی ایسے افراد کو پہونچا سکی جوکہ مسلمانوں کا نام لینے میں تیجسوی و اکھلیش اور راہل کی طرح شرمائیں گے نہیں، دوسری اچھی بات رہی کہ اقراء حسن جیسی نوجوان، تعلیم یافتہ، حجابی خاتون کی جیت اور آنے والے دنوں میں پارلیمنٹ میں ان کے بات رکھتے نظر آنے کی وجہ سے مسلم خواتین کے بارے میں لوگوں کی سوچ تبدیل ہوگی ساتھ ہی خود مسلم خواتین میں بھی ایک بیداری وخود اعتمادی پیدا ہوگی جس سے کہ وہ مستقبل میں مین اسٹریم میں آکر ملک وملت کیلئے اپنی شراکت اور بہتر طریقے سے درج کراتی نظر آئینگی، لیکن افسوسناک لمحہ رہا کہ مختلف سیاسی وجوہات کے بنیاد پر جس قوم مسلم کے کم سے کم 70 ممبران پارلیمنٹ ہونے چاہئے اُن کے ممبران پارلیمنٹ کی تعداد 26 سے گھٹ کر 24 پر آ گئی، ساتھ ہی مسلم لیڈرشپ والی پارٹیوں کے ارکان پارلیمنٹ کی تعداد بھی کم ہوگئی جب کہ آج کے وقت میں یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر آپ کی آزاد لیڈرشپ کی نمائندگی کچھ حد تک سیاست میں نہیں رہتی ہے تو آپ کے مسائل پر وہ تمام پارٹیاں وسیاسی لیڈران آنکھ بند کیے رہتے ہیں جوکہ آپ کے ووٹ بینک پر ٹکے ہیں، لیکن اگر آپ کے کچھ افراد آپ کی آزاد پارٹی سے ہو تو آپ کا بیانیہ سامنے آتا ہے جس سے کہ دِیگر تمام بھی اُس بیانیہ کے ساتھ آنے پر مجبور ہوتے ہیں، ساتھ ہی جمہوری ملک میں ضروری مانا جاتا ہے کہ الگ الگ کمیونیٹیز کے پاس ضرورت کے مطابق سودے بازی کی طاقت بھی ہونا ضروری ہے تب ہی آپ کی حصہ داری، آپ کا وقار محفوظ ہوتا ہے اور آپ کی ترقی کے راستے ہموار ہوتے ہیں۔

## مس افروز اختر رئیس

## حیدرآباد دکن

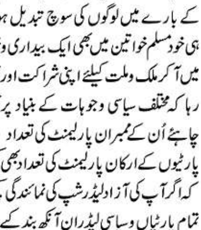

انڈیا ایک سیکولر ملک ہے، حالیہ برسوں میں انڈیا نے بین الاقوامی فورمز پر اپنی موجودگی کو مضبوط کیا ہے۔ انڈیا کی سیاست میں مسلسل تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور یہ مختلف سماجی، اقتصادی، اور سیاسی عوامل پر منحصر ہوتی ہیں۔ یہاں کی سیاست بھی بہت متنوع اور پیچیدہ رہی ہے، جس میں علاقائی جماعتوں کا بہت بڑا کردار ہے۔ ہر ریاست کی اپنی سیاسی جماعتیں اور مسائل ہیں جو قومی سیاست پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔

انڈیا دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ ہر پانچ سال بعد عام انتخابات ہوتے ہیں جن میں مختلف جماعتیں حصہ لیتی ہیں۔ بلخصوص انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہونے پر زور دیا جاتا ہے۔ انڈیا کے عام انتخابات ملک کی سب سے اہم سیاسی سرگرمی ہے، یہ جمہوری عمل کا ایک بڑا حصہ جہاں اس الیکشن میں تقریباً اس وقت 90 کروڑ سے زائد لوگ ووٹ ڈالنے کے اہل ہیں۔ انتخابات کو آزادانہ اور منصفانہ بنانے کے لئے الیکشن کمیشن آف انڈیا نے سخت محنت کی ہے کئی چیلنجز کا سامنا ووٹرلسٹ کی درستگی، الیکٹرانک ووٹنگ مشینوں کی حفاظت، اور آزادانہ ووٹنگ کو یقینی بنانا۔ یہاں پر ووٹرز کی ترجیحات وقت کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ نوجوان ووٹرز، خواتین ووٹرز، اور دیہی علاقوں کے ووٹرز کا کردار اہم ہوتا ہے۔ ان کے مسائل اور ترجیحات انتخابات کے نتائج پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ انڈیا کے انتخابات نہ صرف ملک کے اندر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی بڑی توجہ کے حامل رہے ہیں۔ انتخابات کے نتائج ملکی سیاست کی سمت کا تعین کرتے ہیں اور حکومت کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انتخابی مہم میں سیاسی جماعتیں اپنے اپنے منشور پیش کرتی ہیں ریلیاں نکالتی ہیں، اور میڈیا کے ذریعے ووٹرز تک اپنی بات پہنچاتی ہیں۔ سوشل میڈیا بھی حالیہ برسوں میں ایک اہم انتخابی ہتھیار بن گیا۔ انتخابات کے دوران مختلف مسائل پر بات ہوتی ہے۔ اقتصادی ترقی، بیروزگاری، کسانوں کے مسائل، تحفظات صحت، تعلیم، اور قومی سلامتی جیسے موضوعات پر زیادہ توجہ دی گئی۔ انڈیا میں کئی بڑی اور چھوٹی سیاسی جماعتیں ہیں۔ اہم دوقومی جماعتوں میں بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) اور انڈین نیشنل کانگریس (INC) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ، کئی علاقائی جماعتیں بھی ہیں جو ریاستی سطح پر مضبوط ہیں، جیسے ترنمول کانگریس، ڈی ایم کے، شیوسینا، اور عام آدمی پارٹی۔ مختلف جماعتیں متحد ہوکر گٹھ بندھن اتحاد بناتی ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ نشستیں جیت جاسکیں۔ جیسے این ڈی اے (INDIA نیشنل کانگریس کی قیادت میں) یہ دو بڑی اتحادی جماعتیں اس الیکشن میں نظر آئیں اور یہی دو جماعتیں سیاسی میدان میں اہم۔ کردار ادا کررہی حالیہ برسوں میں، نریندر مودی کی قیادت میں BJP حکومت رہی نریندر مودی کی حکومت میں اقتصادی اصلاحات، انفراسٹرکچر کی ترقی، ڈیجیٹل انڈیا" میک ان انڈیا" ایوشمان بھارت یوجنا G.S.T اجول یوجنا اور ایسی کی اسکیمز عوام کے لیے بہت مفید رہی 2024 کے عام انتخابات جس کے مطابق بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) کی قیادت میں نیشنل ڈیموکریٹک الائنس (این ڈی اے) نے 543 میں سے 292 نشستیں جیتی ہیں۔ دوسری طرف، انڈین نیشنل کانگریس (INC) کی قیادت میں انڈین نیشنل ڈویلپمنٹل انکلوسیو الائنس (آئی این ڈی آئی اے) نے 234 نشستیں حاصل کی ان انتخابات میں کئی تنازعات بھی سامنے آئے۔

**غیر مسلم اکثریت نے سیکولرازم کا تحفظ کیا**

**سوشل میڈیا ایک طاقت ور ہتھیار بنا رہا**

بی جے پی نے اگرچہ سنگل پارٹی اکثریت کھودی، لیکن این ڈی اے کی مجموعی کامیابی کی وجہ سے نریندر مودی تیسری مرتبہ وزیراعظم منتخب ہوگئے۔ ان کے اتحادیوں کی حمایت کی وجہ سے این ڈی اے نے مجموعی طور پر 303 نشستیں حاصل کرلیں۔

مودی نے دوبارہ اقتدار حاصل کرلیا ہے اور وہ اپنی تیسری مدت کا آغاز کرچکے ہیں۔

اب تک تو یہ حال ہے آگے اللہ جانے۔ لیکن یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہندوستان کی معیشت تیزی سے بڑھ رہی ہے، لیکن بیروزگاری، دیہی ترقی، اور معاشی عدم مساوات جیسے چیلنجز بھی موجود ہیں۔ کوئی بھی حکومت میں ہو چاہے کسی کی بھی حکومت ہو اسے مستقل پانچ سال گزارے حکومت کو مختلف معاشی اصلاحات اور اسکیمز کے ذریعے ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ❁

”غزالہ خالد کی تحریر میں پرنٹ اور سوشل میڈیا کا امتزاج ہوتا ہے۔ ان سے 'اطراف' نے درخواست کی کہ ہر مہینے ایک صفحہ اپنے مخصوص لطیف پیرائے میں لکھیں کہ درجہ حرارت اگرچہ کم ہو۔ مگر Feel Like زیادہ ہو۔ پڑھے۔ حالات حاضرہ پر کتنے غیر محسوس طریقے سے نشتر زنی کی ہے۔ سانپ بھی مرے گا لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ انشاءاللّٰہ اب ہر مہینے غزالہ خالد کی آپ سے گفتگو رہے گی۔“

# گرمی۔ کرکٹ کی۔ بجٹ کی۔ قربانی کی

غزالہ خالد کی شگفتہ تحریر

مانا کہ جون کا مہینہ ہمیشہ سے ہی گرم ہوتا ہے لیکن اس بار تو جناب حد ہی ہوگئی یعنی پہلے ہی گرمی، پھر کرکٹ کی گرمی، پھر بجٹ کی گرمی، پھر عید قرباں کی گرمی اور آس کے بعد بھی اب تک ملک میں بس گرما گرمی ہی چل رہی ہے۔

سب سے پہلے تو مجھے ایک بات پوچھنا ہے اور وہ یہ کہ ہمیں پسینہ پسینہ

**پسینے کیا کم نکل رہے تھے**
**کرکٹرز نے آنسو بھی نکلوا دیئے**

کر کے پگھلا دینے کو یہ قیامت برساتا سورج کیا کچھ کم تھا کہ ایک نئی اصطلاح وجود میں آگئی ہے کہ جس سے گرمی سے جھلستے تڑپتے انسان مزید تڑپ جاتے ہیں۔

ارے وہی" Feel like" کی بات کر رہی ہوں بھئی۔

یہ بتانے کا عجیب فیشن نکلا ہے کہ اس وقت درجہ حرارت تو 39 ہے لیکن feel like ، 50 ہے۔ یہ سنتے ہی اچھے بھلے لوگوں کی آنکھیں خوف سے باہر نکل آتی ہیں گھر سے باہر جاتے جاتے انسان دوبارہ گھر میں گھس کر نہا دھو کر پنکھا تیز کر لیتا ہے کہ" رہنے ہی دو بھیا آرام سے گھر میں ہی بیٹھتے ہیں" ورنہ اس سے پہلے بھی 40 یا 45 تک درجہ حرارت جانے پر بھی کبھی feel like والی باتیں نہیں سنی تھیں ایسی باتوں سے اور کچھ ہو نہ ہو گرمی ضرور دو چند ہو جاتی ہے۔

اوپر سے دل دہلاتی تابڑ توڑ خبروں نے مزید جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔

بھئی ہوگا امریکہ میں اچھا موسم، کروائیں وہ جتنے مرضی ورلڈ کپ اپنے ملک میں کروالیں! یہاں کرکٹ کے دلدادہ عوام کا کیا قصور!! جو بیچارے اپنی ٹیم کے میچ دیکھ دیکھ کر گرمی میں مزید جلتے بھنتے رہے۔ ویسے ہی پسینے کیا کم نکل رہے تھے کہ اس کے ساتھ ساتھ

**درجہ حرارت اتنا**
**مگر Feel Like**

کھلاڑیوں نے آنسو بھی نکلوا دئے۔

اب کوئی کہہ رہا ہے کہ یہ میچ فکسنگ بھی ہو سکتی ہے، کسی کا خیال ہے کہ سفارشی کھلاڑیوں کی وجہ سے یہ ہوا، کوئی اس ٹورنامنٹ کو"نورا کشتی" قرار دے رہا۔ ہم تو صرف اتنا کہیں گے کہ جو بھی وجہ ہو بقول عوام کی عوامی زبان کہ اب" بیزتی (بے عزتی) خراب"تو ہو گئی سو عوام نے وہی کیا جو وہ ہمیشہ کرتے ہیں کہ سب رو دھو کر صبر شکر کر کے بیٹھ چکے ہیں۔

رہے" بجٹ اور بکرے"تو انہوں نے بھی وہی کیا جو وہ ہمارے بچپن سے کرتے آرہے ہیں یعنی بجٹ نے" بہووت مہنگائی" کی اور بکرے" بہووت مہنگے" ہو گئے۔ ان دونوں شرارتیوں سے امید بھی یہی تھی اور دونوں نے بالکل بھی مایوس نہیں کیا۔

ہاں! لیکن اگر ان دونوں نے مایوس نہیں کیا تو عوام نے بھی تو مایوس نہیں کیا انہوں نے بھی وہی کیا جس کی امید تھی یعنی" بیووت مہنگے بکرے بہت خریدے اور" بیوووت مہنگائی" والا بجٹ سنکر بھی صابر و شاکر ہی رہے فرق پڑا تو صرف اتنا کہ اب ایک اور نئی اصطلاح"

**مہنگائی گئی بھاڑ میں۔ یہ بتائیں**
**آپ فائلر ہیں یا نان فائلر**

فائلر" اور" نان فائلر" سب کو پتہ چل گئی مہنگائی گئی بھاڑ میں۔۔ بس فائلر اور نان فائلر کے لطیفے اور خاکے بن رہے ہیں اور عوام ڈھیٹ بنے اس پر ہی ہنس ہنس کر اپنے غم غلط کر رہے ہیں۔

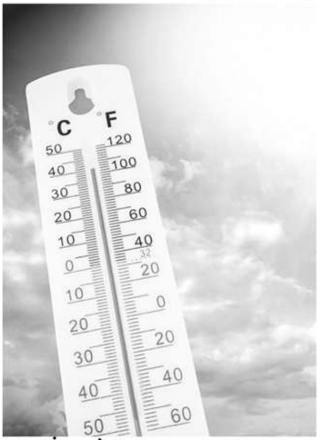


عوام نے یہ بات بھی پلے سے باندھ لی ہے کہ"ہنسی علاج غم" اس لیئے ہر تکلیف پر سوشل میڈیا پر میمز بنتے ہیں اور لوگ چکنا گھڑا بنے ہنستے رہتے ہیں۔

عید قرباں کے ساتھ ہی دنیا کا سب سے بڑا اجتماع حج بیت اللہ بھی تھا افسوس کہ آج کل وہاں سے بھی افسوسناک خبریں سننے کو مل رہی ہیں۔

جون کی ظالم گرمی نے وہاں بھی قیامت ڈھا دی ہے اور اب تک کی خبروں کے مطابق تقریباً ایک ہزار کے قریب حاجی گرمی کی وجہ سے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

اب اپنی حکومت ہو یا سعودی۔ حکومتوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ موسمی حالات اور گرم و سرد میں عوام الناس کا خیال رکھا جائے آخر وقت پر قربانی بھی تو عوام ہی دیتے ہیں۔

بات ذرا تلخ تو ہو جائے گی لیکن کہے دیتی ہوں کہ قربانی کے جانور کا خیال رکھنے کو تو اللہ تعالیٰ نے بھی کہا ہے اور ابھی تازہ تازہ اس کی تربیت بھی ہوئی ہے تو پھر ذرا سوچیے کیونکہ

بے کسوں کی بددعا اچھی نہیں

❁❁❁

’اطراف‘ ایک اہم اور حساس معاملے کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ پاکستان کے سب سے بڑے شہر اور صنعتی و تجارتی مرکز میں نوجوان ڈاکوئوں کے ہاتھوں بڑی تعداد میں ہلاک ہو رہے ہیں۔ پولیس اور دوسرے متعلقہ ادارے ان وارداتوں کو روکنے میں اب تک ناکام ہیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔ آپ کے خاندان میں یا قریبی رشتے داروں میں اگر کوئی ایسی واردات ہوئی ہے تو آپ ہمیں پوری تفصیلات دیں۔

اطراف رپورٹ

# 2023 کے 9 ماہ میں 100 سے زیادہ نوجوان قتل

مقتولین کے کوائف۔ اسد علی

کراچی ایک قتل گاہ بنی ہوئی ہے۔ ہلاک کرنے والے ڈاکو بھی نوجوان ہیں اور جن کو شقی القلبی سے مارا جا رہا ہے وہ بھی نوجوان ہیں۔ گھر اجڑ رہے ہیں۔ مائیں سکتے میں ہیں۔ بہنیں بین کر رہی ہیں۔ یہ ایک عظیم المیہ ہے۔ یہ نوجوان بیٹے ماں باپ کو کتنی مرادوں سے ملتے ہیں۔ مائیں انہیں کس لگن سے پالتی ہیں۔ باپ کے بڑھاپے کا سہارا باپ کی آنکھوں کا تارا ہوتا ہے۔ جس بیٹے کے کندھوں پر اسکا جنازہ جانا تھا۔ باپ اس بیٹے کے جنازے کو کندھا دیتا ہے۔’اطراف‘ کے وسائل محدود ہیں۔ ان المناک واقعات پر تحقیق اور تفصیل کے لیے عملہ درکار ہے۔ ہم نے ’اطراف‘ کے ایک پرانے ساتھی۔ دردمند رپورٹر

## کراچی میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں نوجوانوں کا قتل

اسد علی کو زحمت دی۔ انہوں نے بڑی محنت سے وارداتوں کے وقوع کی تاریخ۔ مقتولین کے نام اکٹھے کیے ہیں۔ تھانوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ پولیس اسٹیشنوں پر کام کا دباؤ بھی ہے۔ پھر پولیس کو وزراء کی حفاظت کی ڈیوٹی سے فرصت نہیں ہے۔ بعض دوسری عام شخصیات کے تحفظ کے لیے بھی پولیس والے مامور کیے جاتے ہیں۔ پولیس والے خود بھی ایسی ڈیوٹی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ یہاں اچھا کھانے کو مل جاتا ہے۔ رہنے سہنے کے انتظامات بھی بہت سہولت والے ہوتے ہیں۔

مہذب اور ذمہ دار معاشروں میں ایک قتل بھی ہوجائے تو پولیس انسپکٹر۔ خفیہ اہلکار۔ کرمنالوجی کے ماہرین بھی قتل کے اسباب کی تہہ تک جاتے ہیں۔ پاکستان میں بالخصوص کراچی اور بڑے شہروں میں متعلقہ پولیس اسٹیشن ایسی وارداتوں سے پہلے ان جرائم پیشہ کو گرفتار کرتے ہیں۔ اور نہ ہی واردات کے بعد بھی کئی کئی مہینے تک ڈاکو پکڑے جاتے۔ شہر میں جگہ جگہ کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ فوٹیج بھی مل جاتی ہے۔ ان میں چہرے واضح نظر آرہے ہوتے ہیں۔ نادرہ کا ریکارڈ دیکھ کر ذمہ دار تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ کسی بڑے گھر کا بیٹا اگر واردات کا شکار ہوتا ہے تو پولیس حرکت میں آجاتی ہے مگر اصل مجرم پھر بھی گرفتار نہیں کیے جاسکتے۔

بڑا میڈیا بھی نوجوانوں کی ہلاکتوں کے اس سلسلے کو اتنا سنگین اور اہم نہیں سمجھ رہا جتنا یہ ہے کہ مزاحمت پر تو جواز بنتا ہے کہ اس میں ڈاکو مارا جاسکتا ہے یا ڈاکو کا ہدف۔ لیکن اب یہ نیا رجحان سامنے آرہا ہے کہ سب کچھ آرام سے دینے والے نوجوانوں کو بھی ڈاکو جاتے وقت گولیاں مار دیتے ہیں۔

ابھی تک کوئی ایسی تحقیق سامنے نہیں آئی کہ یہ ڈاکو کسی ایک گینگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا الگ الگ گروہ ہیں موقع واردات پر

---

1۔ 3 جنوری کورنگی عوامی کالونی 26 سالہ شاہد احمد

2۔ 5 جنوری شارع فیصل تھانہ خاتون ثناء طارق

3۔ 9 جنوری سچل اسکیم 33 سالہ نوجوان عبدالرزاق

4۔ 10 جنوری کو دم توڑ گیا نیو سبزی منڈی کے قریب زخمی ہوا تھا۔ نور رحمان

5۔ PS سرجانی یارو گوٹھ سلمان ولد شکیل گھر میں دوران واردات مزاحمت پر قتل۔ کمپیوٹر ہارڈ ویئر کام کرتا تھا۔

6۔ 8 جنوری کو زخمی ہونے والا کیمرہ مین دوران علاج ہلاک ہوا۔ الوارث ولد عبدالرشید بلدیہ 16 جنوری کو دم توڑا۔

7۔ PS بلال کالونی سیکٹر فائیو اے نارتھ کراچی عبدالعزیز بروز منگل 17 جنوری گھر کے باہر قتل کیا گیا۔

8۔ 17 جنوری PS بوٹ بیسن 25 سالہ شان ولد اسلم نیوی اہلکار تھا پارک ٹاور کے قریب قتل ہوا مزاحمت پر۔

9۔ PS شارع فیصل مہتاب شاہ ولد نوابشاہ 22 جنوری دار الصحت کے قریب ایک جنرل اسٹور میں سیلز مین تھا۔

10۔ VPS سعید آباد نعیم گلشن بزار ڈاکوؤں نے فرار ہوتے ہوئے قتل کیا مزدوری کرتا تھا۔ بلوچ تھا 23 جنوری بروز پیر۔

11۔ PS مومن آباد اورنگی سوزوکی ڈرائیور سات بچوں کا باپ تھا۔ 24 جنوری بروز منگل۔

12۔ وقاص نیازی ولد حبیب اللہ نیازی PS منگھوپیر جمعرات جمع کی درمیانی شب بلدیہ کا رہائشی تھا 27 جنوری وقوعہ پیش آیا کار لے گئے رینٹ کی۔

13۔ PS منگھوپیر اتوار پیر درمیانی شب عبدالرزاق خاصخیلی TCF اسکول سلطان آباد سیمنٹ سپلائی کا کام 3 بجے گھر کے قریب واقعہ 30 جنوری۔

14۔ PS سرجانی سیکٹر 36 ٹنکی کے قریب LPG شاپ پر زخمی۔ بروز بدھ یکم فروری، 2 فروری جمعرات کو شرجیل ولد شبیر ku hlakt32 سالہ۔

15۔ PS شارع نور جہاں 2 فروری بروز جمعرات اینٹی انکروچمنٹ کا اہلکار قربان علی کانسٹیبل 2 موبائل فون لے گئے شادمان ہائیٹس سخی حسن۔

16۔ 23 جنوری کو زخمی ہوا لیاری ایکسپریس وے پر فروری میں دوران علاج ادریش بلوچ بیوی بچوں کے سامنے مارا۔

17۔ 13 جنوری کو قتل 72 سالہ نسیم بی بی گھر کے اندر قاسم آباد لیاقت آباد گلہ کاٹ کر قتل کیا 74 ہزار موبائل فون اور زیورات لوٹے بندے لیاقت آباد انویسٹی گیشن ٹیم نے پکڑے۔

18۔ 16 فروری بروز جمعرات درمیانی شب مزمل ویلڈر تھا پی آئی بی کا رہائشی۔ PS اجمیر نگری شاہ نواز بھٹو کالونی میں 2 بجے بیوی بچوں کے سامنے مارا گیا

# میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں؟

موبائل فون چھینے جانے کے نام پر کراچی والوں کی ٹارگیٹ کلنگ بند کرو

کہاں ہے ریاستِ پاکستان جو کراچی کے بے گناہوں کے قتل پر خاموش تماشائی بنی بیٹھی ہے

کہاں ہے وزیرِ اعلیٰ سندھ اور کہاں ہے گورنر سندھ کیا تمہیں معصوم بے گناہ شہریوں کا خون نظر نہیں آتا

کہاں ہے کراچی میں سیاست کرنے والے جو الیکشن سے قبل تحفظ دینے وعدہ کر کے گئے تھے

کراچی والے اپنے ٹیکس سے پورے پاکستان کو چلائیں اور بدلے میں کراچی دی جاتی ہیں صرف لاشیں

بھیجنے سے پہلے ان کے مافیا چیف انہیں کیا لالچ دیتے ہیں۔ اور انہیں روز کا ٹارگٹ کیا دیا جاتا ہے۔ جب یہ واردات کے لیے نکلتے ہیں کیا نشہ کرکے نکلتے ہیں ۔میڈیا کے علاوہ شہر میں سماجی تنظیمیں۔ حقوق انسانی کے ادارے۔ درسگاہیں بھی ان المیوں کو بہت خاموشی سے برداشت کررہی ہیں۔

یہ وارداتیں لرزہ خیز ہیں۔ پاکستان ایک نوجوان ملک ہے۔ 15 سے 35 سال تک کے پاکستانی آبادی کا 60 فی صد ہیں پاکستان جوان ہے۔یہ جوانی۔ یہ توانا دست وبازو پاکستان کی مملکت کے لیے بھی ایک اثاثہ ہے۔ ایسے معاشرے کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔2023 اور 2024 میں اپریل کے مہینے تک جو ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ان میں زیادہ تر 25 سے 30 کے درمیانی عمر کے ہیں۔زیادہ تر اچھے پڑھے لکھے۔ برسر روزگار۔ان میں انجینئر ہیں۔ ڈاکٹر بھی۔ اکاؤنٹنٹ بھی۔ اپنا چھوٹا موٹا کاروبار کرنے والے۔آج کی اصطلاح میں انہیں 'اسٹارٹس اپ' کہا جاتا ہے۔ پولیس اس حوالے سے کوئی تفتیش نہیں کررہی ہے کہ کہیں یہ سازش تو نہیں ہے کہ نوجوانوں کی پے در پے ہلاکتیں کرکے دوسرے نوجوانوں کو خوفزدہ کیا جائے۔ اور وہ کسی نہ کسی ملک کے ویزے کے لیے کوشش میں لگ جائیں۔

گزشتہ ایک سال میں کئی لاکھ نوجوان ترک وطن کرکے چلے گئے۔ مہنگائی بڑھ رہی ہے۔افراط زر میں اضافہ ہورہا ہے۔بے روزگاروں کی تعداد ہر روز دو چند ہوجاتی ہے۔اس اضطراب کے عالم میں کسی متوسط طبقے کے خاندان کو اگر اپنے نوجوان کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑجائے تو اس گھرانے کی نفسیاتی صورت حال کیسی ہوگی۔

'اطراف' ابتدا کررہا ہے۔ایک راستہ دکھا رہا ہے۔ بڑے میڈیا کو ان رجحانات پر تحقیق صرف کراچی میں ہی نہیں۔ لاہور۔ ملتان۔ حیدرآباد۔ سکھر۔ فیصل آباد۔ راولپنڈی۔ کوئٹہ۔ پشاور۔ مردان۔ کوہاٹ وغیرہ میں بھی کرنی چاہئے۔مقتولین میں کس عمر گروپ کی اکثریت تھی۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے کتنے۔غریب تر

## 2024۔رمضان المبارک میں بھی ڈاکے اور قتل جاری رہے

کتنے۔ کن پولیس اسٹیشنوں کی حدود میں زیادہ واقعات ہوئے۔ پولیس کی کارکردگی کیسی ہے۔اصل کرمنل کتنے فی صد پکڑے گئے۔ عدالتوں سے کتنے چھوٹ جاتے ہیں اور کن اسباب پر۔ پولیس استغاثہ درست نہیں بتاتی۔ یا ڈاکوز یادہ بااثر ہیں۔کلوز سرکٹ کیمرے۔موبائل فونوں میں لگے آلات ناکام کیوں ہورہے ہیں۔ ہر نوجوان کسی گھرانے کا لاڈلا۔ پیارا اور خود کفیل ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی وزیر۔ آئی جی ڈی آئی جی یہ بیان دیتا ہے کہ دوسرے شہروں میں زیادہ وارداتیں ہورہی ہیں کراچی کے واقعات کو کیوں اچھالا جاتا ہے۔ یہ بہت ہی سنگدلانہ رویہ ہے۔ پولیس اور ریاست کا فرض ہے ایک اس پاکستانی کے جان و مال کی حفاظت ۔اس میں اگرنا کام ہے تو پوری ریاست ناکام ہوجاتی ہے۔

---

19۔ 18 فروری بروز ہفتہ PS تیموریہ 15A1 بفرزون ڈاکوؤں سے مقابلہ پراپرٹی ڈیلر سمیر ملک ہلاک ایک ڈاکو بھی ہلاک ایک بچے کا باپ تھا۔

20۔19 فروری ہفتہ اور اتوار کی درمیانی شب PS شاہ لطیف ٹاؤن مقتول محبوب جماعت اسلامی کونسلر کا بھائی سٹی اسپتال سیکٹر 17-B

21۔22 فروری بروز منگل بدھ کی درمیانی شب مقابلہ۔ ناصر چوکی انچارج اظہر شہید 2 بچوں کا باپ 2 ڈاکو بھی ہلاک۔

22۔مواچھ گوٹھ پرکاش ولد ڈیسر 21 فروری حب ریور روڈ ڈاکو نے گاڑی روکی گولی ماری موقع پر ہی ہلاک۔ڈرائیور تھا حب سے واپسی پر واقعہ ہوا ہاتھ آئی لینڈ فیملی لے جارہا تھا۔

23۔22 فروری بدھ PS ماڑی پور عابد حسین LPG شاپ پر 4 بجے تھے ڈکیتی مزاحمت پر قتل۔شیر شاہ گلبائی کا رہائشی تھا۔

24۔PS منگھوپیر حسن بروہی گوٹھ بروز ہفتہ 25 فروری ابوالحسن واٹر ٹینکر ڈرائیور ڈاکو کو پکڑنے کی کوشش میں ہلاک 2 زخمی بھی ہوئے 2 ڈاکو ہلاک۔

25۔5 مارچ ہفتہ اتوار کی درمیانی شب PS22 ایف بی انڈسٹریل ایریا حذیفہ ولد غلام عباس مالشئی تھا 3 بچے پنجاب سے تعلق۔ سینے میں گولی ماری۔سہراب گوٹھ مدینہ کالونی کا رہائشی تھا۔

26۔PS بچل 18 فروری 45 سالہ ابوبکر عائشہ منزل کا رہائشی ۔2 بیٹیوں کا باپ تھا سیلز مین تھا ڈکیتی مزاحمت پر قتل۔

28۔17 مارچ بروز جمعہ تھانہ گبول ٹاؤن فیکٹری ملازم ادریس رحیم یار خان آبائی ہوٹل سے کھانا کھا کر نکلا دوملزمان کی جانب سے موبائل چھیننے پر مزاحمت پر گولی ماری۔

29۔19 مارچ بروز اتوار PS لانڈھی بابر مارکیٹ جنرل آٹوز پر ڈکیتی ۔ڈاکو کو پکڑنے کی کوشش کی تو گولی ماردی اکرم ولد عبدالوہاب 45 سالہ۔

30۔PS شیر شاہ 21 مارچ بروز منگل لیاری ایکسپریس وے موٹر وے چوکی غلامان عباس مقابلہ پولیس ۔۔۔۔عرفان۔۔۔۔ASI زخمی ڈاکو فرار سرراہ لوٹ رہے تھے کسٹم والے کو۔

31۔PS زمان ٹاؤن 22 مارچ بروز بدھ حسیب ولد محمد حسین کورنگی 5 محمدی کالونی رہائشی۔شادی شدہ۔واقعہ 51C میں ہوا پیزا رائیڈر تھا۔گولی ماری مزاحمت پر چناچاٹ لے رہا تھا۔

32۔PS منگھوپیر 22 مارچ بروز بدھ غازی گوٹھ سوزوکی میں لیٹا تھا ڈرائیور تھا فیصل آباد کا رہائشی تھا گولی پیٹ میں لگی۔

33۔PS سرجانی بروز اتوار ریٹائرڈ اہلکار موٹروے پولیس 26 مارچ منظور علی شاہ سیکٹر ڈی گلستان کاظم سرجانی P238۔

34۔PS فیروز آباد ہفتہ 25 مارچ موٹر سائیکل چھیننے کی کوشش میر حبیب شاہ ولد دین پاشا آدم جی نگر دھوراجی بلاک ٹو چوکیدار تھا۔

35۔PS سرجانی 31 مارچ بروز جمعہ سیکٹر 4B سجاد ولد محمد اکبر پاور لوم کا کام ۔شادی ہال افطار کرکے گھر آنے کے لیے دوست کا انتظار کررہا تھا۔

36۔PS بغدادی ٹرانسپورٹر منشی لی مارکیٹ عبدالوحید ولد خالد بلوچ خضدار کا رہائشی۔افطار کے بعد مارا 4 اپریل 40/50 ہزار لوٹے 3 بچوں کا باپ تھا۔

# اپریل میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں بارہ افراد نے اپنی جان گنوائی

**1اپریل۔۔۔۔۔۔21رمضان**

تھانہ گلشن معمار ڈکیتی مزاحمت پر ڈاکوؤں نے گاڑی پر فائرنگ کردی، فائرنگ سے ایک شخص 40 سالہ امجد موقع پر جاں بحق جبکہ 40 سالہ امان اللہ زخمی ہوگیا عینی شاہد نے بتایا کہ 2افراد کار پر جارہے تھے، موٹرسائیکل سوار ملزمان نے گاڑی پر فائرنگ کی، ایک ملزم نے ماسک اور دوسرے نے ہیلمٹ لگایا ہوا تھا، کار میں سوار ایک شخص کلمہ پڑھ رہا تھا۔

**3اپریل۔۔۔۔21رمضان**

تھانہ شارع نورجہاں نارتھ ناظم آباد انڈا موڑ پر گھر میں افطاری کے لیے پھل لینے آنے والے بزرگ شہری 70 سالہ سید حامد علی کو ڈاکوؤں نے فائرنگ کرکے موت کی نیند سلادیا۔۔ مقتول جماعت اسلامی کے بزرگ رکن تھے۔

**3اپریل۔۔۔۔23رمضان**

تھانہ بلال کالونی نارتھ کراچی پاور ہاؤس کے قریب ڈاکوؤں کی فائرنگ سے عامر نامی شہری قتل مقتول عامر طارق روڈ پر ایک بوتیک میں کام کرتا تھا، بھائی شاکر کا کہنا تھا ڈاکوؤں نے پاور ہاوس پر عامر کو فائرنگ کرکے قتل کیا

**4اپریل۔۔۔۔۔چوبیس رمضان**

تھانہ اورنگی ٹاؤن بنارس علی گڑھ مارکیٹ کے قریب دکان پر

> گل فروش۔طالب علم۔سیکورٹی گارڈ
> سیلز پرسن۔ویلڈر۔مزدور۔
> پراپرٹی ڈیلرسب شامل

فائرنگ سے ایک شخص جاں بحق ہوا مقتول کی شناخت آصف کے نام سے ہوئی، پولیس نے سی سی ٹی وی فوٹیج حاصل کرکے ملزمان کی تلاش شروع کردی جبکہ مقتول کے اہل خانہ کے مطابق واقعہ ڈکیتی مزاحمت پر پیش آیا

**4 اپریل۔۔۔۔۔چوبیس رمضان (دو شہری قتل)**

تھانہ منگھوپیر نیو ناظم آباد پولیس اور ڈاکوؤں میں فائرنگ کی زد میں آکر دو شہری جاں بحق اور ایک شہری غلام مصطفی زخمی ہوگیا، واقعہ میں ایک ڈاکو کو بھی گرفتار کرلیا۔ مقتولین کی شناخت سائیں داد اور شبیر احمد مغل کے ناموں سے ہوئی،،، ساتھی ملازمین کا کہنا تھا مقتول شبیر احمد مغل کا تعلق ٹنڈوالہیار سے تھا مقتول تعمیراتی کمپنی میں کنٹریکٹ پر بطور ویلڈر کام کررہا تھا مقتول نیا ناظم آباد کے گیٹ کے قریب موجود کھڑا کمپنی کی گاڑی کا انتظار کررہا تھا مقتول پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان فائرنگ کی زد میں آیا مقتول دو ماہ قبل ہی روزگار کے سلسلے میں کراچی آیا تھا، جبکہ جاں بحق دوسرے شہری سائیں داد کے اہل خانہ کا کہنا تھا مقتول کا آبائی تعلق عمرکوٹ سے تھا مقتول جونہی گھر سے باہر نکلا نامعلوم سمت سے آکر گولی لگی، مقتول کی ایک سال قبل شادی ہوئی تھی، بچے نہیں تھے، ساتھی مقتول کراچی میں مزدوری کرتا تھا۔

**8اپریل۔۔۔۔28رمضان (تین قتل)**

تھانہ سائٹ (اے) میٹرو ول نمبر چار گاڑی پر فائرنگ کرکے ذاکر اور شیر عالم کو موت کی نیند سلا کر ایک کروڑ پینتیس لاکھ

---

37۔PS میمن گوٹھ بروز اتوار 9اپریل سوزوکی پر فائرنگ۔فیکٹری ورکر شاہ نواز لاڑکانہ آبائی۔ایک بچی کا باپ تھا ڈاکو گرے پھر فائرنگ کردی سوزوکی پر۔

38۔PS شاہ لطیف ٹاؤن جوگی موڑ شاہد 3بچوں کا باپ پورٹ قاسم میں ملازم تھا حسن انور گوٹھ کا رہائشی تھا جاب پر جارہا تھا کزن کے ساتھ۔

39۔PS سہراب گوٹھ ایوب گوٹھ خلیل گراؤنڈ سمیع ولد صابر احسن آباد کا رہائشی 18 سالہ فیکٹری ورکر چنگ چی رکشہ میں ڈاکو کی فائرنگ کی زد میں ڈرائیور زخمی ہوا۔

40۔PS گڈاپ بحریہ ٹاؤن سیکورٹی گارڈ ڈاکوؤں نے سینے میں گولی ماری 13اپریل اقرار ہلاک امتیاز زخمی بحریہ سیکورٹی سے تعلق 2ڈاکو پکڑے گئے ایک فرار۔

41۔PS سعید آباد خورشید پورہ قبرستان 25 سالہ خالد اقبال ٹرانسپورٹر بھائی کے سامنے قتل 15اپریل بروز ہفتہ کشمیر کالونی کا رہائشی۔8ماہ قبل شادی۔

42۔PS کورنگی 17اپریل بروز پیر روحا میڈیکل اسٹور کورنگی یاسر ولد بشیر میڈیکل اسٹور ملازم کورنگی کا رہائشی تھا افطار کے فوری بعد قتل۔

43۔PS کورنگی 25اپریل بروز منگل زخمی ہوا بدھ کو دم توڑا۔چھیننے کے دوران مزاحمت پر قتل شاپنگ بیگ دکان پر ملازم حذیفہ میٹرک کا طالب علم تھا۔

44۔PS بہادر آباد 26اپریل بروز بدھ عبدالرؤف الیکٹریشن استری ٹھیک کرنے کا کام گھر کے باہر مارا گیا 2ملزم پکڑے گئے۔

45۔27اپریل PS گلستان جوہر پہلوان گوٹھ سیکورٹی گارڈ شکیل اسلحہ لے گئے 2بچوں کا باپ رحیم یار خان سے آبائی تعلق بیکری پر تعینات تھا۔

46۔PS گلشن اقبال مقتول احسن بلاک 11 سیکورٹی گارڈ اور ڈاکوؤں میں فائرنگ کی زد میں آکر ہلاک۔پان کے کیبن پر موجود تھا یکم مئی بروز پیر۔

47۔4مئی PS منگھوپیر عبدالسلام شربت فروخت کرتا تھا بروز جمعرات گھر کے باہر ڈاکوؤں سے ہاتھا پائی سر میں گولی لگنے سے ہلاک۔

48۔PS پاک بازار بروز جمعہ 5 مئی اورنگی سیکٹر 14-C نوید کریانہ اسٹور میں ہلاک سر اور ہاتھ میں گولی۔غیر شادی شدہ وین چلاتا تھا۔

49۔PS گلبہار سینٹری مارکیٹ بروز اتوار 7 مئی الواحد موٹرز ڈکیتی مزاحمت پر پلمبر ہلاک دانیال سلیم زخمی۔ڈاکو موٹرسائیکل چھوڑ کر فرار۔

50۔PS سرجانی ٹاؤن 6 مئی کو واقعہ پیش آیا 3 ملزم 15 مئی کو پکڑے گئے پولیس اہلکار عظیم اقبال ڈاکوؤں پر پستول نکالا تو مارا گیا سادہ لباس میں تھا۔

51۔10 مئی بروز بدھ PS عوامی کالونی شہری اظہر حسین ہلاک ایک ڈاکو موقع پر ہلاک 2 زخمی پکڑے گئے کلو چوک کے قریب واقعہ پیش آیا۔

52۔12 مئی بروز جمعہ تھانہ ٹیپو سلطان شارع فیصل قادری ریسٹورینٹ کا منیجر ہلاک مالک زخمی۔عظیم ولد عمر مقتول۔زخمی فضل محمد۔مقتول 4بچوں کا باپ آبائی شہر پشاور۔

53۔12 مئی بروز جمعہ مدینہ کالونی ناصر خٹک پراپرٹی ڈیلر تھا ہلاک۔ایک ملزم موقع پر ہلاک' گرفتار۔

54۔PS نارتھ ناظم آباد میٹرک بورڈ آفس کے قریب آصف گجر عیدالفطر کے روز زخمی دوران علاج ہلاک۔رینجرز اہلکار تھا۔SSP نے پریس کانفرنس میں گرفتاری ظاہر کی-16 مئی کو وقوعہ ہوا۔

56۔PS سرجانی 20 مئی بروز ہفتہ اور جمعہ درمیانی شب گھر میں ڈکیتی 3 بھائی زخمی ایک ہلاک مقتول گوشت کا کام کرتا تھا ایک ملزم پکڑا گیا 3 فرار ہوگئے۔

57۔PS سعید آباد یونس گوٹھ کریانہ اسٹور 25 مئی بروز جمعرات نصیر حسین ولد رمضانی 55 سالہ مقتول۔آبائی تعلق پنجاب۔10 روز پہلے افتتاح کیا تھا اسٹور کا۔

58۔PS بلوچ کالونی منظور کالونی سیکٹر 8 غزالی روڈ برگر فروش عدیل عباسی 2 بیٹیوں کا باپ تھا موبائل فون اور 8 / 7ہزار نکالے تو مزاحمت پر قتل ہفتہ اتوار کی درمیانی شب کو۔

59۔PS سائٹ سپر ہائی وے 28 مئی بروز اتوار ہوٹل مالک ندیم ہلاک۔بھائی زخمی ایک ڈاکو کو پکڑ لیا تھانئی سبزی منڈی کے قریب جنجال گوٹھ میں وقوعہ۔

60۔PS گلبرگ پیر اور منگل کی درمیانی شب دانش ولد شاہد ہلاک مقامی رہائشی ڈاکوؤں کی فائرنگ کی

# کراچی میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں نوجوانوں کا قتل

روپے لوٹ لئے گئے، جاں بحق دونوں افراد پولٹری کمپنی کے ملازم ہیں، جاں بحق شخص شیر عالم اکاؤنٹس کا کام کرتے تھے، جاں بحق شخص دوسرا شخص آفس کا ملازم ہے جاں بحق افراد رقم بینک میں جمع کروانے جا رہے تھے ملزمان رقم لوٹ کر فرار۔ تھانہ سچل اسکیم 33، سکندر گوٹھ ڈاکوؤں نے گلزار ہجری میں ڈاکوؤں نے شجاعت علی کو موت دیدی۔ فائرنگ سے شجاعت علی ولد نیاز علی جاں بحق، مقتول کے بھائی کا کہنا ہے واقعہ ڈکیتی مزاحمت کا شاخسانہ ہے پولیس نے بتایا کہ فائرنگ ڈاکوؤں کی جانب سے کی گئی تھی شجاعت شادی شدہ اور پک اینڈ ڈراپ کرتا تھا

**8اپریل_____28رمضان (زخمی جاں بحق)**

تھانہ سائٹ (بی) 31مارچ کو زخمی ہونیوالا سیکورٹی فورس کا افسر چل بسا واقعہ شیر شاہ میں پیش آیا تھا، مقتول سعد حب میں تعینات تھا، پولیس کا کہنا ہے مقتول کو دوران لوٹ مار ڈاکوؤں نے فائرنگ کر کے شدید زخمی کیا تھا مقتول کراچی گلشن اقبال کا رہائشی اور دو بچوں کا باپ تھا

**9اپریل_____29رمضان**

تھانہ شریف آباد بلوچ ہوٹل بندھانی مسجد کے قریب سیکورٹی گارڈ واحد جاں بحق ہوا ایس ایس پی سینٹرل ذیشان صدیقی کا کہنا ہے علاقے میں پولیس اور رینجرز کی اسنیپ چیکنگ جاری تھی ملزمان گرفتار کے خوف سے موٹر سائیکل چھوڑ کر فرار ہوئے فرار ملزمان قریبی سوسائٹی میں داخل ہوئے جن کو گارڈ نے پکڑنے کی کوشش کی ملزمان کی فائرنگ سے سیکورٹی گارڈ جاں بحق ہوگیا

**12 اپریل**

تھانہ گلشن اقبال ڈاکوؤں نے تراب زیدی نامی شخص کو مزاحمت پر سر پر گولی ماردی پولیس کا کہنا ہے واقعہ ڈکیتی مزاحمت پر رونما ہوا۔ 0333 3103101

□ماہ رمضان میں ڈاکوؤں کی فائرنگ سے اکیس افراد جان سے گئے۔

# 2024 میں نوجوان ہلاکتیں

- ❁ جنوری سرجانی ٹاؤن، شادی میں جانے والے باپ بیٹے سے لوٹ مار، بیٹا جاں بحق، باپ زخمی،
- ❁ چودہ جنوری موچکو مینگل ہاؤس کے قریب میٹرک اسٹوڈنٹ مزمل موبائل فون چھیننے کے دوران قتل
- ❁ سترہ جنوری کو زخمی اگلے روز صبح ہلاک ہوا، پی ایس زمان ٹاؤن غوث پاک روڈ ایان ولد ایاز میٹرک کا طالبعلم تھا۔
- ❁ انتیس جنوری تھانہ مبینہ ٹاؤن گبول پارک کے قریب 18 سالہ کامران ولد مرید، پیشے سے ڈرائیور قتل، راجن پور سے آبائی تعلق، ایک ملزم بھی پکڑا گیا،
- ❁ انتیس جنوری پی ایس این کے آئی اے تاج ولد محمد رحیم ہلاک
- ❁ انتیس جنوری بروز پیر چانڈیو چوک یارو گوٹھ کے قریب 28 سالہ گل محمد پھل فروش افغانی تھا گھر کی جانب جا رہا تھا، کہ ڈاکوؤں نے لوٹ مار کے بعد اسے گولی ماردی۔
- ❁ چار جنوری بروز جمعرات شاہ فیصل عظیم پوری جمعہ گوٹھ قبرستان کے قریب پھل فروش ڈاکوؤں کی فائرنگ سے شدید زخمی ہوا، دوران علاج ہلاک ہوا، امجد ولد صابر 48 سالہ، ملزم مارچ میں الفلاح پولیس نے پکڑے
- ❁ 1فروری تھانہ سہراب گوٹھ گنا منڈی کے قریب ڈاکوؤں کی فائرنگ، کباڑ کا کام کرنے والا سارگل ہلاک
- ❁ یکم فروری ہلاک، فرحان فاروقی ولد خلیل فاروقی
- ❁ 12فروری جمشید کوارٹر تین ہٹی مارکیٹ کورنگی سے آیا گل فروش جبران ہلاک،
- ❁ چھ فروری اورنگی ٹاؤن نمبر 10 سہیل احمد ہاشمی، ہلاک
- ❁ 2مارچ ٹریول ایجنسی پر لوٹ مار کے دوران فائرنگ ،سیکیورٹی گارڈ ظہور خان ہلاک،
- ❁ 3مارچ بروز پی کورنگی لاریب بی بی اے کا طالبعلم ہلاک
- ❁ 4 مارچ بہادر آباد راہگیر کارپینٹر نذر پولیس مقابلے کے دوران زد میں آکر ہلاک، نزید سلطان
- ❁ 5مارچ کورنگی ویٹا چورنگی کے قریب فیکٹری ملازم فیاض ہلاک دوست زخمی،
- ❁ 6مارچ کورنگی فدا حسین ہلاک، خالی پلاٹ پر چوکیدار تھا،

زد میں آیا غیر شادی شدہ 30 مئی۔

61ـ PS بلوچ کالونی بروز پیر ٹریفک پولیس اہلکار وارث خان حیدر آباد سے آبائی تعلق۔ ڈاکو ہوٹل پر واردات کر رہے تھے بروز پیر 29 مئی ایک ماہ قبل شادی ہوئی تھی۔

62ـ PS سائٹ سپر ہائی وے ریاض احمد ولد علی احمد 65 / 64 سالہ ڈائمنڈ سٹی سوسائٹی احسن آباد روڈ واقعہ بروز اتوار مورخہ 4 جون نارتھ کراچی کا رہائشی تھا بائیں ٹانگ میں گولی لگی تھی۔

63ـ PS ابراہیم حیدری 6 جون کو ہلاک ہوا۔ گھر میں ڈاکو چار روز پہلے آئے تھے بوہول کیسوانی بیٹا زخمی ہوا تھا 2 ڈاکو پکڑے گئے۔

64ـ PS سائیٹ سپر ہائی وے کارپینٹر تھا 6 جون کو واقعہ شفیق احمد زکریا کالونی کا رہائشی۔ آبائی تعلق جیکب آباد سے تھا بائیک نہ روکنے پر گولی ماری۔

65ـ PS میمن گوٹھ 15 جون بروز جمعرات ڈاکوؤں سے مقابلہ۔ پولیس کانسٹیبل عمران کی ہیڈ کوارٹر میں پوسٹنگ تھی دکان پر ڈکیتی ہو رہی تھی پولیس پہنچی مقابلے کے دوران مارا گیا۔

66ـ PS زمان ٹاؤن 21 جون کی صبح بروز بدھ 40 سالہ عرفان 2 بچے گلفروش گھر میں ڈاکو مار کر فرار۔

67ـ 22 جون بروز جمعرات معمار موڑ شنگریلا کمپنی کے قریب طارق ولد اللہ دتہ ہلاک۔ ساجد ولد اسلم زخمی۔ PS سائٹ سپر ہائی وے سے اچار کمپنی ملازم یثرب کالونی رہائشی

68ـ 26 جون بروز پیر PS پاپوش امین الدین علوی پاکستانی نژاد کینیڈین تھا بچوں کو گھمانے لایا ڈاکو نے ایک گولی ٹانگ پر ماری ہلاک دل کا مریض بھی تھا۔

69ـ 27 جون بروز منگل علی الصبح PS اقبال مارکیٹ اورنگی ٹاؤن سبزیوں کا آڑھتی نسیم ولد عبدالرحیم ۔ڈاکو نے ہلاک کیا۔

70ـ PS سکھن بروز جمعہ عید کا دوسرا دن 30 جون بھینس کالونی نمبر 6 حاجی یونس اور زاہد قریشی سالہ بہنوئی زاہد مارٹ کو مالک ڈاکوؤں نے پستول سے سالے کو مار دیا بہنوئی کو زخمی کیا۔

71ـ PS سکھن حاجی یونس یو کے کا رہائشی۔ اٹک آبائی۔ ایک بیٹی کا باپ تھا دوراں علاج ہلاک اتوار کو 22 جولائی کو ہوا ملک اسپتال میں۔

72ـ 4 جولائی بروز منگل کو 3 ملزم گرفتار ہوئے واقعہ 18 اپریل کو پیش آیا فیکٹری چوکیدار غلام مرتضیٰ کو قتل کیا فیکٹری ملازم ایاز سلمان ساتھی اور کباڑیہ فیصل شامل تھے۔

73ـ PS شاہ لطیف بھینس کالونی اسلم پتافی بھینسوں کے باڑے کا مالک چہرے پر گولی ماری لاکھ روپے چھینے عرفانی گوٹھ رہائشی دو ڈاکو پکڑے گئے تیسرا فرار 5 جولائی وقوعہ

74ـ PS قائد آباد لانڈھی مظفر آباد کالونی فیکٹری میں آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ میں ملازم 2 بچوں کا باپ چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی احسان اللہ تنولی بروز اتوار 9 جولائی کو واقعہ پیش آیا۔

75ـ PS شاہ لطیف بروز منگل رزاق آباد ٹریکٹر ڈرائیور کام سے واپسی پر روکا چڑھائی پر فائر کیا کمر میں گولی آر پار خون بہہ جانے پر موت۔

76ـ 14 جولائی بروز جمعہ PS سچل نوحہ خواں حسنین نیو رضویہ کا رہائشی ملزم بائیک چھوڑ کر فرار۔

# کراچی میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں نوجوانوں کا قتل

- 7 مارچ کوملیر کینٹ دودھ فروش دکان دار جمیل، ہلاک
- 8 مارچ فرحان ہلاک ، پی آئی بی کالونی حسن اسکوائر سے عیسیٰ نگری جانے والی سڑک پر واقعہ ہوا تھا
- 9 مارچ اورنگی ٹاون سیکٹر پندرہ میں فرحان، ہلاک
- 10 مارچ کو گھر کے باہر اورنگی ٹاؤن کرسچن کالونی اختر جیمز لوکھا ڈاکوؤں نے موبائل چھینا سر میں گولی ماری، راہگیر بھی زخمی ہوا
- 14 مارچ اورنگی ٹاؤن نیو قطر اسپتال کے باہر پولیس اورڈاکوؤں کے درمیان فائرنگ کے تبادلے میں زد میں آئی خاتون شازیہ موقع پر ہی جاں بحق۔
- 15 مارچ راشد منہاس روڈ پر ڈاکوؤں کی فائرنگ سے ہلاک، دو بچوں کا باپ، فوڈ ڈیلیوری والا
- 16 مارچ اسٹیل ٹاون گھر سے گلا کٹی لاش ملی، پورٹ قاسم کا ریٹائرڈ ملازم تھا، ملزم گھر کا صفایا کر گئے
- 17 مارچ ایوب گوٹھ میں پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان مقابلے کی زد میں آکر ایک راہگیر ہلاک

**پولیس اسٹیشن مقتولین کے کوائف یکجا کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے**

- 2 اپریل بلال کالونی پاور ہاؤس کے قریب عامر نامی نوجوان ڈاکوؤں کی فائرنگ سے جاں بحق،
- 3 اپریل شارع نور جہاں سید حامد علی جاں بحق،
- چار اپریل اورنگی ٹاؤن علی گڑھ بازار پلاسٹک اشیاء کا سپلائر، دکان کے اندر قتل ہوا، بینک میں رقم جمع کرا کر آیا تھا،
- 5 اپریل منگھوپیر نیا ناظم آباد کے قریب ڈاکوؤں نے فائرنگ کی، ویلڈر شبیر مغل جاں بحق
- 6 اپریل منگھوپیر نیا ناظم آباد کے قریب ڈاکوؤں نے فائرنگ کی، سائیں داد، راہگیر مزدور جاں بحق، شٹرنگ کا کام کرتا تھا
- 7 اپریل سائٹ اے میٹروول باب خیبر کے قریب گاڑی پر فائرنگ، پولٹری کمپنی ملازم جاں بحق، مقتول شیر عالم، ہلاک ، ایک کروڑ 35 لاکھ لوٹ گئے
- 10 اپریل شریف آباد لیاقت آباد نمبر دس کے قریب ڈاکوؤں کی فائرنگ سکیورٹی گارڈ وحید جاں بحق
- 11 اپریل عید الفطر کا دوسرا دن، پی ایس گلشن اقبال گلشن چورنگی کے قریب اے ٹی ایم سے نکلنے والا تراب زیدی قتل، کال سینٹر میں ملازم تھا۔
- 12 اپریل کو دوران علاج وسیم الرحمان آغا خان میں جاں بحق واقعہ چاند رات 9 اپریل کو گلشن معمار سیکٹر وائی میں پیش آیا، گاڑی نہ روکنے پر بزرگ پر فائرنگ
- 17 اپریل ملیر جعفر طیار عمار یاسر سوسائٹی کے قریب راہگیر خاتون شاہدہ جاں بحق،
- 21 اپریل مومن آباد فرنٹیئر موڑ نصیب زرین ولد شمس الدین، ہلاک۔

---

77۔ 18 جولائی بروز منگل PS گلستان جوہر بلاک 9 ایاز ہلاک چائے کی ہوٹل پر فائرنگ سے بھٹائی آباد کا رہائشی فیکٹری ملازم۔

78۔ 20 جولائی PS۔ ایک ٹائر شاپ پر فائرنگ تاجر ہلاک وارث خان زخمی احتجاج موٹر وے بلاک۔

79۔ 20 جولائی بروز جمعرات۔ سائٹ سپر ہائی وے پرچون کی دکان کا مالک جہاں آباد فقیرا گوٹھ کا رہائشی مقتول اسماعیل۔

80۔ PS کورنگی 22 جولائی ہفتے کی صبح خالد سوئیٹس خالد محمود سرگودھا سے تعلق تین بیٹیاں تھیں ڈکیتی مزاحمت پر قتل۔

81۔ PS گلشن معمار بروز جمعرات 8 محرم الحرام نعمان پھلوں کا بیوپاری سینے میں گولی لگی ناردرن بائی پاس کا وقوعہ گاڑی نہ روکنے پر مارا 27 جولائی۔

82۔ PS قائد آباد داستار گراؤنڈ شیر پاؤ کالونی عباس نامی نوجوان گلی میں موبائل فون پر گیم کھیل رہا تھا 2 ڈاکو آئے ایک نے پکڑا دوسرے نے مارا فیکٹری میں مشین آپریٹر 28 جولائی۔

83۔ PS۔ سائٹ سپر ہائی وے یکم اگست عارف خان محسود ٹائر تاجر تھا گاڑی میں سوار تھا رقم 2 موبائل فون چھینے۔

84۔ PS ڈیفنس 30 جون بروز اتوار اختر کالونی سگنل کا شاہین فورس اہلکار ہلاک PS عدنان ہلاک اظہر زخمی۔

86۔ PS ٹیپو سلطان بلوچ پل کے پاس فائرنگ فہد ہلاک۔ ٹیکسی چلاتا تھا 15 اگست بروز منگل ایف بی ایریا کا رہائشی تھا۔

87۔ PS سرجانی ناردرن بائی پاس کا بیوپاری ابراہیم۔ تعلق ہنکورو قوم سے تھا سینے میں گولی 18 اگست بروز جمعہ ناردرن بائی پاس پر احتجاج بھی کیا گیا۔

89۔ PS جوہر آباد 21 اگست پلمبر تھا فیاض چائے کے ہوٹل پر وقوعہ ڈاکوؤں نے فائرنگ کی چھ ملزمان گرفتار ہوئے بروز پیر۔

90۔ PS زمان ٹاؤن بھٹائی آباد 21 اگست بروز پیر زخمی ہوا منگل کو پولیس کانسٹیبل شکیب شہید کراچی پولیس سینٹرل آفس میں تعینات تھا 2 ماہ قبل شادی۔

91۔ PS شاہ لطیف ٹاؤن یعقوب احمد ولد منظور احمد 32 سالہ ڈکیتی مزاحمت پر ہلاک 2 ڈاکو بھی موقع پر پکڑے گئے مورخہ 28 اگست بروز پیر۔

92۔ PS پی آئی بی کالونی 5 ستمبر بروز منگل نفیس آباد گھر کے اندر 17 سالہ لڑکی فضہ قتل 4 ملزم نامزد گھر سے زیورات غائب غیر شادی شدہ

93۔ PS زمان ٹاؤن کورنگی نمبر 2 پرنس بک اسٹال محمد حسین باپ ڈکیتی مزاحمت پر قتل 3 ملزم آئے مورخہ 6 ستمبر بروز بدھ

94۔ PS زمان ٹاؤن کورنگی نمبر 2 پرنس بک اسٹال اسد ولد محمد حسین ڈکیتی مزاحمت پر قتل 3 ملزم آئے مورخہ 6 ستمبر بروز بدھ۔

# اپنے شہر کراچی کے لئے

سینئر شاعرہ۔ انگریزی کی پروفیسر۔ کئی شعری مجموعے۔ اپنا اسلوب اپنا رنگ۔ 'اطراف' کی درخواست پر کراچی کے لیے نظم۔

تحریر: شاہدہ حسن

جو کنارِ قُلزمِ بیکراں ، مرے شہر یار کا شہر ہے
یہ ہے ایک خطۂ جاں فزا، کسی ذی وقار کا شہر ہے
یہ عجب مثال کا شہر تھا ،کبھی یہ کمال کا شہر تھا
مگر اب بہ رنگِ ملال یہ ،غمِ بے شمار کا شہر ہے
اِسے سوچتا ہی نہیں کوئی ، اسے پوچھتا ہی نہیں کوئی
یہ جو اختیار کا شہر تھا ، یہ جو اعتبار کا شہر ہے
یہاں اک ہجوم ہے بیکراں، یہاں سب کو چاہئے اب اماں
کہ یہ بے گھروں کا ہے سائباں ،غمِ روزگار کا شہر ہے
یہاں بے یقیں سے جو لوگ ہیں ،کسی انتظار میں مبتلا
یہ ہزیمتوں کے سفر میں ہیں کہ یہ انتشار کا شہر ہے
یہاں بے دریغ جفا ہوئی ، یہاں کربلا بھی بپا ہوئی
یہ گروہِ خیر کی قتل گہہ، یہ ستم شعار کا شہر ہے
یہاں لوگ خوف سے مر گئے ، یہاں خاندان اُجڑ گئے
یہ ہے اشک و آہ کی رہگزر ، دلِ بیقرار کا شہر ہے
یہاں رہبری کا فریب ہے ،یہاں خوبیوں میں بھی عیب ہے
یہاں لمحہ لمحہ تضاد ہے کہ یہ نور و نار کا شہر ہے
یہ قدم قدم پہ مسابقت ،یہ عداوتیں ،یہ مُخاصمت
مجھے جانے کیوں یہ گُمان تھا ، کہ یہ صرف پیار کا شہر ہے
یہاں عزّتوں کے بھی نرخ ہیں، یہاں شہرتوں کے بھی دام ہیں
یہاں سب برائے فروخت ہے کہ یہ کاروبار کا شہر ہے
یہاں اُلفتوں کے سُبو بھی ہیں ،یہاں اردگرد عدو بھی ہیں
یہاں پھول بھی ہیں ببول بھی ، یہ گلاب و خار کا شہر ہے
یہاں فرصتوں کی ہیں قِلتّیں ،یہاں سب کو روز ہیں عجلتیں
یہاں گفتگو کو نہ طول دو کہ یہ اختصار کا شہر ہے
چلو اک دفینۂ خواب کو ،کوئی حال دل کا سنائیں اب
ہے سُپردِ خاک کوئی یہاں ،یہ کسی مزار کا شہر ہے

❀❀❀

# شہر کے راستوں پہ اب ہر سُو

انجم عثمان انتہائی دردمند شاعرہ۔ غزل نظم دونوں میں ان کی اپنی زبان۔ اپنا لہجہ۔ 'اطراف' کی درخواست پر انہوں نے اس نظم سے نوازا۔

تحریر: انجم عثمان

دن کے شب رنگ سے اندھیروں میں
ہر شبِ تار کے اُجالوں میں
کتنے تیشہ بدست تاک میں ہیں
خوف کے سائے ہیں چہار اطراف
زیست کے رنگ پھیکے پھیکے ہیں
جگمگاتی ہے موت کی دیوی
مسکراتی ہے موت کی دیوی
ہے فسردہ فضائے شہرِ طرب
آدمیت بھی آہیں بھرتی ہے
نوجوانی کراہیں بھرتی ہے
یہ مرے شہر کے جواں گبرو
جن کے چہروں پہ نوجوانی کی
اِک عجب تابناکی رقصاں ہے
جن کی آنکھوں میں خواب بستے ہیں
جھلملاتا ہے جن میں مستقبل
رہزنوں کے ہیں اب نشانے پر
ناگہاں ڈھانپ کر وہ چہروں کو
جانے کس سمت سے نکلتے ہیں
موت کے یہ کریہہ ہرکارے
کیسے اِک پَل میں کھینچ لیتے ہیں
تروتازہ توانا جسموں سے
زیست کی آخری نحیف رمق
شہرِ ماتم ! یہ ظلم اور کب تک ؟
کب تلک یوں ہی تیرے رکھوالے
گہری بے انت نیند میں ڈوبے
غفلتوں کی ردائیں اوڑھے ہوئے
بےتعلق رہیں گے تجھ سے یونہی؟
خون بہتا رہے گا سڑکوں پر
اور گلیوں میں یہ جواں لاشے
اِک سوال اَن کہا لبوں پہ لیئے
خاک ہو جائیں گے سدا کے لئے !

❀❀❀

# دُکھ

حسناتِ حسرت اپنے درد کا اظہار ان سطروں میں کر رہے ہیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے

تحریر: حسناتِ حسرت، میر پور خاص

میرے نیچے انسان رہتے یا درندے
یہ سوچ کر آسمان بھی روتا ہے
اتنی بے دردی سفاکیت لوٹ اور مار
یہ دیکھ کر شہر بھی روتا ہے
انسان کا اتنا دُکھ دیکھ کر
دُکھ بھی روتا ہے
بوڑھے ماں باپ کا وہ تو
ایک ہی بیٹا ہے
بیٹھی رہ گئیں بہنیں اس کی
اب کس نے بیاہنا ہے
زر بھی لیتے ہو اور جان بھی
ایسا کہاں ہوتا ہے
یہ انسان ہیں یا درندے
اب کیا فیصلہ ہونا ہے
بوڑھے ماں باپ اب کیا کریں
انہوں نے اب رونا ہے
ننھے معصوم بچے دیکھتے اس طرف
جہاں باپ نے اب سونا ہے
اے چارہ گرو کچھ تو دل نرم کرو
تم نے کب تک یہ منظر دیکھنا ہے
اے چارہ گرو اب اٹھ بھی چکو
تم نے آخر کب تک اور سونا ہے

❀❀❀

# اسٹریٹ کرائم

درد میں ڈوبی ہوئی یہ نظم۔ شاکرہ کاظمی سحر نے 'اطراف' کی مانگ پر ارسال کی ہے۔ بہت شکریہ۔ کراچی میں بہتے خون کا نوحہ۔

تحریر: شاکرہ کاظمی سحر

''وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے''
چلتی راہوں پہ نہلا دیئے خون میں
ذمہ داروں کو اُن کی خبر تک نہیں
چین کی بنسیاں ہی بجاتے رہے
گھر سے نکلے کوئی جب کسی کام کو
ایک دھڑکا لگا رہتا ہے جان کو
خیر سے گھر کو لوٹے بہ حفظ و اماں
لب پہ رہتی ہے ہر دم یہ ماں کے دُعا
چند پیسے موبائل تو ہیں قیمتی
اور جاں کی یہاں کوئی قیمت نہیں
وہ جو مارا گیا وہ اکیلا نہ تھا
اپنے کنبے کا واحد سہارا تھا وہ
بیوی بچے، بہن بھائی اور والدین
کتنے لوگوں کی آنکھوں کا تارا تھا وہ
ہو لُٹیرا، محافظ ، کوئی حکمراں
ہاتھ سب کے بھرے ہیں لہو سے یہاں
حشر میں اپنے منہ کو چھپائیں گے وہ
عدل سے پھر کہاں بچ کے جائیں گے وہ
خونِ ناحق پکارے گا جب حشر میں
کس طرح اپنا دامن بچائیں گے وہ

❀❀❀

# آغوش کیڈٹ کالج مری تعلیم رہائش سب مفت

تحریر: سید ارتقا احمد زیدی

اس ناچیز کو آغوش کالج مری کی سالانہ تقسیم انعامات کی تقریب میں چیف گیسٹ کے طور پر بلایا گیا۔

یہ کالج چھٹی سے بارہویں کلاس تک کیڈٹ کالج کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ یہاں ہر چیز مفت ہے۔ تعلیم۔ ہوسٹل میں رہائش۔ کھانا۔ کپڑا۔ کتابیں۔ علاج۔ سیر و تفریح۔

اس میں زیادہ تر بچے یتیم ہیں لیکن بعض والدین بھی اچھی تعلیم و تربیت کی وجہ سے اپنے بچوں کو بھی داخل کراتے ہیں۔ شرط بس ایک ہے کہ انٹری ٹیسٹ پاس کرنا لازمی ہے اور کوئی کوٹہ سسٹم نہیں ہے۔ میرٹ کے بغیر داخلہ نہیں ملتا۔

**یتامیٰ کے لیے قائم کالج میں والدین بھی اپنے بچوں کو داخل کروا رہے ہیں**

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ پورے پاکستان سے بچے یہاں زیر تعلیم ہیں۔ گلگت بلتستان۔ کے پی کے اور بلوچستان کے دور افتادہ علاقوں سے بھی بچے یہاں زیر تعلیم ہیں۔ بلوچستان سے پانچ بچے ہیں تین کا تعلق کوئٹہ سے ایک کچلاک اور ایک جیکب آباد سے ہے۔ میں نے ان کی حوصلہ افزائی کے لئے ان کے ساتھ گروپ بنوایا۔ ❁

## عمر کا سورج

سعیدہ افضل مدرسۃ اللبنات کراچی سے جیسز اینڈ میری جا پہنچی۔ یہ اسکول انہیں بہت اچھا لگ رہا ہے۔ فطرت سے لگائو اور بڑھ گیا ہے۔ پڑھئے۔ دیکھئے۔ آج بحرانوں میں گھری اس مملکت کا وہ دور کتنا مستحکم اور کتنا خوش آئند تھا یہ کہانی اب صرف سعیدہ افضل کی نہیں بلکہ متوسط طبقے کی ہر بچی کی داستان بن رہی ہے۔ پاکستان کیسے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہمارے اکابرین کتنی مشکلات کا سامنا کرتے رہے۔

# مجھے جیسز اینڈ میری کانونٹ اسکول لال کرتی میں داخل کروادیا گیا

تحریر: سعیدہ افضل

### میرا دوسرا اسکول

جدید مدرسۃ اللبنات میں ایک سال بھی مکمل نہ ہوا تھا کہ اسکول چھوڑنا پڑ گیا۔ ہوا یوں کہ ماموں رفیق جو ان دنوں آرمی میں کیپٹن تھے، ان کی پوسٹ کسی دور افتادہ جگہ تھی۔

بتاتی چلوں کہ میرے یہ ماموں برٹش آرمی میں اس وقت کیڈٹ تھے جب جنگ عظیم دوئم چل رہی تھی انکو فروری 1946 میں کمیشن ملا اور اگست 1947ء میں پاکستان بن گیا... نانی کہتی تھیں کہ میرے بیٹے کا دوبار جنم ہوا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھا۔ بعد میں امی نے بتایا تھا کہ بٹوارے کے وقت ایک ٹرین پر انکی ڈیوٹی لگی تھی وہ ریل کو لیے ساتھ آ رہے تھے جو مسافروں سے بھری ہوئی تھی یہ ریل مہاجرین کو لے کر بھارت سے لاہور آ رہی تھی راستے میں کچھ بلوائیوں نے حملہ کیا مگر اس حملے پر قابو پا لیا گیا۔ لیکن جب ٹرین صحیح سلامت لاہور پہنچ گئی تو گھر والوں کو اطلاع نہ ہو سکی کہ یہ بھی بخیریت پاکستان پہنچ گئے ہیں شاید وہ کسی اور ڈیوٹی پر بھیج دیئے گئے ہوں گے کشت و خون کی اس بھگدڑ والے عرصے میں ان کی کوئی خبر نہ آئی تو گھر والوں کو برے برے گمان ستانے لگے مشہور ہو گیا رفیق بلوائیوں کے حملے کے دوران لاپتہ ہو گئے ہیں۔ گھر میں انہیں شہید سمجھ لیا گیا بہت پریشانی رہی مگر کافی دنوں بعد انکی سلامتی کی خبر آ گئی تو سب کی جان میں جان آ گئی تھی میری نانی کہتی ہیں میرے فوجی نے دوبارہ جنم لیا ہے۔

ماموں رفیق کی پہلی پوسٹنگ کسی دور افتادہ جگہ ہوئی تھی، انہوں نے اپنی نئی نویلی دلہن کو اس دور افتادہ مقام پر ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا حالات ٹھیک نہ تھے۔ کٹھن ڈیوٹیاں بھی سرانجام دینا پڑتی تھیں تبھی انہوں نے اپنی بیگم یعنی میری منجھلی پھوپھی کو میرے والد کے گھر فریئر روڈ والے فلیٹ میں رہنے دیا۔

کچھ عرصے بعد جب ان کی پوسٹنگ راولپنڈی ہوگئی تو وہ اپنی

> **مجھے سفید براق لباس میں راہبائیں بہت اچھی لگتیں**

شریک حیات کو لینے کراچی آئے۔ تبھی انہوں نے امی سے کہا کہ ہم سعیدہ کو اپنے ساتھ پنڈی لے جاتے ہیں وہاں میں اسکو کانونٹ اسکول میں داخل کرا دوں گا۔ میری والدہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں ان سے دور رہوں جب ماموں نے مجھے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا تو والد صاحب نے مجھ کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔

وہ تو پہلے ہی مجھے کانونٹ سکول میں پڑھانا چاہتے تھے۔

میں تو بہت خوش تھی کیونکہ ان دنوں نانی ماموں رفیق کے ساتھ پنڈی میں رہ رہی تھیں۔ اور پھوپھی سردار جو میرے والد سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں وہ مجھ سے بھی محبت کرتی تھیں۔ راولپنڈی میں تو سبھی پیار کرنے والی ہستیاں تھیں بھلا مجھے ان کے ساتھ رہنے میں کیا مسئلہ تھا میں یہاں آ کر بہت خوش تھی۔

کراچی سے راولپنڈی آتے ہی ماموں نے مجھے ''جیسز اینڈ

> **کچی چھت والے کمرے میں خرگوش رکھے ہوئے تھے**

میری'' کانونٹ سکول۔ لال کرتی میں داخل کرا دیا۔ یہ سکول کافی بڑا اور یہاں کا تعلیمی نظام بہترین تھا اور یہ تعلیمی نظام انگریز کا رائج کردہ تھا۔ ماحول بہت اچھا۔ اعلیٰ نظم وضبط اور ٹیچرز ڈیوٹی فل.. بچے صاف ستھرے اجلے یونی فارم میں آتے۔ کلاس میں ٹیچر کی نظر ہر بچے پر ہوتی۔

اپنے شریکِ زندگی اعجاز قادر قریشی ایڈووکیٹ کے ساتھ

زیادہ تر ٹیچرز کرسچن تھیں۔ یہاں NUNS (راہبائیں) بھی تھیں۔ جو سر سے پاؤں تک سفید براق لباس میں ہوتیں۔ انہوں نے ہڈز وغیرہ سے اپنے سروں کو بھی ڈھانپا ہوتا تھا، کچھ کے لباس کالے بھی ہوتے تھے گوری چٹی اور خوبصورت یقیناً انگریز ہوتی تھیں۔ گلے میں کراس والا لاکٹ پہنتی تھیں اور اکثر کے ہاتھوں میں تسبیح بھی ہوتی۔ سکول میں شاید ایک جانب انکی عبادت گاہ تھی۔ وہ اکثر سکول میں آتی جاتی نظر آتی تھیں۔

مجھے بہت اچھی لگتیں ان کے سفید چہروں سے روشنی جھلکتی کہ وہ ہمیشہ میک اپ سے پاک ہوتے تھے نرم ملائم سی مہربان مسکراہٹ لبوں پر رہتی۔

میں ایک معصوم بچی تھی میرا مذہب کی تفریق سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ مجھے تو وہ حوروں جیسی پاکیزہ رکھتی تھیں۔ جی چاہتا وہ بار بار

نظر آئیں میں ان کو بار بار دیکھوں۔

مجھے راولپنڈی میں کسی کی یاد نہیں ستاتی تھی، سوائے چھوٹی بہن عزیزہ اور منی سی گڑیا بہنا فہمیدہ کے جسے پیار سے ہم بلو کہتے تھے۔

جہاں ماموں کی رہائش تھی یہ ایک وسیع و عریض کوٹھی کا اپر پورشن (بالائی حصہ) تھا، کوٹھی میں بریگیڈیئر عبدالرحمن صاحب رہتے تھے، جن کی خوبصورت بیگم سے میری نانی کی دوستی تھی اور قمر سے میری پھوپھی کی دوستی تھی، قمر کے شوہر انکل فیض بریگیڈیئر صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، مسز فیض کو لمبے بالوں والی بھابھی بھی بلاتے تھے یہ کشمیری لوگ تھے۔ انکی بیٹی رشیدہ سے میری دوستی تھی۔

کوٹھی کے ایک جانب بہت بڑا لان اور دوسری جانب کچن، ملازمین کا کمرہ اور اسٹور ساتھ ہی کونے میں ایک کچا کمرہ تھا جس کی چھت بھی کچی تھی۔ اس کمرے میں بیگم عبدالرحمٰن جن کو ہم پھوپھی آپا بلاتی تھیں۔ انہوں نے خرگوش رکھے ہوئے تھے۔ میں روزانہ خرگوش دیکھنے کو اس کمرے میں جھانکتی۔ اور سکول سے آتی کھانا کھاتی۔ ماموں اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے جاتے تو میں سیڑھیاں اُتر کر رات میں چلی جاتی۔ ہری بھری کیاریاں رنگ برنگ پھولوں سے بھری ہوئی۔ میں اکیلی ہی لان میں کھیلتی۔ اس پر گھونگے گھومتے اور پتیوں پر سرخ رنگ کے بٹس رینگتے۔ میں ان میں سے ایک کو ہتھیلی پر رکھ لیتی اور ان کے پروں پر بنے کالے مارکس کو گنتی۔ درختوں پر رنگ برنگ چڑیاں چہچہا رہی ہوتیں اور ہاتھ میں اُڑتی تتلیاں میرا دل لبھاتیں۔ کتنی ہی دیر میں لان میں پھرتی رہتی اور جب دل بھر جاتا۔ اوپر چلی جاتی۔ مسز عبدالرحمٰن کے کے کمرے کی کھڑکی اسی باغ کی طرف کھلتی تھی شاید وہ مجھے کھڑکی سے دیکھتی تھی، میری عادت تھی کہ کبھی پھول نہیں توڑتی تھی کسی شے کو خراب نہیں کرتی تھی، شاید اسی سبب انہوں نے مجھے اپنے اس گلابوں بھرے گارڈن میں کھیلنے سے منع نہیں کیا۔ ان کو باغ بانی کا بہت شوق تھا۔ قسم قسم کے گلابوں کے پودے مالی سے لگوا رکھے تھے۔ سرخ اور گلابی گلابوں کے علاوہ کئی اور رنگوں کے گلاب بھی یہاں میں نے دیکھے، سفید گلاب، نیلے پیلے اودے اور کالے گلاب بھی۔ اور بھی قسم قسم کے پھول وہ لگواتی تھیں۔ مجھ کو باغ میں وقت گزارنے میں لطف آتا۔ کسی قسم کی اُداسی تنگ نہ کرتی میں گھونگوں پر سرخ رنگ کے مخملیں ننھے منے جانداروں سے جن کو مقامی زبان میں ساونیاں کہتے تھے اور کلیوں سے بھی باتیں کرتی دراصل میں خود سے باتیں کر رہی ہوتی تبھی تو مجھے اُداسی تنگ نہیں کرتی تھی۔ بریگیڈیئر صاحب کی دو بیٹیاں تھیں۔ سعیدہ اور زاہدہ۔ دونوں مجھ سے بڑی تھیں مری کانونٹ میں پڑھتی تھیں صرف چھٹیوں میں گھر آتی تھیں۔ سعیدہ مجھ سے پیار سے بات کرتی تھیں مگر زاہدہ الگ تھلگ رہتی تھی۔ ان کا بھائی سعید اختر چھوٹا سا تھا وہ اپنی دادی کے پاس گاؤں میں ہوتا تھا کبھی کبھی گھر آتا مگر جب گاؤں سے رشیدہ آتی مجھ سے خوب باتیں کرتی اور کھیلتی بھی تھی۔

یہ بریگیڈیئر صاحب بعد میں میجر جنرل عبدالرحمن خان آزاد کشمیر کے دو بار صدر بنے اور ان کے بیٹے سعید اختر کے ساتھ میری

**ہمارے پڑوسی بریگیڈیئر بعد میں آزاد کشمیر کے صدر بنے**

بہن شہناز کی شادی ہو گئی۔ جن دنوں میں راولپنڈی میں تھی میری یہ چوتھے نمبر والی ہیں شہناز ابھی پیدا ابھی نہ ہوئی تھی۔ کیا خبر تھی مسز عبدالرحمن جو مجھ سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی ہیں میری بہن کی ساس بنیں گی۔

راولپنڈی مجھے کراچی سے زیادہ خوبصورت لگتا تھا یہاں ہر طرف خوبصورتی بکھری تھی حتیٰ کہ گھروں کی چھتوں پر بھی سبزہ اگ آتا

بطور صدارت۔ محترمہ ثریا شہاب کے افسانوں کے مجموعہ کی تقریب رونمائی کے موقع پر آرٹس کونسل ڈیرہ غازی خان میں خطاب

تھا، اکثر بارش سے موسم بھیگا بھیگا رہتا اور فضا میں پھولوں کی مہک رچی بسی ہوتی تھی۔

ماموں کا ایک کمرہ دوسرے کمروں سے الگ تھلگ تھا وہ اس کمرے کو سٹڈی روم کہتے۔ اس میں دیوار میں شیشے کی الماریاں نصب تھیں جن میں کتابیں رکھی ہوتی تھیں۔ ایک طرف رائٹنگ

**درخت پر چڑھتی اترتی پھل کترتی گلہریاں**

ٹیبل اور کرسیاں تھیں۔

شام کو وہ کچھ دیر اس کمرے میں بیٹھتے، اس دوران وہ میری کاپیاں چیک کرتے ہوم ورک کراتے۔ خود پڑھ رہے ہوتے تو مجھے بھی پڑھنے بٹھا دیتے۔ جوں ہی وہ اُٹھ کر باہر جاتے میں کتاب ٹھپ کر دیتی اور کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوتی جس طرف کو یہ کھلتی تھی وہاں کوٹھیاں نہیں تھیں کسی کا ایک درمیانے درجے کا مکان بنا ہوا تھا۔ جس کا عقبی صحن اس کھڑکی سے نظر آتا تھا۔

صحن میں ایک بڑی سی ٹرکی Terky مرغی گھومتی رہتی، جس کی چونچ کے آگے لمبی سی گلابی آنت سی لٹکتی تھی ایسے ہی اسکے چوزوں کی چونچوں کی شیپ تھی. یہ آنت ان کے منہ پر لٹکی عجب و غریب دکھتی۔

مجھے ان چوزوں کو ماں کے پیچھے آگے بھاگنا دوڑنا اچھا لگتا۔ اس گھر میں سفید فر والے خرگوش بھی تھے، اور درخت پر چڑھتی اُترتی گلہریاں جو درخت کے پھل کو تنے کے پاس بیٹھ کر مزے لے لے کر کترتی رہتی تھیں۔

ایک روز ماموں میرے لئے کانچ کا ایک بڑا سا چوکور ڈبہ لائے جس میں سنہرے رنگ کی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں اور کہنے لگے تمہارے لیے لایا ہوں، تم روز اس کا پانی بدلنا اور ان کو خوراک ڈالنا۔

اب مجھے ایک نیا مشغلہ مل گیا، پانی بدلنا اور مچھلیوں کو خوراک ڈالنا۔

ماموں چاہتے تھے میرا دل بہلا رہے اور میں خوش رہوں۔ مگر مجھے اس کام سے زیادہ ایک اور کام پسند تھا۔

خانساماں کے کمرے کے ساتھ جس کچے کمرے میں آپا نے خرگوش رکھے ہوئے تھے، اسکی چھت چونکہ کچی تھی اس پر جا کر میں کھیتی باڑی کرتی تھی اور اس بات کی کسی کو بھی خبر نہیں تھی۔ چھری سے چھت کی ایک تہہ کھود کر بھر بھری مٹی پر ٹماٹر کو مسل کر ڈالا دیا تو وہاں کچھ دنوں بعد پتے نکل آئے، میرا شوق سوا ہوا، سرخ مرچ اور سوکھا دھنیا بھی ڈال کر مٹی پر پانی چھڑک دیا۔

وہاں بھی پودے نکل آئے۔ اور اپنی کھیتی باڑی کو چیک کرتی پانی ڈالتی۔ کچھ ہفتوں میں میری یہ چھوٹی سی فصل تیار ہوگئی ٹماٹر کے پودے میں ننھے ننھے ٹماٹر لگے اور ہری مرچیں، دھنیا سبھی اُگ آئے۔ اپنی اس فصل کو دیکھ کر کیسی خوشی ہوئی کیا بتاؤں، ایک روز ماموں نے گھر کی اس چھوٹی سی کھیتی کو دیکھ لیا۔ انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ دراصل وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔

مجھے کشمش والے پراٹھے اور آلو قیمہ، شامی کباب پسند تھے وہ خانساماں سے کہہ کر خاص طور پر بنواتے تھے۔ پھلوں میں مجھے کیلا پسند تھا۔ وہ میرے لئے کیلے لانا نہ بھولتے۔ مگر کھانے کے بعد دوپہر کو وہ مجھکو کارڈ لیور آئل یعنی مچھلی کے تیل کا ایک چمچ پلاتے تو مجھکو یہ بالکل اچھا نہ لگتا۔ میں نہ، نہ کرتی رہ جاتی اور وہ چمچ بھر کر میرے منہ سے لگا دیتے۔ جلدی منہ کھولو۔ ان کے دوسرے ہاتھ میں آدھا چھلا ہوا کیلا ہوتا۔

بس جلدی سے فٹافٹ پی کر کیلا کھالو۔ میں ناک پکڑ کر منہ کھول دیتی اور وہ چمچ میرے منہ میں ڈال دیتے۔

ماموں نے کبھی مجھے کسی ملازم یا بٹ مین، اردلی وغیرہ کے ساتھ سکول نہیں بھیجا۔ ہمیشہ خود دفتر جاتے ہوئے مجھے سکول چھوڑنے جاتے اور دفتر سے واپسی پر ساتھ لیتے گھر آجاتے۔ ان کا آفس لال کرتی کی طرف تھا جدھر میرا اسکول تھا۔

اسکول میں میرا دل لگ گیا تھا۔ یہاں بچوں پر کوئی سختی یا ڈانٹ ڈپٹ نہیں تھی مگر ڈسپلن کی پابندی کرائی جاتی تھی۔ میں شروع سے، سب بچوں سے الگ تھلگ تھی میرے اندر ایک ڈسپلن تھا۔ کلاس میں پُرسکون اور خاموش بیٹھی رہتی۔

ٹیچر مجھ کو پسند کرتیں۔ کسی بچے سے نہ اُلجھتی، اور نہ لڑتی جھگڑتی، اگر کوئی بچہ، میری پنسل، کاپی پنسل کہتا تو میں اُسکو دے دیتی۔ میں اردو میں اچھی تھی، ریڈنگ، ڈکٹیشن سب ٹھیک کرتی، ٹیچر میری تعریف کرتیں، انہوں نے مجھے کلاس میں مانیٹر بنا دیا۔ کبھی کبھی۔ وہ کہتیں۔ تم بچوں کو املا کراؤ۔ خود کرسی پر بیٹھ کر دیکھتی رہتیں۔ یوں تو مجھے سبھی پیریڈ پسند تھے خاص طور پر ڈرائنگ اور آرٹ پسند تھا۔ البتہ ایک پیریڈ سے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی۔ جب وہ سب بچوں کو قطار میں ایک ہال کمرے کی طرف لے جاتے اور قطاروں میں ہی کھڑا کرتے تو غالباً یہ دعائیہ وقفہ ہوتا تھا۔

## 'ہوا میں اڑتا جائے میرا لال دوپٹہ ململ کا'' پر ڈانس کی تیاری

اپنی آیات کو کسی اور زبان میں پڑھتے تھے یا انگریزی میں، میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ان کی قرات کا کچھ اور طرح کا انداز تھا۔ ہلکا ہلکا میوزک بجتا، میں سمجھ نہ پاتی کیا ہو رہا ہے، کیا پڑھ رہے ہیں۔ جیسے وہ گا کر پڑھ رہے ہوں۔ میں اور بچوں کے منہ کی طرف دیکھتی پھر ان کی طرح ہونٹوں کو ہلانے کی کوشش کرتی۔ سوائے۔ اُں۔ آں۔ ای۔ او کے کوئی آواز میرے منہ سے نہ نکلتی۔ یہ وقت مجھ پر بہت دشوار گزرتا۔ سچ ہے بغیر سمجھے نقل کے لئے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔

بزمِ ادب کراچی یونیورسٹی کے زیر انتظام ایک مشاعرہ..... معروف شعراء: قمر جلالوی، مخمور گورکھپوری، جمیل الدین عالی، ماہر القادری اور سعیدہ افضل بطور صدر بزم ادب کراچی یونیورسٹی۔ (1964)

انہی دنوں فنکشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ٹیچر نے فنکشن میں حصہ لینے کو مجھے چن لیا۔ ایک بھارتی فلم کے گانے پر جس کے بول تھے۔

''ہوا میں اُڑتا جائے میرا لال دوپٹہ ململ کا''

مجھے ڈانس کی تیاری کرائی گئی۔

جو ٹیچر تیاری کرا رہی تھیں، وہ موٹے نقوش والی۔ کالی اور موٹی تھیں، لال دوپٹے والے گانے کا ریکارڈ گراموفون پر لگا کر وہ مجھے ڈانس کے Steps سکھاتیں۔ گانے کے بول تھے۔ ''جھر جھر ہوا چلے اور ٹھنڈا ٹھنڈا پانی۔ ٹھمک ٹھمک چال ہوئی مستانی۔''

اس پر جب وہ ٹھمک ٹھمک چل کر دکھاتیں تو ان کا موٹا پیٹ عجب انداز سے ہلتا اور میں اپنی ہنسی کو دل کے اندر ہی دبا لیتی۔

کمر تو ان کے پاس تھی ہی نہیں ہاں مگر شفقت بہت تھی۔ فنکشن میں جو لباس ڈانس کرتے وقت مجھے پہننا تھا وہ انہوں نے خود ڈیزائن کر کے دیا۔ یہ پرچہ میں نے ماموں کو دے دیا۔ انہوں نے سفید ساٹن کا سلکی کپڑا خرید کر درزی کو دیا اور ڈیزائن والا پرچہ بھی۔ درزی نے بہت خوبصورت فراک اور غرارہ سی کر دیا جس پر نانی نے سفید ستارے اس طرح ٹانکے کہ سارا فراک ننھے ننھے ستاروں سے بھر دیا امی اور نانی دستکاری اور سلائی کڑھائی میں ماہر تھیں، سینے پرونے کے علاوہ میری نانی کا دوسرا مشغلہ اخبار پڑھنا اور ریڈیو پر خبریں سننا تھا۔

میں نے ستاروں بھرا ڈریس جب ٹیچر کو دیا تو وہ عش عش کر اٹھیں اور انکی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ فنکشن سہ پہر کے بعد تھا، بڑے سے ہال میں شام کو فنکشن شروع ہوا، بچوں کے ساتھ والدین بھی آئے ہوئے تھے یہ ہال کلاس رومز سے کچھ دور گیٹ کے قریب تھا۔ اور اسکے عقب میں وہ کمرہ تھا جہاں ان بچوں کو ڈریس اپ کیا جا رہا تھا، جنہوں نے فنکشن میں حصہ لینا تھا، میں بھی، اُدھر ہی تھی۔ ہماری ٹیچرز ہم کو تیار کر رہی تھیں بال وغیرہ بنا رہی تھیں، جب میری باری آئی تو کمرے سے سٹیج پر آ گئی، ٹیچر نے سمجھایا تھا۔ سٹیج پر گھبرانا نہیں بلکہ ایسا سوچنا جیسے وہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ میں نے ہال پر نظر ڈالی وہ تو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، مجھے ٹیچر کی بات یاد آئی تھی مجھکو ہال میں موجود بہت سے لوگوں کی ذرا بھر پروا نہ ہوئی۔ مجھے لگا جیسے وہاں کوئی ہے ہی نہیں تھی۔ تبھی پس پردہ گانا چلنے لگا۔

''ہوا میں اُڑتا جائے میرا لال دوپٹہ ململ کا،
ہو جی۔ ہو جی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلے اور جھر جھر بہتا پانی
چھن چھن چھن چھن گھنگھرو باجیں چال ہوئی مستانی''

بس اس طرح کا کچھ گانا تھا۔ میں ٹیچر کے سکھائے ہوئے steps پر لال دوپٹے کے دونوں کناروں کو پکڑ کر ادھر اُدھر لہرا رہی تھی۔ جانے میں کیا کر رہی تھی کہ لوگ ہنس رہے تھے اور ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔

گانا ختم ہوا تو حاضرین نے once more_once more کا شور مچا دیا، گانا پردے کے پیچھے پھر لگا دیا گیا اور میں نے دوپٹے کو اِدھر اُدھر لہرایا۔ مغرب تک فنکشن ختم ہوگیا، ماموں ممانی یعنی میری پھوپھی بھی ہال میں موجود تھے وہ مجھے لینے آئے تھے۔

اگلے دن۔ نجانے کیوں، میں سکول نہ گئی، حالانکہ چھٹی نہیں کرتی تھی مگر میں سمجھی کہ آج شاید چھٹی ہے۔ اگلے روز سکول گئی تو میری کلاس ٹیچر نے کہا کہ کل تم کیوں نہیں آئیں۔ باقی بچوں کی

چھٹی تھی مگر تم کو آنا تھا۔ کل جن بچوں نے فنکشن میں حصہ لیا تھا، انکی پارٹی تھی، سب ہیڈز آئے ہوئے تھے۔ فوٹو گرافی ہوئی، میں نے تم کو کارڈ دیا تھا، انہوں نے یاد کرایا۔

مجھے یاد آیا کہ انہوں نے کارڈ دیا تھا، میں نے بیگ میں ڈالا تھا۔ اور ماموں کو دینا بھول گئی تھی، مجھے بہت افسوس ہوا۔ خاص طور پر ان بچوں کے ساتھ گروپ فوٹو نہ بنوا سکنے کا جنہوں نے فنکشن میں حصہ لیا تھا۔

ابھی دوسری کا امتحان دینا تھا کہ بابا کا خط آگیا۔

انہوں نے ماموں کو خط لکھا۔

سعیدہ کو کراچی بھیج دو ہمارا لندن جانے کا پروگرام بن گیا ہے ماموں کو چھٹی نہیں ملی۔ انہوں نے مجھے اکیلے ہی ہوائی جہاز پر کراچی کے لئے سوار کرادیا۔

ہوائی جہاز میں، جس سیٹ پر مجھے بٹھایا گیا، اسکے برابر والی سیٹ خالی رہی، وہاں کوئی دوسرا مسافر نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد، ایئر ہوسٹس آکر پوچھتی، تم ٹھیک ہو، کچھ چاہئے۔ سردی تو نہیں لگ رہی،

## اسکول میں دل لگ رہا تھا
## مجھے کراچی واپس آنا پڑ گیا

ایک بار میں نے کہا۔ سردی لگ رہی ہے۔ تبھی اس نے گرم چادر لاکر مجھے اوڑھادی۔ تمام سفر میں اس ایئر ہوسٹس نے میرا خیال رکھا۔

دوران سفر وہ مجھے وہاں بھی لے گئی تھی جہاں پائلٹ بیٹھے جہاز اُڑا رہے تھے، وہ تو ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے۔ میری طرف متوجہ ہوگئے۔ مجھ سے بات کی پھر میرے کانوں پر ہیڈ فون لگادیا۔ اتفاق سے وہی گانا لگا ہوا لگا۔

ہوا میں اُڑتا جائے میرا لال دوپٹہ ململ کا۔

میری آنکھیں بھیگ گئیں، اُداسی دل پر چھا گئی، میں پنڈی چھوڑ کر کراچی جارہی تھی، اپنا اسکول چھوڑ کر۔ میری قسمت میں یہی تھا۔ میں نے کئی کبھی بھی کہیں ٹک کر نہیں پڑھا۔ سفروں میں بچپن گزرا۔ اسکول بھی بدلتے رہتے تھے۔

کراچی ایئر پورٹ پر بابا لینے آئے ہوئے تھے۔ ایئر ہوسٹس کا ہاتھ پکڑ کر جہاز کی سیڑھیاں اتری بابا تو بالکل سامنے ہی کھڑے تھے۔ ایئر ہوسٹس نے میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

کراچی آئی تو میرا لال دوپٹہ بھی ساتھ تھا، جو میری یادوں میں بس گیا تھا، ان دنوں یہ گانا بہت مشہور تھا۔ ان دنوں جو فلمیں مشہور ہوتیں۔ بابا ان کے گانوں کا پورا سیٹ لے آتے، ہمارے گھر میں وہ گراما فون تھا جس پر کتے کی تصویر بنی ہوئی تھی اور ''ہر ماسٹر وائس'' لکھا ہوتا تھا۔

چھوٹی چھوٹی سوئیوں سے بھرا ڈبہ ملتا تھا۔ اس میں سے ایک پن نکال کر گراما فون کے ہیڈ میں لگا دیتے تھے اور اسکو گھومتے ہوئے ریکارڈ کے کنارے پر رکھتے، تو گانا بجنے لگتا یہ کالے رنگ کے گول

بغداد ہوٹل کے کمرے میں والدہ اور چھوٹی بہن کے ساتھ

حضرت عباس کے مزار پر حاضری دی۔ سعیدہ افضل

تھالی نما ریکارڈ ہوتے تھے ان پر گانے کے بول لکھے ہوتے تھے، اس گراما فون کے ایک سائیڈ پر جو پیتل کا چمکتا ہوا پھول نما بھونپو لگا ہوتا، آواز اسی میں سے آتی تھی۔

جب اسکول کی یاد آتی میں اپنا ستاروں بھرا ڈریس پہن لیتی۔ اور لال دوپٹے والا گانا لگا کر سنتی، کبھی کبھی کمرہ بند کر کے آئینے کے سامنے لال دوپٹے کو اسی طرح لہراتی، اکیلے میں ہی اسکول کے ان دنوں کو یاد کرتی جو میری زندگی کے سنہرے دن تھے اور یادوں میں رچ بس گئے تھے۔ کتنے پُر سکون تھے وہ دن جب میں کسی آزاد پرندے کی طرح وقت کے گزرتے لمحوں میں اڑتی پھرتی تھی۔ کائنات کی ہر شے سے بیگانہ زندگی کا سفر جاری تھا۔ اور وقت کے گزرنے کا احساس میرے پاس نہیں تھا۔ زمانے کی فکر سے بالا۔ حال فلم کی اسکرین پر چلتے مناظر کی مانند پلکوں کے سائے تلے دوڑ رہا تھا۔ ماموں ویک اینڈ پر کبھی مَری لے جاتے تو وہاں سے لوٹ آنے کو دل نہ چاہتا تھا اور آسمان سے باتیں کرتے درخت اور بادل ہمارے قدموں کے نیچے ہوتے تھے۔ تب میں دعا کرتی یا اللہ ایک بار مری آؤں اور بہت دنوں تک یہاں رہ جاؤں۔ گرچہ میں چھوٹی سی تھی۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب ماموں آزاد کشمیر لے گئے تو وادیٔ نیلم اور اونچائی سے گرتے پانیوں نے مجھے مسحور کردیا تھا وہ ہم کو پکنک منانے لے جاتے تھے۔ کوہ مری تو پیچھے رہ گیا اب تو میں کراچی میں ہوں۔ (جاری ہے)

## زندگی سے بڑے لوگ

”ڈاکٹر سید جعفر احمد اس وقت پاکستان میں معروضی اظہار رائے والے چند اسکالرز میں سے ہیں۔ 'اطراف' کے ابتدا سے ہی قلمی سرپرست ہیں۔ ان سے 'اطراف' کے موضوعات کے حوالے سے ہمیشہ مشاورت رہتی ہے۔ ہماری درخواست پر وہ دنیا بھر میں انسانی وقار کی سربلندی کے لیے مصروف جید شخصیتوں سے خصوصی گفتگو کا سلسلہ 'زندگی سے بڑے لوگ' کے زیر عنوان کریں گے۔ سینئر صحافی۔ بے باک قلم کار۔ انسانی حقوق کے حصول کے لیے سرگرم جناب حسین نقی سے اس اہم سلسلے کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ حسین نقی صاحب نے اس مملکت خداداد میں جو بھی ہنگامے۔ سانحے۔ دیکھے ہیں۔ جن ابتلائوں کا سامنا کیا ہے۔ پاکستان کی نئی نسل ان سے آگاہ ہو کر ملک کی حقیقی تاریخ سے باخبر ہو سکے۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔“

# حسین نقی کے نزدیک ہم آہنگی ہی زندگی ہے

**پہلی قسط**

**پاکستان کے سینئر ترین صحافی۔ شہری آزادیوں کی جدوجہد کے سرکردہ رہنما حسین نقی سے ڈاکٹر سید جعفر احمد کی خصوصی گفتگو**

### تعارف

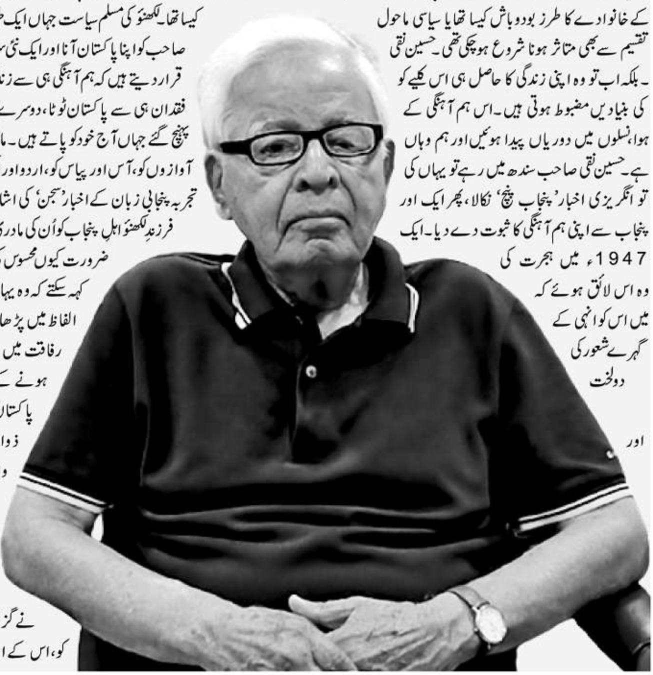

حسین نقی صاحب اِس وقت پاکستان کے سینیئر ترین صحافیوں میں شامل ہیں۔ وہ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے وقت اُن کی عمر گیارہ سال تھی۔ کم عمری کے باوجود اُس زمانے کی اُن کی یادیں بہت مضبوطی کے ساتھ ان کے ذہن پر نقش ہوئیں۔ آج بھی وہ اُن کا ذکر کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ جیسے کل کی بات کر رہے ہوں۔ وہ بہت تفصیل کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ لکھنؤ میں ان کے خانوادے کا طرز بودوباش کیسا تھا یا سیاسی ماحول کیسا تھا۔ لکھنؤ کی مسلم سیاست جہاں ایک طرف کانگریس کے خلاف صف آرا تھی تو دوسری طرف یہ صف شیعہ سنّی تقسیم سے بھی متاثر ہونا شروع ہو چکی تھی۔ حسین نقی صاحب کو اپنا پاکستان آنا اور ایک نئی سرزمین میں اجنبیت سے اپنائیت تک کا سفر طے کرنا بھی بخوبی یاد ہے۔ بلکہ اب تو وہ اپنی زندگی کا حاصل ہی اس کلیے کو قرار دیتے ہیں کہ ہم آہنگی ہی سے زندگی مرتب ہوتی اور چلا پاتی ہے، معاشرے پُرامن بنتے ہیں اور تمدن کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اس ہم آہنگی کے فقدان ہی سے پاکستان ٹوٹا، دوسرے صوبوں میں شورشیں اٹھیں، نسلی منافرت پیدا ہوئی، مسلکوں کا تصادم ہوا، نسلوں میں دوریاں پیدا ہوئیں اور ہم وہاں پہنچ گئے جہاں آج خود کو پاتے ہیں۔ ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ ہم آہنگی ہی زندگی ہے۔ حسین نقی صاحب سندھ میں رہے تو یہاں کی آوازوں کو، آس اور پیاس کو، اردو اور انگریزی اخباروں کے کالموں تک پہنچاتے رہے۔ پنجاب گئے تو پہلے تو انگریزی اخبار 'پنجاب پنچ' نکالا، پھر ایک اور تجربہ پنجابی زبان کے اخبار 'سجن' کی اشاعت کی صورت میں کیا۔ 'سجن' بوجوہ چلا نہیں مگر حسین نقی صاحب نے پنجاب سے اپنی ہم آہنگی کا ثبوت دے دیا۔ ایک فرزندِ لکھنؤ اہلِ پنجاب کو اُن کی مادری زبان میں اخبار پڑھوا رہا تھا۔

1947ء میں ہجرت کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی اور نئے ملک میں آنے کے بعد کس قسم کی آزمائشوں سے گزر کر وہ اس لائق ہوئے کہ کہہ سکتے کہ وہ یہاں آباد ہو چکے ہیں، یہ حکایت وہ خود بیان کرتے ہیں۔ آئندہ صفحوں میں اس کو انہی کے الفاظ میں پڑھا جا سکتا ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک کا ان کا سفرِ حیات گہرے شعور کی رفاقت میں طے ہوا ہے۔ انہوں نے پاکستان کے بننے کو بھی دیکھا اور اس کے دولخت ہونے کے دلخراش واقعات کو بھی انتہائی قریب سے دیکھا اور سمجھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے وقت کے کم از کم دو بڑے کرداروں، شیخ مجیب الرحمن اور ذوالفقار علی بھٹو سے اُن کی ملاقاتیں رہیں۔ وہ اُس دور کے بہت سے واقعات کے عینی شاہد ہیں۔

حسین نقی صاحب نے صحافت کو اپنے پیشے کے طور پر اختیار کیا۔ اس پیشے نے جلد ہی ان کے شوق کی حیثیت بھی اختیار کر لی اور یوں اُن کی کامیابیاں اُن کے لیے وجۂ افتخار بنتی رہیں اور آزمائشیں اسی شوق کی نسبت سے اُن کے لیے قابل برداشت قرار پائیں۔ انہوں نے گزشتہ سات ساڑھے سات عشروں میں پاکستان کی صحافت کے ارتقا کو، اس کے اتار چڑھاؤ کو، اس کے امید افزا اور مثبت رجحانات کو اور اس کے

آزمائش سے پُر اور تکلیف دہ ادوار کو بہت قریب سے دیکھا ہے، دیکھا ہی نہیں برتا بھی ہے۔ بات صحافت کی تاریخ کی ہو تو وہ اس تاریخ کے عینی شاہد ہی نہیں اس کا ایک بڑا کردار بھی ہیں۔ انہوں نے صحافت کے روایتی رجحانات اور پیش پا افتادہ رویوں سے انحراف کے راستے نکالے، نئی طرح کے اخبارات کی داغ بیل ڈالی، آزادیٔ صحافت کے لیے آواز اٹھانے پر یا اپنے حقِ اظہار کو بروئے کار لاتے ہوئے انہیں آمرانہ حکومتوں کے عتاب کا شکار بھی ہونا پڑا۔ فوجی آمریتوں ہی میں نہیں، سویلین ادوار میں بھی قید و بند کی آزمائشیں ان کا استقبال کرتی رہیں۔

صحافت کی وادی میں برسوں آبلہ پائی کے بعد انہوں نے آزمائشوں کا ایک اور میدان بھی اپنے لیے تلاش کرلیا۔ انہوں نے انسانی حقوق کے تصور کے فروغ اور معاشرے میں اُن پر عملدرآمد کی اُس جدوجہد سے اپنا رشتہ جوڑلیا جو اس ملک میں یہاں کے بعض باضمیر اور روشن خیال افراد برسہا برس سے جاری رکھے ہوئے تھے۔ 1980ء کے عشرے میں ایک باوقار ادارہ 'ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان' کے نام سے وجود میں آیا۔ ہماری تاریخ کی کئی روشن خیال اور جرأت مند شخصیات اس کے بانیوں میں شامل تھیں۔ جسٹس دراب پٹیل، آئی اے رحمن، عاصمہ جہانگیر، عزیز صدیقی، یہ اور ایسی ہی دیگر شخصیات تھیں جنہوں نے اس ادارے کا خواب دیکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ ملک میں انسانی حقوق کی صورتِ حال کا جائزہ لینے والا، حقوق تلفی کے اعداد و شمار اکٹھا کرنے والا اور شہری حقوق کے شعور کو فروغ دینے میں ہمہ تن مصروف رہنے والا ادارہ بن کر سامنے آیا۔ حسین نقی صاحب بھی اس قافلے کا حصہ بن گئے۔ صحافت نے ان کو ریاست اور معاشرے کے عمیق مسائل اور تضادات کو دیکھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ ہیومن رائٹس کمیشن سے وابستگی نے ان کو انہی سب مسائل کو دیکھنے کی ایک اور نظر فراہم کی۔ بنیادی سوچ اور فلسفہ جو اس کاوش کی اساس بنا وہ یہ تھا کہ انسان اپنے منصب پر فائز ہی اُس وقت ہوتا ہے جب اُس کو وہ ماحول میسر ہوتا ہے جس میں اس کی تخلیقی صلاحیتیں جلا پاتی ہیں، وہ اپنے انسانی حقوق سے مستفید ہوتا ہے اور دوسرے انسانوں کے حقوق کا احترام کرتا ہے۔ کیا پاکستان میں وہ ماحول میسر تھا؟ کیا ہماری ریاست اور ہمارا معاشرہ انسانی حقوق کے تحفظ اور ان پر عملدرآمد کا سامان کر رہا تھا؟ کئی سال وہ اور ان کا ادارہ اسی کا تجزیہ کرتے رہے۔ کمیشن کی ہر سال چھپنے والی رپورٹیں، مختلف بحران زدہ علاقوں سے متعلق فیکٹ فائنڈنگ دورے اور حاصل شدہ حقائق کے تجزیوں پر مشتمل دستاویزات، یہ سب ایسا مواد تھا جس کے آئینے میں پاکستان کا حقیقی چہرہ سب کے سامنے آرہا تھا۔ حسین نقی صاحب ایک بڑے کام کا حصہ بنے۔ وہ آج بھی اسی کام میں منہمک ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی صحافت بھی جاری ہے۔ وہ اخبارات میں مستقل تجزیے تحریر کررہے ہیں۔

حسین نقی صاحب ایک بڑی شاداب شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن سے ملو تو ماضی و حال کے بے شمار واقعات اور اُن کے ذاتی مشاہدات کو دلچسپ پیرائے میں سننے کا موقع ملتا ہے۔ زندگی کے کٹھن تجربات نے اُن میں خشک مزاجی اور ترش روئی پیدا نہیں کی۔ وہ اپنے تلخ تجربات کو بھی لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ مخالفین کے ذکر میں بھی اُن کے لہجے میں بدخوئی راہ نہیں پاتی۔ ہاں، آمریتوں کا ذکر کرتے وقت وہ اپنی شدید نفرت کو چھپا بھی نہیں پاتے۔ مشرقی پاکستان میں بنگالیوں کے ساتھ جن زیادتیوں کا مظاہرہ کیا گیا اُن کا ذکر وہ سخت نفرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہیومن رائٹس کمیشن کے پلیٹ فارم سے انہوں نے ملک میں انسان کی بے توقیری کے جو واقعات دیکھے، خاص طور سے بلوچستان میں جس قسم کے واقعات ان کی نظر میں آئے ان کا ذکر کرتے وقت ان کی آواز گلوگیر بھی ہوتی رہی، انہیں کچھ وقت کے لیے خاموشی اختیار کرنی پڑتی، وہ پانی پیتے اور پھر بات جاری رکھنے کی کوشش کرتے۔

حسین نقی صاحب نے بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ یہ زندگی اپنے گرد و پیش اور اپنے ملک اور معاشرے سے مستقل مکالمہ کرتی رہی ہے، مکمل رابطے میں رہی ہے۔ برسہا برس سے 'ہم آہنگی' اُن کا فلسفۂ حیات ہے۔ نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو، زندگی گزارنے کا یہی قرینہ انہوں نے سیکھا ہے۔ اور پھر کچھ یوں ہے کہ آزادیٔ صحافت کی جدوجہد ہو، اسیری کے ایام ہوں، مالکانِ اخبارات سے کارکن صحافیوں کے مطالبات کے لیے لڑنا ہو، اور بنیادی انسانی حقوق کے لیے حکومتوں کے ساتھ نبرد آزمائی ہو، یہ سب کچھ کرتے کرتے اور قلم اور عمل دونوں طریقوں سے راستے نکالتے نکالتے اُن کی شخصیت عام زندگیوں سے کسی قدر مختلف بلکہ کچھ بڑھ کر ایک شکل اختیار کرگئی ہے۔ کچھ روز قبل حسین نقی صاحب کراچی تشریف لائے تو اُن سے چھ سات نشستوں میں طویل گفتگو کی سعادت حاصل ہوئی۔ 'زندگی سے بڑی' (Larger than life) شخصیت کے حامل حسین نقی صاحب سے کی گئی یہ طویل گفتگو یہاں 'اطراف' کے قارئین کے لیے پیش کی جارہی ہے:

سوال: حسین نقی صاحب، آپ کی صحافت کے شعبے میں ایک طویل جدوجہد ہے، آپ حقوق انسانی کے بھی فعال علمبردار رہے ہیں۔ ایک بڑا عرصہ آپ نے سیاستدانوں کو بھی دیکھا، سیاست اور صحافت کو بھی دیکھا، اردو اور انگریزی دونوں صحافتیں کیں۔ میں آپ سے آپ کی گذشتہ ستّر پچھتر سال کی جدوجہد، آپ کے مشاہدات اور تجربات کی بابت بہت کچھ جاننے کا آرزومند

**ایک لکھنو والے نے**
**پنجابی میں روزنامہ نکالا**

ہوں۔ میری درخواست ہوگی کہ آپ جتنا بھی وقت دے سکیں اور جتنا کچھ بیان کرنا چاہیں، اُس سے مستفید ہونے کو میں اپنے لیے اعزاز تصور کروں گا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ قیام پاکستان سے قبل، لکھنؤ میں اپنی ابتدائی زندگی کے احوال سے اس گفتگو کا آغاز فرمائیں تاکہ اندازہ ہو کہ قطرے سے گوہر ہونے تک کی اس مسافت کی ابتدائی تفصیلات کیا تھیں؟

## لکھنؤ میں بچپن کی یادیں

جواب: میری ابتدائی یادیں قیام پاکستان سے قبل کی ہیں۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن کے وقت مجھ میں سمجھ بوجھ پیدا ہوچکی تھی۔ 1936ء میں، میں پیدا ہوا اور الیکشن کے وقت دس برس کا تھا۔ میرے والد وکیل تھے اور کچھ نہ کچھ سیاست وغیرہ پر ان سے بحث ہوتی رہتی تھی۔ ان کے ایسے بہت سے دوست تھے جن میں کچھ قائداعظم کے حق میں تھے اور کچھ مخالف۔ میرے والد تقسیم ہند کے بہت متشدد طریقے سے خلاف تھے۔ حتیٰ کہ اُن کے بہت سے قریبی دوست جو وہاں سے ہجرت کرکے پاکستان آگئے تو والد صاحب نے ان سے خط و کتابت بھی بند کردی۔ ان میں ایسے دوست بھی تھے جن سے وہ روز ملنے جاتے تھے۔ عید یا عاشورہ کے روز دوپہر تک تو وہ عزیزوں سے ملتے تھے مگر بعد میں دوستوں کے پاس جاکر شام تک وہیں رہتے تھے۔ یہ اُن کا طریقہ تھا لیکن اُن دوستوں کی پاکستان ہجرت کے بعد والد صاحب کے اُن کے ساتھ روابط ختم ہوگئے۔ ہمارے گھر کا ماحول politicized ضرور تھا۔ لکھنؤ میں ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں مسلم نشست کے لیے چوہدری خلیق الزماں بھی کھڑے تھے اور علی ظہیر بھی۔ انہیں شیعہ نمائندے کے طور پر کھڑا کیا گیا۔ علی ظہیر میرے والد کے ساتھ پڑھے بھی تھے۔ اس لیے اُن کے صاحبزادے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی سیکریٹری سجاد ظہیر صاحب سے بھی بہت مراسم تھے۔ علی ظہیر شیعہ کانفرنس کے

**صحافت میں آبلہ پائی کے بعد**
**انسانی حقوق کی جدوجہد**

امیدوار تھے اور چوہدری خلیق الزماں مسلم لیگی تھے۔ چوہدری خلیق الزماں کے خلاف وہاں بہت بڑا کمپین ہوا جو کہ بہت دلچسپ بھی تھا۔ انہوں نے امین الدولہ پارک میں مسلمانوں کی مسجد تو نہیں بنوائی مگر ہندوؤں کے لیے مندر ضرور بنوایا۔ ممکن ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ حالات جس طرف جارہے ہیں اُن کو وہیں رہنا ہو۔

مجھے بہت اچھے طریقے سے یاد ہے کہ 1946ء کے الیکشن میں، میں نے پہلی بار یہ دیکھا کہ ڈولی، چوپہلہ اور فینَس پر عورتیں ووٹ ڈالنے گئیں۔ یہ سب سواریاں تھیں۔ ڈولی میں دو کہار اور چوپہلہ میں چار کہار ہونے لازم تھے جو کہ مربع شکل کا تھا (علمائے کرام خاص طور سے اس میں سفر کرتے تھے)، فینس میں زیادہ تر رؤسا سفر کرتے تھے اور فیملی بھی سفر کرتی تھی۔ یہ مستطیل شکل کا ہوتا تھا۔ اس کے چار یا بسا اوقات چھ کہار بھی ہوتے تھے۔ یہ بڑی سواری ہوتی تھی اس میں زیادہ لوگ سفر کر سکتے تھے۔ وہاں کہاروں کی باقاعدہ رہائش ہوتی تھی۔ لوگ یا تو اپنی ڈولی اور چوپہلہ رکھتے تھے اور اُس میں کہاروں کو تنخواہ پر رکھا جاتا تھا یا پھر محلوں میں باقاعدہ کہاروں کی بستی ہوا کرتی تھی

جہاں مختلف سواریاں مل جایا کرتی تھیں۔ مثلاً ڈولی میں ماں اور بیٹا بیٹھ گئے، چھوٹے سے سفر کے لیے بھی اس کا استعمال کیا جاتا تھا اور ان پر پردہ ہوتا تھا۔ اور جب انہیں سواریاں بٹھانی

## ہر محلے میں ڈولی اٹھانے والے کہاروں کی باقاعدہ بستی

ہوتی تھیں تو گھروں کی ڈیوڑھی میں ڈولی رکھ جاتے تھے۔ میں اکثر اپنی والدہ کے ساتھ ان سواریوں میں بیٹھ کر خالہ وغیرہ کے گھر جاتا تھا۔

الیکشن 1946ء میں عام مسلمانوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میرا خیال ہے کہ علی ظہیر اگر الیکشن نہ لڑتے تو مسلم ووٹ فرقے کی بنیاد پر تقسیم نہ ہوتا لیکن اس سے کوئی بہت بڑا فرق نہیں پڑا۔ ہمارے اپنے بہت سے رشتہ دار بھی مسلم لیگ کو ووٹ دے رہے تھے۔ مسلم لیگ کا زیادہ زور تھا اور الیکشن میں خلیق الزماں کو ہی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وہ بھی ہمارے والد کی طرح وکالت ہی کرتے تھے۔ میں اُن سے کافی مرتبہ مِل بھی چکا ہوں۔ کراچی میں اُن کا گھر راجہ صاحب محمود آباد کے گھر کے

## بلوچستان میں انسانی بے توقیری پر آواز گلوگیر

بالکل ساتھ ہی تھا، جو اصل میں علی امام صاحب کا تھا۔ جو کہ آرٹسٹ تھے اور انڈس گیلری کے پرنسپل بھی تھے۔ راجہ صاحب سے بھی ہمارے والد کے تعلقات تھے۔ جب یو پی میں زمینداری ختم ہوئی تھی تو ہمارے والد نے محمود آباد کی زمینوں کے انتقال کا کام کیا تھا۔ راجہ صاحب نے وہ زمینیں کسانوں کو منتقل کروادی تھیں۔ محمود آباد کی ریاست میں بہت سارے گاؤں تھے جو خیرآباد اور ضلع سیتاپور میں شامل تھے۔

شاہانِ اودھ کی اولاد جن کا تعلق شیش محل سے تھا ان کے بھی ضلع سیتاپور وغیرہ میں بہت سارے گاؤں تھے۔ میرے والد کو کورٹ نے اس کا رسیور مقرر کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بہت سارے نوابین اپنے حصے کی رقم لینے میرے والد صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ ہمارا گھر ایک ٹیلے پر واقع تھا اور وہ سب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے تھے۔ اودھ کی شہزادی، بہو بیگم صاحبہ نے اپنے خاندان کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کو قرض دیا تھا جس کی آمدنی سے اس خاندان کے افراد کو وثیقہ ملتا تھا۔ 'وثیقہ دارانِ اودھ' کے نام سے ان کی انجمن تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک خالو جو اسی خاندان سے تھے، ان کے والد کو بھی سترہ یا اٹھارہ روپے ماہانہ وثیقہ ملتا تھا۔ جب بچوں میں تقسیم ہوجانے والی رقم بہت کم رہ جاتی تھی تو وثیقہ گورنمنٹ کو بیچ سکتے تھے۔ اب کیونکہ کئی نسلیں گزر چکی تھیں، کسی کے حصے میں دو روپے رہ گئے تھے، کسی کے چار آنے۔

مجھے یاد ہے ہمارے بچپن میں ایک خاتون ہوا کرتی تھیں جن کو سب سے زیادہ وثیقہ ملتا تھا اور ان کو کہتے ہی 'سات سووالی' تھے۔ اُن کے گھر کے پاس کاظمین کا ایک ریپلیکا ہے، امام باڑہ اور کربلا بھی ہے۔ سب لوگ کہتے تھے کہ 'سات سووالی' کے چبوترے پر جا کر بیٹھ جائیں تو محرم کے جلوسوں کی زیارت کر سکتے تھے۔

اُس وقت سیاست کی وجہ سے شیعوں میں بھی مسلم لیگی اور غیر مسلم لیگی کہلائے جانے لگے۔ گنگا پرشاد نے امین آباد میں ایک میموریل ہال بنایا تھا جس میں پارٹیوں کے اجلاس ہوتے تھے۔ لکھنؤ میں ایک بارہ دری بھی ہے جس کو واجد علی شاہ کے زمانے میں بنایا گیا تھا۔ میں نے وہاں اور امین الدولہ پارک میں مولانا آزاد، جواہر لعل نہرو اور مولانا حفظ الرحمن وغیرہ کی تقاریر بھی سنی ہوئی ہیں لیکن سب سے اچھا مقرر میں نے مولانا حفظ الرحمن کو پایا۔ یہ غالباً 1948ء کی بات ہے۔ وہیں بارہ دری میں زمینداری ابولیشن ایکٹ کی مخالفت کے لیے ایک اجلاس منعقد ہونا تھا جس میں رجواڑوں کی آرگنائزیشن نے ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی جتنے بھی راجہ مہاراجہ تھے سب کو مدعو کیا تھا۔ کانگریس کی حکومت نے اس اجلاس کے آرگنائزرز کو دھمکی دی کہ اگر یہ اجلاس منسوخ نہ کیا گیا تو جو مراعات دی گئی ہیں وہ واپس لے لی جائیں گی۔ اس دھمکی کے بعد یہ اجلاس منسوخ ہوگیا۔

نواب واجد علی شاہ کے پوتے پرنس یوسف مرزا جن کا کراچی میں انتقال ہوا تھا، ان کو ایک تنظیم 'اودھ ریسٹوریشن مشن' کی جانب سے ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ میں مدعو کیا گیا۔ وہ کلکتہ سے لکھنؤ پہنچے تو ان کو جلوس کی شکل میں حسین آباد کے امام باڑے لے جایا گیا جہاں تنظیم کے سربراہ نواب افسر حسین نے ان کی تاج پوشی کا بندوبست کیا تھا۔ جب جلوس پرانے لکھنؤ کی سڑک سے گزر رہا تھا تو ہندو رستوگیوں نے پرنس یوسف مرزا پر اشرفیاں نچھاور کیں۔ ان

## سات سووالی کے چبوترے سے محرم کے جلوس کی زیارت

رستوگیوں کے بزرگ شاہانِ اودھ کے عہد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے۔

تین امام باڑے لکھنؤ میں بہت مشہور ہیں، حسین آباد اور آصف الدولہ ایک سائیڈ پر لکھنؤ میں، اور تیسرا شاہ نجف ہے، وہ دریا کے کنارے ہے، ویسے تو دریا کے قریب یہ بھی ہیں لیکن یہ سب دوسری سائیڈ پر ہیں۔

پرنس یوسف مرزا کی اودھ کے بادشاہ کے طور پر تاج پوشی کی

رسم ادا ہوئی۔لیکن وہ صبح کی پہلی ٹرین سے واپس کلکتے کے لیے روانہ کر دیے گئے۔ دراصل یوپی کی گورنر سروجنی نائیڈو صاحبہ نے پرنس یوسف مرزا کو فون پر کہا تھا کہ تم میرے دوست پرنس اکرم کے بیٹے ہو اس لیے میں تمہیں گرفتار نہیں کروا رہی لہٰذا تم جلد از جلد لکھنؤ سے کلکتے واپس چلے جاؤ۔ پرنس یوسف مرزا نے واپس جانے میں ہی عافیت محسوس کی۔ ان کو باقاعدہ جلوس کی شکل میں لے جایا گیا اور ہندو رستوگیوں نے ان پر اشرفیاں بھی نچھاور کیں۔ جب میں نے ایک رستوگی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ واجد علی شاہ کے زمانے میں ان کے بزرگ وزراء میں سے تھے اور ان کا تعزیہ بھی نکلتا تھا جو ابھی تک نکلتا ہے۔ ان کو بالکل یقین تھا کہ اودھ کی سلطنت واپس آ رہی ہے اور ان کو وزارتیں بھی واپس ملیں گی۔ رستوگی محلہ راجہ بازار میں ہے، وہاں یہ سود پر قرض وغیرہ کا دھندا کرتے ہیں۔ جو اشرفیاں انہوں نے پھینکیں وہ لوگوں نے اٹھائیں۔ میرا خیال ہے ایک اشرفی اس وقت سترہ اٹھارہ روپے تھی اور ایک تولہ سونا تیس روپے تھا۔

برطانوی ہند میں ٹریڈ یونینز نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ کم از کم اجرت ایک تولہ سونے کی رقم کے برابر ملنی چاہیے۔ اس وقت مرزا ابراہیم سب سے بڑی آل انڈیا ٹریڈ یونین کے لیڈر تھے۔ جب مسلم کمیونٹی کا علیگڑھ کالج بنا تو کچھ شیعہ ریاستوں کے سربراہان نے سوچا کہ ایک شیعہ کالج بھی بننا چاہیے۔ اس وقت یہ بھی سوچا گیا کہ مسلمان لڑکیوں کے لیے بھی کوئی کالج ہونا چاہیے۔

مولوی کرامت حسین صاحب جو انجینئر تھے انہوں نے اپنے تکیے کے غلاف میں پیسے جمع کرنا شروع کیے، وہ روز اس میں کچھ نہ کچھ ڈالتے رہتے تھے۔ جب وہ تکیہ بھر گیا تو کرامت حسین صاحب راجہ صاحب محمود آباد کے پاس گئے اور کہا کہ عمارت کی تعمیر کے لیے تو میں نے یہ پیسے جمع کیے ہیں لیکن گرلز کالج کے لیے زمین آپ دے دیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی جتنی بھی زمین ہے وہ راجہ صاحب محمود آباد نے ہی دی تھی۔ لکھنؤ یونیورسٹی پہلے کیننگ کالج ہوا کرتا تھا اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے امتحان ہوتے تھے، پھر لکھنؤ یونیورسٹی انڈیپنڈینٹ چارٹر سے بن گئی۔ میرے والد نے گریجویشن الٰہ آباد سے کیا اور لاء جب کیا تو لکھنؤ یونیورسٹی بن چکی تھی۔

کرامت حسین صاحب سے راجہ صاحب نے کہا کہ جتنی زمین آپ نے لینی ہو لے لیں۔ اب اس مسلم گرلز کالج لکھنؤ میں تقریباً تیرہ ہزار لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ شاید اس کو اب یونیورسٹی کا درجہ بھی مل گیا ہو۔ مسلم گرلز کالج کی اولین پرنسپل مس روشن جہاں تھیں۔ ان کا تعلق سرگودھا سے تھا۔ وہ علی گڑھ میں پڑھی تھیں۔ میری بیگم بھی ان کی شاگرد رہی تھیں۔ روشن جہاں تقسیم کے وقت بھی لکھنؤ ہی رہیں۔ سرگودھا سے ان کے بھائی لکھنؤ آئے لیکن روشن جہاں مسلم گرلز لکھنؤ سے جانے پر رضامند نہ ہوئیں۔ اسی دوران پنڈت نہرو لکھنؤ آئے تو مس روشن جہاں سے جا کر خود ملے اور کہا کہ آپ کے یہاں تو زمینداری ابولیشن نہیں ہوا ہے جبکہ ہم نے یہ ختم کر دیا ہے۔ سرگودھا میں آپ کے حصے کی جتنی بھی زمین بنتی ہو وہ آپ یہاں لے لیں۔ انہوں نے منع کر دیا۔ وہ تو تنخواہ بھی نہیں لیتی تھیں۔ اُن کی صرف رہائش تھی اور کتابیں خریدتی تھیں اور پڑھنے کے بعد لائبریری کو دے آتی

## لکھنو کے تین مشہور امام باڑے

تھیں۔ تین سال پہلے جب میں وہاں گیا تھا تو ان کے مزار پر فاتحہ بھی پڑھی تھی۔

لکھنؤ میں تعلیم گاہِ نسواں کے نام سے اسکول تھا لیکن وہ صرف میٹرک تک ہی تھا۔ ہماری بہنیں پہلے تعلیم گاہ میں پڑھتی تھیں پھر مسلم گرلز کالج چلی گئیں۔ سجاد ظہیر صاحب کی اہلیہ اور معروف ادیبہ رضیہ سجاد ظہیر مسلم گرلز کالج میں ہی پڑھاتی تھیں۔ یہ خواتین بھی مسلمانوں کے تعلیمی revival میں شامل تھیں۔

سوال: قرۃ العین اور سجاد حیدر یلدرم صاحب علیگڑھ میں نہیں تھے؟

جواب: علی گڑھ میں بھی تھے لیکن یہ زیادہ لکھنؤ میں ہوتے تھے، شاید وہاں ان کا گھر تھا۔ قرۃ العین حیدر غالباً آئی ٹی کالج میں پڑھی تھیں۔

شیعہ کالج لکھنؤ جہاں میں نے چھٹی کلاس سے ایف ایس سی تک تعلیم حاصل کی، اس کے لیے زمین ایک بڑے وقف نے دی تھی۔ یہ ایک کربلا کے ساتھ والی زمین تھی، جس میں فٹ بال اور کرکٹ وغیرہ کی گراؤنڈز بھی تھے۔ شیعہ کالج ایک سوسائٹی نے

## مسلم گرلز کالج میں 13 ہزار طالبات

بنایا تھا۔ اس کی ایک باقاعدہ مینیجنگ کمیٹی تھی۔ ہمارے کالج میں بہت سارے مسائل بھی رہتے تھے۔ ٹیچنگ اسٹاف بہت اچھا تھا۔ ہم نے جن کے لیے ہڑتال کی تھی وہ ایک سنی ٹیچر، طاہر صاحب تھے جو اکنامکس پڑھاتے تھے اور کامرس کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ بھی تھے۔ اُن سے پرنسپل صاحب نے بدتمیزی کی تھی جس پر طالبعلموں نے ہڑتال کی کہ پرنسپل، طاہر صاحب سے معافی مانگیں تب ہی ہڑتال ختم ہوگی۔ میں اُس وقت آٹھویں کلاس میں تھا۔ یوپی میں بہت سخت قانون تھا کہ تین دن ہڑتال کے بعد اسکولوں کا سرکاری ادارہ اس تعلیمی ادارے میں وزٹ کرتا تھا۔ وہ ہڑتال کا سبب پوچھتا تھا اور اسے تادیبی کارروائی کرنے کا اختیار تھا۔ تیسرے دن میں نے یہ دیکھا کہ پرنسپل صاحب نے روتے ہوئے طاہر صاحب سے معافی مانگ لی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ کالج میں کافی mismanagement تھی۔ میرے والد صاحب کالج کی مینیجنگ کمیٹی کے بھی ممبر تھے اور ruling group کے opponents میں بھی تھے۔ شیعوں کا 'سرفراز' کے نام سے ایک روزنامہ اخبار تھا، جو پہلے ڈیلی نکلتا تھا، پھر ویکلی ہوگیا تھا۔ ایک صاحب تھے ممتاز حسین جونپوری جو کہ بہت ہی عالم آدمی تھے، وہ شیعہ کمیونٹی کے سب سے معتبر لیڈر تھے جن کی لکھنؤ کی تمام کمیونٹیز میں عزت تھی۔ وہ اس ادارے کے سربراہ تھے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر کا نام اعظم حسین اعظم تھا۔ میں ایک مضمون لے کر ان کے پاس گیا۔ وہ ہمارے گھر بھی آتے تھے میں نے ان سے کہا کہ میں کالج کے حالات پر آپ کو ایک مضمون لکھ کر دینا چاہتا ہوں مگر آپ میرے والد کو نہ بتائیں اور میرا نام بھی اس مضمون پر نہ دیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ مضمون جب چھپ گیا تو بہت سی باتیں شروع ہوئیں۔ مینجمنٹ نے کہا کہ یہ یا تو تقی صاحب نے خود لکھا ہے یا کسی سے لکھوایا ہے۔ میں بچپن میں بہت زیادہ بیمار ہوا تھا۔ مجھے چیچک ہوگیا تھا اور حالت مرگ کے قریب تھا۔ اس لیے میں والدہ کے زیادہ قریب تھا۔ اُن کے قریب رہنے کی وجہ سے وہ مجھے بہت سپورٹ بھی کرتی تھیں۔ ہمارے گھر کا اصول تھا کہ سورج غروب سے پہلے گھر آنا ہوتا تھا لیکن میں بارہ سے رات دو بجے گھر آتا تھا۔ میرے والد جب مجھ سے پوچھتے تھے تو میں کہتا کہ کیا آپ مجھے بدکار آدمی سمجھتے ہیں، وہ کہتے کہ نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں جواب دیتا کہ میں مختلف abandoned مساجد میں نماز پڑھنے جاتا ہوں اور وہیں سو جاتا ہوں اور جب آنکھ کھلتی ہے تب میں آ جاتا ہوں۔ ہمارے والد صاحب کو کسی نے کہا کہ یہ مضمون آپ نے لکھا ہے یا کسی سے لکھوایا ہے، والد صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کس نے لکھا ہے، اور میں نے سنا ہے کہ تم سرفراز کے دفتر گئے تھے (یقیناً ان کے مخبروں نے یہ بتایا ہوگا)۔ میں نے کہا کہ میں دفتر گیا تھا چچا سے ملنے، پھر ان کے اصرار پر میں نے بتایا کہ یہ میں نے ہی لکھا ہے۔ میری والدہ جن کو ہم 'بھابھو' کہتے تھے ان کا کمرہ گھر میں والد صاحب کے دفتر کے ساتھ ہی منسلک تھا۔ جب ان کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم نے شیعہ کالج کے خلاف لکھا ہے تو میں نے کہا کہ میں نے تو صرف وہاں کی انتظامیہ کے بارے میں لکھا ہے۔ والدہ نے کہا کہ کیا تم اور مزید لکھ سکتے ہو، میں نے کہا 'ہاں'۔ میں والد صاحب کی میز پر گیا اور انہی کی میز سے سادہ کاغذ لے کر مضمون لکھ ڈالا اور بھابھو کو دیا۔ وہ قرآن پڑھ لیتی تھیں مگر اردو بہت مشکل سے پڑھتی تھیں۔ جب والد صاحب آئے تو بھابھو نے وہ پرچہ ان کو دیا اور کہا کہ یہ سعید (مجھے گھر میں سعید کہہ کر بلاتے تھے) نے میرے سامنے لکھا ہے۔ میں نے مضمون میں آگے کے حالات لکھ دیے تھے، والد صاحب کو

پھر یقین ہوگیا کہ یہ میں نے ہی لکھا ہے۔ یوں میری صحافت کا سفر گھر سے ہی شروع ہوا تھا۔

صحافت کے سلسلے میں اگلی منزل پاکستان میں طے ہوئی۔ جب این ایس ایف یہاں ہوتی تھی تو اس وقت الطاف گوہر کراچی کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہ شاید عبدالودود کو، جو ڈپٹی اٹارنی جنرل بھی رہے ہیں اور اسٹوڈنٹ لیڈر بھی تھے، کچھ cultivate کرنا چاہتے تھے ۔اے ٹی نقوی صاحب اس وقت چیف کمشنری سے ہٹے تھے، اب کوئی اور چیف کمشنر تھا۔ بہرحال انہوں نے 'طالبعلم' کا ڈیکلیریشن دے دیا تھا، 'طالبعلم' کے نام سے اس رسالہ میں، میں نے بھی لکھا ۔۷ جنوری ۱۹۵۳ء کی طلبا کی موومنٹ پر بہت سی شاعری ہوئی تھی۔ ہم نے اس پر مشتمل ایک کتاب چھاپی تھی ۔اب وہ کتاب شاید ہی پاکستان میں کسی کے پاس ہو۔

سوال: حسین نقی صاحب، میرے پاس اُس کی ایک کاپی محفوظ ہے۔ اس کی فوٹو اسٹیٹ میں آپ کو پیش کروں گا۔

جواب: بہت خوب، ضرور دیجیے گا۔ ہم نے اس میں وہ ساری شاعری چھاپی تھی ۔تقریباً تمام ہی اہم شعرا نے اس واقعہ پر کچھ نہ کچھ لکھا تھا ۔اس کتاب کے سرورق کو اخباروں کے تراشوں سے مزین کیا گیا تھا۔ اس طرح صحافت سے میری وابستگی پکی ہوئی۔

سوال: آپ کی صحافت کی طرف ہم پھر آئیں گے، مگر بہتر ہو کہ پہلے آپ کے بچپن اور خاندانی پس منظر کا ذکر مکمل ہوجائے۔

جواب: میرے والد صاحب وکیل تھے، ہم انہیں ببّا کہتے تھے اور والدہ کو بھابھو۔ میرے پردادا ایسٹ پنجاب میں بارھا سادات کے نام پر ایک گاؤں ہے پنگوڑ۔ اورنگزیب کے زمانے میں دہلی کی حکمرانی میں سیّد بہت مداخلت کرتے تھے جس پر اورنگزیب نے کہا کہ یہ بہت سازشی لوگ ہیں لہٰذا ان کو نکالو اور زمینیں جاگیریں دے دو۔ انہیں بارہ گاؤں دے دیے گئے تھے جن میں سے ایک گاؤں 'پنگوڑ' کے نام سے ہے، اور حسن پور جو کہ اب ایک شہر بن چکا ہے، وہ بھی قریب تھا۔ وہاں سے رحمن صاحب ( آئی اے رحمن ) کا بھی تعلق تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا تو وہ کہنے لگے کہ تم تو ہمارے پڑوسی تھے ۔کیونکہ دہلی سے اگر آپ آئیں تو پہلے گڑگاؤں آئے گا پھر حسن پور۔ یہ بھی گڑگاؤں ضلع کا ایک بڑا گاؤں تھا۔ اب ضلع کا ہیڈکوارٹر ہے۔

سوال: گڑگاؤں دہلی سے کتنا دور ہے؟

جواب: دہلی سے چالیس کلومیٹر دور ہے ۔اب تو ملا ہوا ہے بلکہ دہلی کا ایئرپورٹ تو تقریباً گڑگاؤں کی ہی زمین پر بنا ہوا ہے۔ میرے پردادا کے والد کچھ مسائل کی بنا پر اپنے گاؤں سے ہجرت کرکے لکھنؤ کے علاقے مہدی گنج میں مقیم ہوگئے ۔اُن کے گھر میں میر انیسؔ مرثیہ پڑھتے تھے ۔مہدی گنج میں ابھی بھی میرا ایک بہنوئی رہتا ہے۔ اس گھر میں ایک ایک علَم اور پٹکا جو ہمارے بزرگ عراق سے لائے تھے اور پھر پنگوڑ سے لکھنؤ لائے، وہ ابھی بھی مہدی گنج میں محفوظ ہے۔ پٹکا تو اب اتنا بوسیدہ ہو چکا ہوگا کہ چھوئیں گے تو چھوا نہیں جائے گا، اسے ایک تابوت میں رکھا ہوا ہے۔ جس کا اوپری حصہ شیشے کا ہے تاکہ علَم کی زیارت کی جاسکے ۔ میر انیس کے پوتے اور پڑپوتے بھی پاکستان آگئے تھے۔ ان سے ہماری ملاقات بھی ہوئی تھی ۔انہوں نے آخری مجلس ہمارے یہاں ہی

## کالج کے دنوں میں لکھے مضمون سے صحافت کا سفر شروع ہوا

پڑھی تھی۔ صرف مرثیہ ہی پڑھا جاتا تھا لیکن اب ان کے خاندان کا کوئی نہیں رہ گیا ہے۔ لکھنؤ میں انیسؔ اور دبیرؔ کے الگ الگ سپورٹرز تھے۔ ہماری فیملی میر انیسؔ کی سپورٹر تھی حالانکہ میری ایک کزن کی شادی بعد میں مرزا دبیرؔ کے پوتے سے ہوئی تھی۔ سن ۱۹۱۴ء کی جنگ میں میرے دادا زیارتوں پر گئے ہوئے تھے، وہاں وہ جنگ میں پھنس گئے ۔اس جنگ کو پہلی جنگ عظیم کہا جاتا ہے۔ میرے سب سے چھوٹے چچا عراق میں ہی پلے بڑھے۔ دادا کا انتقال کربلا میں ہی ہوگیا۔ جب دادی اور چچا واپس آئے تو چچا محض عربی بول پاتے تھے۔ ہمارے والد بتاتے تھے کہ جب چھوٹے چچا واپس آئے تو ان کو بالکل اردو نہیں آتی تھی کیونکہ وہ صرف چند برس کے تھے۔

سوال: آپ اپنے والد کے بارے میں بتا رہے تھے؟

جواب: ہمارے والد نے خود اپنی کوشش سے پڑھا۔ ان کے منجھلے بھائی نے میٹرک کیا۔ سب سے بڑے تایا نے زیادہ پڑھا نہیں تھا۔ منجھلے چچا حسین آباد ٹرسٹ کی انتظامیہ میں ملازمت کرتے

## طالب علم رسالے میں 1953 کی طلبہ تحریک پر شاعری

تھے اور ہمارے والد کو انہوں نے ہی پڑھایا۔ اُن کے بیٹے پی آئی اے کے ابتدائی ملازم تھے سارا نیویگیشن سسٹم ان کا قائم کیا ہوا تھا۔ ان سے بڑے بھائی فنچوگنج میں چیف انجینئر تھے۔ 1947ء کی شورش میں وہ وہاں سے جب بھاگ رہے تھے تو ان کے چپڑاسی نے کہا کہ جو بھی پہنے ہو بس ایسے ہی نکل جاؤ تو وہ بیچارے جب کراچی پہنچے تو قینچی چپل پہنے ہوئے تھے اور کہنے لگے کہ 'بس زندہ بچ کے آگیا ہوں'۔

ہمارے والد نے انٹر، بی اے اور لاء کی ڈگری مکمل کی۔ ان کی پہلی شادی ہماری والدہ کی کزن سے ہوئی تھی جن سے میری سب سے بڑی بہن تھیں، اب بہن کا انتقال ہوگیا ہے۔

سوال: آپ کی والدہ کا کہاں سے تعلق تھا؟ ان کا اپنا خاندانی پس منظر کیا تھا؟

جواب: ہماری والدہ لکھنؤ کے زمیندار خاندان سے تھیں۔ لکھنؤ میں ایک سبزی منڈی ہے، اس کی زمین ہمارے پرنانا کی تھی۔ وہاں یہ لوگ مقیم تھے۔ یہ بڑے صاحبِ جائیداد تھے مگر اپنا سب کچھ بیچ دیا اور سب تختوں پر بیٹھ کر کراچی آگئے۔ جو مزدور اٹھا کر لائے تھے ۔والدہ بتاتی تھیں کہ ہم نے 'تختِ رواں' پر سفر کیا تھا۔ ہمارے نانا جنہوں نے کبھی زیادہ کام نہیں کیا، وہ گلاب کے پھول حوض میں ڈال کر نہایا کرتے تھے۔ نانا کی وراثت میں صرف ایک امام باڑہ رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ کے سب مکان قرض میں جکڑے ہوئے تھے جس پر بہت مقدمہ بازی ہوئی۔ بعد میں ہمارے والد نے وہ مقدمہ جیت بھی لیا۔ نانا کی رہائش اپنی بیگم کی جائیداد پر تھی۔ نانی کے بھی کوئی پندرہ بیس کے قریب گھر تھے جن سے کرایہ آتا تھا۔ سب سے زیادہ کرایہ جو مجھے یاد ہے وہ دس روپے ہے، پانچ اور دو روپے بھی تھا۔ میری نانی بہت وضع دار اور ملنسار تھیں۔ میرے نانا کی عادت تھی وہ بجلی کی روشنی میں نہیں بیٹھتے تھے۔ وہ جب سوتے بھی تھے تو دِیوں میں سرسوں کا تیل ڈال کر اس کی مشعلیں جلاتے تھے۔ اُن کو کہانی بنانے کا فن خوب آتا تھا۔ جب وہ کوئی نئی کہانی شروع کرتے تھے تو اگلے دن ہم سے گذشتہ کہانی کے حصے تک پوچھتے تھے۔ ہم سب بچے چھت پر اپنی پلنگ اور پلنگیاں اُن کے چاروں طرف بچھا لیتے تھے تب وہ کہانی شروع کرتے تھے۔ اب اگر کوئی بچہ سوگیا تو اگلے دن وہ وہیں سے شروع کرتے تھے۔ وہ جو کہانی سناتے تھے، ہم نے اس سے پہلے وہ کبھی کہیں نہ پڑھی اور نہ سنی ہوتی تھی۔ میں جب میٹرک میں تھا تو ان کی وفات ہوئی۔ وہ بتاتے تھے کہ میں دن بھر یہ کہانیاں سوچتا ہوں اور رات میں سنا دیتا ہوں۔

سوال: بہن بھائیوں کے کیا طور طریقے تھے، آپس کے تعلقات کیسے تھے؟

جواب: ہم چھ بھائی اور چھ بہنیں ہیں جن میں سے ایک بھائی اور تین بہنوں کا انتقال ہوگیا۔ بھائی پاکستان آئے تھے مگر واپس چلے گئے اور لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ سروے آف پاکستان میں میرے کزن تھے، اُن سے میری بہن کی شادی ہوئی تھی، میں انہی کے ساتھ یہاں پاکستان آیا تھا۔ یہاں آکر مجھے محسوس ہوا کہ میں بہت آزاد ہوں۔ وہاں بہت سختی تھی کہ روز دو یا تین گھنٹے والد کی میز پر پڑھو( حالانکہ میں پڑھتا کم تھا اور سوتا زیادہ تھا)۔ اس لیے یہاں پاکستان میں زیادہ آزادی محسوس کرتا تھا۔ بہنوئی جو مجھ سے ذرا ہی بڑا تھا وہ بھی بہت خیال کرتا تھا۔ اس طریقے سے میں یہاں ٹِک گیا۔ اُس زمانے میں انڈیا آنے جانے پر اتنی پابندی نہیں تھی۔ سب سے بڑے بھائی نے علیگڑھ سے بی ایس سی انجینئرنگ کی۔ ٹریننگ کے بعد پہلی ملازمت انہوں نے علیگڑھ میں کی۔ پھر اُن کا یوپی میں سلیکشن ہوگیا تھا اور وہ ایڈیشنل چیف انجینیئر اِریگیشن کے طور پر ریٹائر ہوئے ۔ترائی کے علاقے میں بہرائچ اور گورکھ پور میں ان کی کافی خدمات تھیں۔ ( جاری ہے )

# حجامہ قدیم طریقہ علاج کی افادیت سے اب مسلمان طبیب بھی ناواقف

میڈیا کوآرڈی نیشن کمیٹی ہمدرد یونیورسٹی کی رپورٹ

حجامہ (Cupping Therapy) سنت نبوی بھی ہے اور قدیم طریقہ علاج بھی، حجامہ تناؤ میں آرام دیتا ہے، سوزش کم کرتا ہے، جسم سے زہریلہ مادہ ختم کرتا ہے، جوڑوں کے درد کیلئے مفید جبکہ امراض قلب کیلئے محفوظ ہے۔ یہ باتیں مقررین نے حجامہ پر جون کے پہلے ہفتے میں منعقدہ دوروزہ ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے کہیں جس کا اہتمام ہمدرد یونیورسٹی کی فیکلٹی آف ایسٹرن میڈیسن اور شفاء الملک ہسپتال، ہمدرد فاؤنڈیشن نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔ ورکشاپ کے افتتاحی سیشن سے ہمدرد یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر سید شبیب الحسن، رجسٹرار کلیم احمد غیاث، کلیدی مقرر سابق وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر حکیم عبدالحنان، ڈین فیکلٹی آف ایسٹرن میڈیسن پروفیسر ڈاکٹر احسانہ ڈار فاروق، حکیم قلبِ سلیم، کلیدی مقرر ڈاکٹر حکیم محمد بلال، ڈاکٹر طبیبہ صائمہ غیاث، ڈاکٹر طبیبہ مصباح احمد، ڈاکٹر حکیم ظہور الحسن زیدی اور حکیم امجد اسماعیل بھی مخاطب ہوئے۔ وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر سید شبیب الحسن نے کہا طب مشرق میں حجامہ کی بہت اہمیت ہے اور موجودہ دور میں اس طرح کے ورکشاپ کا انعقاد ہوتے رہنا چاہیے۔

## چینیوں نے مسلمانوں سے کپنگ تھراپی سیکھی

ہمدرد یونیورسٹی کے سابق چانسلر پروفیسر ڈاکٹر حکیم عبدالحنان نے اپنے کلیدی خطاب میں کہا کہ حجامہ ایک قدیم طریقہ علاج ہے جس کے کئی فوائد اور نقصانات ہیں۔ ایلو پیتھک میڈیسن کے پریکٹیشنرز بھی آج طب مشرقی کے اصولوں کو اپنا رہے ہیں، جب کہ مسلمان طبیب، جو کسی زمانے میں اس شعبے میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے تھے، اب اس کی افادیت سے واقف نہیں رہے۔ مشرقی طب میں روایتی طور پر لوگوں کا علاج چار طریقوں سے کیا جاتا تھا -- یعنی علاج بالتدبیر (رجمنٹل تھراپی، بشمول کپنگ تھراپی)، علاج بالغذا (ڈائیٹو تھراپی)، علاج بالدوا (فارماکو تھراپی)، اور علاج بالید (یعنی سرجری)۔ کچھ عرصہ پہلے تک ایلوپیتھی میں علاج صرف ادویات یا سرجری کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ آج ایلوپیتھی کے پریکٹیشنرز بھی لوگوں کے علاج کے لیے نیوٹریشن اور کپنگ تھراپی وغیرہ کا استعمال کر رہے ہیں۔ یہ تبدیلی صرف 25 سال پہلے شروع ہوئی تھی۔ چینیوں نے مسلمانوں سے کپنگ تھراپی کا طریقہ سیکھا اور اپنایا اور وہ آج کام یاب ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آج ہم دوسروں سے پیچھے ضرور ہیں مگر اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ مسلمان اس میدان میں سبقت نہیں لے سکتے۔

## حجامہ کو عام کرنے سے زیادہ ضروری طبی فلسفے کو عام کرنا

دوسرے کلیدی مقرر ڈاکٹر حکیم محمد بلال نے کہا کہ حجامہ میں جلد پر چھوٹے چھوٹے چیرے لگائے جاتے ہیں اور پھر گندے خون کو خارج کرنے کے لیے کپس سکشن کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ انہوں نے زور دیا کہ کٹ کی گہرائی 2.0 ملی میٹر سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ انہوں نے حجامہ کے کئی فوائد کا ذکر کیا، بشمول کولیسٹرول کی مقدار کو کم کرنا، ڈائلیسس کے مریضوں کی حالت میں بہتری لانا، اور درد عرق النساء اور سوزش کو کم کرنا۔ ساتھ ہی انہوں نے زور دیا کہ حجامہ صرف ایک تربیت یافتہ اور لائسنس یافتہ پیشہ ور کو ہی کرنا چاہیے۔

## گندا خون خارج کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے چیرے

اس موقع پر حکیم قلبِ سلیم نے کہا کہ حجامہ کو عام کرنے سے زیادہ ضروری ہے کہ ہم اس کے طبی فلسفے کو عام کریں۔ انہوں نے کچھ مخصوص قواعد کا ذکر کیا جو حجامہ کے فلسفے سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حجامہ کروانے سے پہلے انڈا نہیں کھانا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انڈا مزاج کو تیز کرتا ہے اور پروٹین کی مقدار کو بڑھاتا ہے۔ اس سے فاسد مادوں کی پیداوار میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ قبل ازیں ہمدرد یونیورسٹی کے رجسٹرار کلیم احمد غیاث نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں کہا کہ ایلو پیتھک ڈاکٹروں نے بھی اپنے مریضوں کو کپنگ تھیراپی تجویز کرنا شروع کر دی ہے۔ موجودہ ورکشاپ حجامہ سمیت رجمنٹل تھراپی کو فروغ دینے کی کوشش میں منعقد کی گئی ہے۔

اس موقع پر ڈین فیکلٹی آف ایسٹرن میڈیسن پروفیسر ڈاکٹر احسانہ ڈار فاروق نے کہا کہ ہمدرد گروپ نے نہ صرف ملک میں یونانی ادویات کو بحال کرنے میں فعال کردار ادا کیا بلکہ ایک مکمل ہسپتال بھی قائم کیا جو اس میں مہارت رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ادارہ ضرورت مندوں کو علاج کے ساتھ ساتھ یونانی ادویات بھی مفت فراہم کرتا ہے۔ حکیم محمد سعید کا قائم کردہ یہ ادارہ ایک جامع نظریہ رکھتا ہے اور اس کا مقصد ایک شخص کی مجموعی صحت کا خیال رکھنا ہے۔ ❁

مغل محل، گوجرانوالہ

"ہم صدام ساگر کے بہت ممنون۔ شکر گزار کہ انہوں نے ہماری درخواست پر سیرو سیاحت کی حکمت پر ایک انتہائی اہم تحریر سے نوازا ہے۔ سیرو سیاحت سے زندگی کتنی خو شگوار ہوتی ہے۔ اور دل و دماغ کی صحت کتنی تر و تازہ ہوتی ہے۔ پڑھئے اور سیرو سفر پر نکلیں۔"

# سیاحت سے دل و دماغ پر مثبت اثرات

☆تحریر: صدام ساگر

سیاحت نہ صرف سیر وتفریح اور صحت افزائی کے لیے مفید ہے بلکہ سیاحت سے مقامی آبادی اور اس ملک کے اقتصاد کو تقویت ملتی ہے۔ لوگوں کو کام کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ سیاحت سے مختلف

## علم کی اشاعت سیاحت سے ہی ممکن ہوئی

ثقافتوں اور خطے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور مختلف اچھی چیزیں ایک معاشرے سے دوسرے میں رائج ہو جاتی ہیں۔ سیاحت کی مختلف اقسام ہیں جیسے قدرتی نظاروں کو دیکھنے والا سیاحت، مذہبی سیاحت جس میں لوگ مذہبی جگہوں کو دیکھنے جاتے ہیں، تاریخی سیاحت جس میں لوگ آثارِ قدیمہ وغیرہ دیکھتے ہیں۔ سیر وسیاحت سے آپ کا دل صحت مند رہتا ہے، یہ مشغلہ آپ کو دوبارہ جوان بنا دیتا ہے، یہ آپ کے ذہن کو تیز بناتا ہے، یہ آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کو بہتر بناتا ہے، یہ آپ کی کارکردگی کو بہتر بناتا ہے، یہ آپ کو ذاتی فروغ کے مواقع فراہم کرسکتا ہے، اچھی صحت کے لیے سفر معاون ہے۔ اسی طرح سیر وسیاحت کے ساتھ ساتھ ورزش بھی بہت ضروری ہے، جو آپ کی جلد کو صحت مند بنانے، وزن میں نمایاں کمی، دائمی بیماروں سے بچاؤ، یاداشت اور دماغی صحت میں بہتری، توانائی میں اضافہ اور نیند میں بہتری کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ''سال میں ایک بار سیاحت کے لیے نکلنا دل و دماغ پر مثبت اثرات مرتب کرتا ہے۔'' اسی لیے بہت سے تعلیمی ادارے اپنے طلبہ کو سیر وسیاحت کے لئے دور دراز مقامات پر لے جاتے ہیں۔ جہاں نئی جگہ کی سیر، اس کو دیکھنا، اور وہاں جانے سے قبل خوش اور پر جوش ہونا، یہ سب طلبا کی صحت پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آشفتہ چنگیزی کا ایک خوبصورت خیال یاد آرہا ہے کہ:

کس کی تلاش میں ہیں تو کس کے اثر میں ہیں
جب سے چلے ہیں گھر سے مسلسل سفر میں ہیں

میری طرح کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ ''کچھ نہیں کر سکتے تو باہر نکلو، دنیا کو دیکھو، اس سے دیکھو، کائنات کی بناوٹ پر غور کرو، سیر وسیاحت کے لیے گاڑی نہ ہو تو پیدل نکل پڑو۔'' کتنی ہی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کسی نے ہزار میل کا سفر اکیلے طے کرلیا، کسی نے دنیا کا گرم ترین صحرا پیدل ہی عبور کرلیا، کوئی ہمالیہ کی چوٹی سر کر بیٹھا، سیاحت نہ ہوتی تو انسان کبھی نہ جان پاتا کہ کاغان میں جھیل سیف الملوک اپنے روح پرور مناظر صدیوں سے بکھیر رہی ہے، اگر سیاحت نہ ہوتی تو کوئی نہیں جان پاتا کہ سطح سمندر سے آٹھ ہزار میٹرز کی بلندی پر ہمالیہ، ہندوکش، کے ٹو اور راکاپوشی کے پہاڑ صدیوں سے برف کی لپٹ میں چاندی کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں اور صرف پاکستان ہی نہیں دنیا بھر کے دیگر ممالک کی ایسی بہت سے مثالیں مجروح سلطانپوری کے اس شعر کے مصداق پتہ چلتی ہیں۔

## سفر سے لوٹیں تو کتنی معلومات کتنی تصاویر

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اگر انسان کی زندگی میں سیر وسیاحت نہ ہوتی تو شاید زمین پر انسان تو ہوتے مگر کوئی بھی کسی تک رسائی حاصل نہ کر پاتا۔ آج انسان جو اتنا علم رکھتا ہے ساری دنیا کے چپے چپے کی معلومات اس میں سیاحت کا بڑا ہاتھ ہے اور جو علم کے حصول کے لئے سیر وسیاحت کرتے ہیں وہ واقعی مسائل کے بہت سی چوٹیاں سر کر لیتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا

## سیاحت۔صحت اور معیشت دونوں میں تقویت

ہے کہ سفر کے دوران بہت سی ایسی اجنبی جگہ پر انسان پہنچ جاتا ہے جہاں خاص طور پر ثقافت اور روایات سے بالکل انسان آشنا نہیں ہوتا،تو یہ سیاحت آپ کے اندر مشکلات کا سامنا کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کرے گی اور آپ مختلف مسائل اور مشکل حالات کا منطقی حل نکالنے کے قابل ہوں گے۔بہت سے لوگ اجنبی راستوں ،اجنبی منزلوں کی وجہ سے چپ چاپ اپنا راستہ الگ کر لیتے ہیں اختر شمار کے اس شعر کی طرح:

ابھی سفر میں کوئی موڑ ہی نہیں آیا
نکل گیا ہے یہ چپ چاپ داستان سے کون

## سیاحت۔زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے ضروری

سیر و سیاحت کے دوران نت نئے لوگوں سے ملنا، ان کی کہانیاں سننا، ان کے رہن سہن کا مشاہدہ کرنا اور ان کے تجربات سے فائدہ اُٹھانے سے آپ کی ذہنی استعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔دنیا سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔اگر آپ ان کی لینگویج سمجھ نہیں پائے، لیکن باڈی لینگویج سمجھ میں آتی ہے۔اپنے کلچر اور دوسرے ممالک کے کلچر کی آگاہی کے لئے نت نئے مقامات کے سفر پر نکلنے سے نئے لوگوں سے ملاقاتیں، ان کے رسم و رواج سے آگاہی اور مزے مزے کے کھانے اور موسموں کے بدلتے نظارے آپ کی زندگی کو خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ایسے میں جب ہم سفر سے لوٹتے ہیں تو ہمارے پاس بہت سارا مواد، تصویریں اور سلیفیز ہوں گی جو ہم دوستوں اور عزیز و اقارب کو شیئر کرتے ہیں تا کہ ہماری طرح دوسرے لوگوں میں بھی خوشگوار تبدیل آسکیں۔

سیر و سیاحت کے دوران بہت سے ایسے مناظر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جنہیں انسان پہلی ہی نظر میں دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہے۔زندگی میں پہلی بار جب میں اپنی فیملی کے ہمراہ گوجرانوالہ سے شہرِ لاہور میں واقع شاہی قلعے کے تاریخی مناظر دیکھنے کو گیا تو اچانک سے خوف زدہ

گلشن پارک، گوجرانوالہ

ہو گیا۔اتنی پُرانی اور تاریخی عمارت کو دیکھ کر اس سوچ میں پڑ گیا کہ کیا وہ زمانہ ہو گا جب یہ در و دیوار روشنیوں اور شہنائیوں سے جگمگاتے ہونگے۔اس کی موجودہ حالت کو دیکھ کر بھی اشک بار اور افسردہ دل کے ساتھ وہاں سے واپس لوٹ آیا اور کبھی دوسری بار واپس نہیں گیا۔

اسی طرح اپنے بڑے بھائی خواجہ آفتاب عالم کے ہمراہ گوجرانوالہ کے کئی تاریخی مقامات کی سیر و سیاحت کا موقع میسر آیا اس دوران بہت سے تاریخی عمارتوں کو کھنڈر ہوتے ہُوا دیکھا، ان میں تمام تر تاریخی عمارتیں سکھوں کی بنائی ہوئی ہیں جو ہر سال وساکھی کے مہینے میں ان مقامات کا رُخ کرتے ہیں۔ان کھنڈر ہوتی عمارتوں اور یہاں اکثر سناٹا دیکھ کر جاوید اختر کا یہ شعر شدت سے یاد آیا کہ:

ڈر ہم کو بھی لگتا ہے رستے کے سناٹے سے
لیکن ایک سفر پر اے دل اب جانا تو ہوگا

بس اس شعر کی مانند ہم نے اپنا سفر جاری رکھا گوجرانوالہ سے کبھی لاہور، کبھی سیالکوٹ تو کبھی اسلام آباد اس کے علاوہ کبھی کام سے اتنی فراغت نہیں ملی کہ سیر و سیاحت کے لیے جائیں۔زندگی اس قدر مصروف ہو کر رہ گئی ہے کہ راستوں میں فاصلے زیادہ اور منزلیں دور لگنے لگ گئی ہیں۔

ہر شہر ہر ملک کی طرح پاکستان میں بھی ایسے شہر موجود ہیں جہاں تاریخی مقامات سیر و تفریح کے لیے موضوع سمجھتے جاتے ہیں۔ہمارے ہاں بہت سے قلم کاروں کے سفر نامے کتابی صورت میں پڑھنے کو ملتے ہیں جن سے ہمیں دیگر ممالک کی سیر و سیاحت کے حوالے سے جاننے کا موقع میسر ہوتا ہے۔احمد فراز کے اس شعر کے سوا اور کیا کہا جائے۔

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

❀❀❀

نشان منزل، گوجرانوالہ

جولائی امریکہ کا یوم آزادی ہے۔ امریکہ سپر طاقت ہے۔ لیکن چھوٹے ملکوں کے لیے ایک مصیبت بھی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ نے نو آزاد ملکوں کے اندرونی معاملات میں سب سے زیادہ مداخلت کی ہے۔ تختے الٹے ہیں۔ لیڈروں کو قتل کیا ہے۔ اب جب دوسری طاقتیں ابھر رہی ہیں تو امریکہ کو کیا کرنا چاہئے۔ فرید زکریا کی نئی کتاب The Post–American World میں یہی جائزہ لیا گیا ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہم 'اطراف' میں اس کا ترجمہ سلسلہ وار شائع کریں۔ آج کے عالمی حالات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

# امریکہ دوسری ابھرتی طاقتوں کے مقابلے میں طاقتور نہیں رہے گا

## یوم آزادیٔ امریکہ پر امریکہ کے مستقبل کا تجزیہ ☆ فرید زکریا

"یہ کتاب امریکہ کے زوال کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ نئی دنیا کے عروج کے بارے میں ہے۔ فرید ذکریا کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب "دی فیوچر آف فریڈم" کی کامیابی کے بعد، فرید زکریا نے ایک ایسی دنیا کے بارے میں بیان کیا ہے جس میں امریکہ واحد عالمی طاقت کا مقام کھودے گا اور اسے عالمی معیشت نمبر ایک کا درجہ حاصل نہیں رہے گا۔ دنیا میں چین، ہندوستان، برازیل، روس، اور بہت سے دوسرے ممالک کی ترقی وقت کی عظیم کہانی بن جائے گی۔ ایک نئی دنیا نئی شکل کے ساتھ وجود میں آئے گی۔ وہ دور شروع ہوچکا ہے۔ دنیا کی سب سے اونچی عمارتیں، سب سے بڑے ڈیم، سب سے زیادہ فروخت ہونے والی فلمیں، اور جدید ترین سیل فون سبھی ریاستہائے متحدہ امریکہ سے باہر بنائے جارہے ہیں۔ یہ اقتصادی ترقی سیاسی اعتماد، قومی فخر اور ممکنہ طور پر بین الاقوامی مسائل کو جنم دے رہی ہے۔

انہوں نے اپنی اس کتاب میں یہ سوالات اٹھائے ہیں کہ امریکہ کو اس تیزی سے بدلتی ہوئی بین الاقوامی آب و ہوا کو کس طرح سمجھنا اور ترقی کرنا چاہئے؟ نئے عالمی دور میں رہنے کا کیا مطلب ہے؟ فرید زکریا نے ان سوالات کے جوابات اپنی روایتی فصاحت، بصیرت اور تخیل سے اپنی اس نئی کتاب میں دیے ہیں۔

فرید زکریا The Post- American World میں یہ سب لکھتے ہیں اور امریکہ کے بعد کی دنیا پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ امریکہ غیر متعلق ہونے والا ہے، یا ثقافتی زوال میں چلا گیا ہے۔ اس کے بجائے، زکریا جو بحث کرتے ہیں اسے وہ "باقی طاقتوں کا عروج" کہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ امریکہ کم مسابقتی ہونے والا ہے بلکہ یہ ہے کہ دوسرے ممالک جیسے برازیل، روس، بھارت اور چین ترقی کر کے زیادہ خودمختار ہونے جارہے ہیں۔ امریکہ بعد میں بھی دنیا کا طاقتور ملک رہے گا لیکن وہ ان

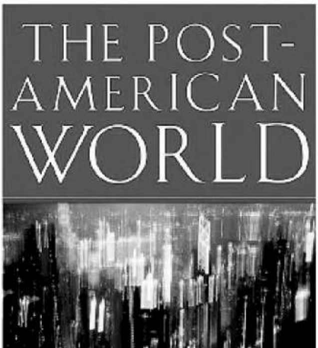


ابھرتی ہوئی طاقتوں کے مقابلے میں زیادہ طاقت کے استعمال کے قابل نہیں رہے گا۔

فرید زکریا کے تجزیے کے مطابق امریکہ کی سیاسی، معاشی اور عسکری طاقت دنیا کے لیے فائدہ مند رہی۔ فرید زکریا نے نوٹ کیا کہ

> **امریکہ حد سے زیادہ طاقت کا استعمال چھوڑ دے**

دہشت گردانہ حملوں کے بعد بھی امریکی معیشت تیزی سے واپس لوٹی۔ سیاسی کشمکش میں اضافہ ہوا جو استحکام کا اشارہ دیتا ہے۔

درحقیقت، حالیہ دہائیوں کے دوران، معیشت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے عالمی نیٹ ورک میں پروان چڑھی۔ تاہم، اس ترقی اور اس باہم روابط کے ساتھ بڑے خطرات بھی سامنے آئے۔ گزشتہ وبا کی طرح ایک نئی وبا کے پھیلنے کا امکان ماضی کی نسبت آج زیادہ ہے، اور مختلف قوموں کے دیوالیہ ہونے سے ایک سے زیادہ ممالک کی معیشتیں متاثر ہوں گی۔

امریکہ کو اس باہم مربوط دنیا کو استحکام فراہم کرنے کے لیے اپنی باقی ماندہ طاقت کا استعمال کرنا چاہیے۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اسے حد سے زیادہ "طاقت" کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ دنیا کی باقی طاقتوں کے عروج کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ کی سفارت کاری اب پہلے سے زیادہ نفیس ہونی چاہیے۔ اسے دنیا کے تنوع کو تسلیم کرنا چاہیے۔ فرید زکریا نے لکھا کہ امریکہ کو مغربی دنیا سمجھا جانا امریکہ کے حق میں نہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ مغرب کی ثقافت، نظریات اور فلسفہ ہزاروں سالوں سے موجود ہے۔ جبکہ جدید دنیا صرف چند صدیوں سے ہے۔ صنعت کاری کا تعلق جدیدیت سے ہے، مغرب سے نہیں۔ امریکی سفارت کاروں کے لیے اس امتیاز کو قبول کرنا مشکل ہوسکتا ہے، کیونکہ وہ اپنا منفرد راستہ اختیار کرنے کے عادی ہیں اور وہ اکثر جدیدیت کو "مغربی چہرہ" سمجھتے ہیں۔ مزید برآں، زکریا نے نوٹ کیا کہ امریکی طویل عرصے سے دوسرے ممالک سے الگ تھلگ رہے ہیں اور اکثر دنیا کی زبان، ثقافت اور سیاست کے تنوع سے نمٹنے کے لیے تیار نہیں رہے۔

باقیوں کے عروج میں نظر آنے والی ترقی کی مختلف مثالیں دینے کے لیے، زکریا نے چین کے عروج کو ہندوستان کے عروج سے متصادم قرار دیا۔ دونوں ممالک نے مختصر عرصے میں غیر معمولی اقتصادی ترقی کی ہے، لیکن وہ اب بھی ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ سیاسی طور پر، چین کے پاس ایک آمرانہ مرکزی اختیار ہے جبکہ ہندوستان

میں متنوع جمہوری حکومت ہے۔ مزید یہ کہ دونوں ممالک کے سیاسی مقاصد بالکل مختلف ہیں۔ چین کے اہداف ترقی پر مرکوز ہیں لیکن تائیوان اور تبت کے گرد گھومتے ہوئے خودمختاری کے مسائل بھی

**آئندہ طاقت ور۔ چین۔ بھارت۔ برازیل اور روس ہوں گے**

شامل ہیں۔ دریں اثنا، نسبتاً حالیہ جوہری طاقت کے طور پر ہندوستان کی حیثیت اسے سیاسی طور پر چین سے ممتاز کرتی ہے۔ زکریا نے خبردار کیا کہ امریکہ کو محتاط رہنا چاہیے کہ وہ دونوں ممالک کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کرتا ہے، حالانکہ ضروری نہیں کہ

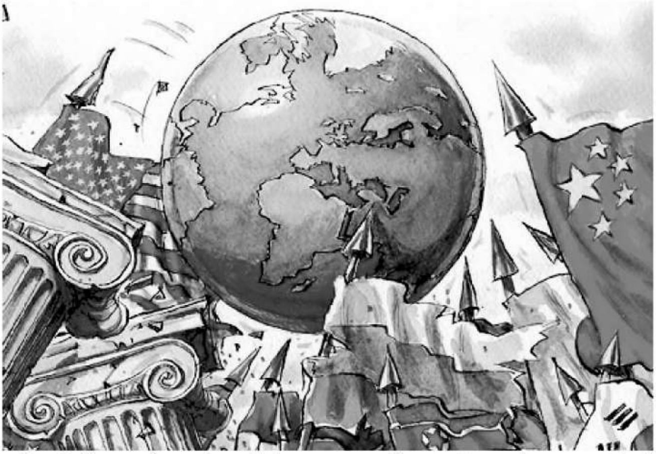

انہیں ایک دوسرے کا یا امریکہ کا حریف سمجھا جائے۔ اگرچہ دونوں سپر پاور بن سکتے ہیں، لیکن دونوں میں سے کوئی بھی فوری طور پر امریکہ جیسی طاقت نہیں بن سکے گا۔ اگرچہ دونوں تیزی سے ترقی کر رہے ہیں، لیکن امریکہ کے پاس بہت سے ایسے وسائل ہیں جنہیں نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ فرید زکریا نے مشورہ دیا کہ امریکہ دنیا

**صرف دولت ہی طاقت کا ذریعہ نہیں ہے**

کی سب سے بڑی طاقت کا تصور پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دنیا کی سب سے بہترین یونیورسٹیاں امریکہ میں ہیں۔ وہ مزید تجویز کرتا ہے کہ ہائی اسکول کی سطح پر امریکی عوامی تعلیم درحقیقت بہت سے لوگوں کے تصور سے زیادہ مسابقتی ہے۔

فرید ذکریا مزید لکھتے ہیں کہ کیا چیز امیر قوموں کو بڑی طاقتوں میں بدل دیتی ہے؟ امیر ممالک بیرون ملک اپنا اثر ورسوخ کیسے بڑھانا شروع کرتے ہیں؟ یہ سوالات بین الاقوامی سیاست میں عدم استحکام کے اہم ترین ذرائع میں سے ایک کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہیں یعنی ایک نئی طاقت کا ظہور کیسے ہوتا ہے؟ فرام ویلتھ ٹو پاور میں، فرید زکریا نے ریاستہائے متحدہ کی جدید تاریخ میں ابھرتی ہوئی طاقت کے سب سے پریشان کن معاملے کا جائزہ لیا تھا۔ اس کتاب میں انہوں نے ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔

فرید زکریا نے سوال کیا کہ اگر امیر قومیں معمول کے مطابق بڑی طاقتیں بن جاتی ہیں، تو پھر ہم انیسویں صدی کے آخر میں امریکہ کی عجیب غیر فعالیت کی وضاحت کیسے کریں گے؟ 1885 تک امریکہ دنیا کا امیر ترین ملک تھا۔ لیکن پھر بھی امریکہ تمام فوجی، سیاسی اور سفارتی اقدامات کے باوجود ایک معمولی طاقت تھا۔ اس تضاد کی وضاحت کے لیے، زکریا نے 1865 اور 1908 کے درمیان مختلف قسم کے معاملات کا حوالہ دیا جب امریکہ نے کنیڈا، ڈومینیکن ریپبلک اور آئس لینڈ جیسے متنوع مقامات پر اپنا اثر ورسوخ بڑھانے پر غور کیا تھا۔ بین الاقوامی تعلقات کے حقیقت پسندانہ نظریہ سے مطابقت رکھتے ہوئے، وہ استدلال کرتے ہیں کہ صدر اوران کی انتظامیہ نے بیرون ملک امریکی سیاسی اثر ورسوخ کو بڑھانے کی کوشش کی جب انہوں نے ملک کی معاشی طاقت میں اضافہ دیکھا۔ لیکن اس وقت امریکی انتظامیہ کو اکثر توسیع کے اپنے منصوبوں کو کم کرنا پڑتا تھا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ امریکہ کے پاس ایک مضبوط مرکزی حکومت کی کمی تھی جو اس اقتصادی طاقت کو خارجہ پالیسی کے مقاصد کے لیے استعمال کر سکے۔ امریکہ کمزور ریاست کے ساتھ ایک غیر معمولی طاقت اور ایک مضبوط ملک تھا۔ یہ صدی کے آخر تک نہیں ہوسکا، جب تک اقتدار ریاستوں سے وفاقی حکومت اور قانون ساز سے ایگزیکٹو برانچ میں منتقل نہ ہوگیا۔ اس کے بعد ہی واشنگٹن میں امریکی قیادت بین الاقوامی اثر ورسوخ کے لیے ملک کے وسائل کو متحرک کرنے میں کامیاب ہوسکی۔ قومی طاقت اور ریاستی ڈھانچے کے درمیان اس تناؤ کے بارے میں فرید زکریا کی اس تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ہم نئی طاقتوں کے ظہور کو کیسے دیکھتے ہیں اور امریکہ کی غیر معمولی تاریخ کے بارے میں ہماری سمجھ مزید گہری ہوتی ہے۔ ❁

## مصنف کے بارے میں:

فرید رفیق زکریا ایک بھارتی نژاد امریکی صحافی، سیاسی مبصر، اور مصنف ہیں۔ وہ ’’CNN کے فرید زکریا GPS‘‘ کے میزبان ہیں اور واشنگٹن پوسٹ کے لیے ہفتہ وار کالم لکھتے ہیں۔ وہ نیوز ویک کے کالم نگار، نیوز ویک انٹرنیشنل کے ایڈیٹر اور ٹائم کے بڑے ایڈیٹر رہے ہیں۔ پیدائش: 20 جنوری 1964، ممبئی، بھارت۔ تعلیم: ییل یونیورسٹی (بی اے)، ہارورڈ یونیورسٹی (ایم اے، پی ایچ ڈی) پیشے کے اعتبار سے صحافی، مصنف، سیاسی مبصر، CNN کے قابل ذکر میزبان، ’’فرید زکریا GPS، میزبان (2008 تا حال)‘‘۔ TIME، معاون ایڈیٹر (2010-2014)، نیوز ویک انٹرنیشنل، ایڈیٹر (2000-2010)، فارن ایکسچینج، میزبان (2005-2007)، خارجہ امور، سابق مینجنگ ایڈیٹر۔ خاندان: شریک حیات پاؤلا تھروکمورٹن، (1997؛ علیحدگی 2018)، بچے تین عدد، بھارت سے پدم بھوشن ایوارڈز (2010) فرید زکریا کی پیدائش ممبئی، ہندوستان میں ایک کونکنی مسلمان گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد، رفیق زکریا (1920-2005)، انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ ایک سیاست دان اور ایک اسلامی عالم تھے۔ ان کی والدہ، فاطمہ زکریا (1936-2021)، ان کے والد کی دوسری بیوی، اور ایک وقت کے لیے سنڈے ٹائمز آف انڈیا کی ایڈیٹر تھیں۔ وہ COVID-19 وبائی مرض کے دوران فوت ہوگئیں۔

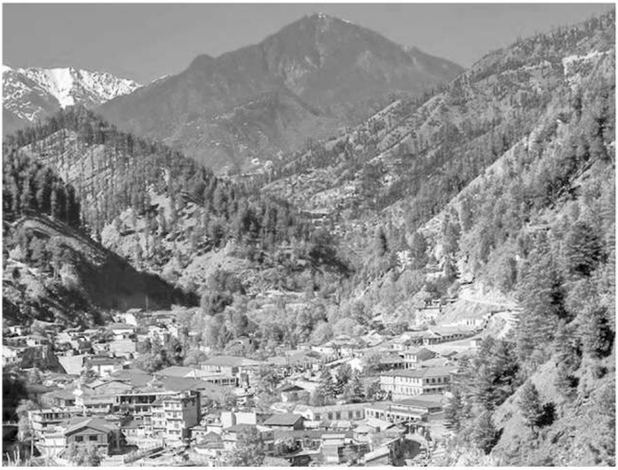

"پاکستان میں عمدہ شاہراہیں بننے کے بعد سڑک سے اپنا ملک دیکھنے کا رواج بڑھ گیا ہے۔ 'چھٹیاں نمبر' کے لیے ہماری درخواست پر غزالہ خالد اپنی ایک شگفتہ شگفتہ تحریر ارسال کر رہی ہیں۔ یہ ان کی مقبول تصنیف 'اَن کہی' کا بھی حصہ ہے۔ غزالہ خالد پاکستان سے پاکستانیوں سے محبت کرتی ہیں۔ ہر شہر کو اثاثہ سمجھتی ہیں۔ اس لیے ان کی تحریر میں ایسی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے کہ بس پڑھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔"

# ارزاں چرگاں، اسلام آباد سے سوات تک

تحریر: غزالہ خالد

میرے مضمون کا عنوان "ارزاں چرگاں" پختون و ذہین لوگوں کو تو فوراً سمجھ میں آجائے گا لیکن شاید میرے جیسے کم علموں کو اسے سمجھنے کے لیے کچھ سوچ بچار کرنی پڑے۔

سفر مجھے اسی لیے بہت پسند ہے کہ بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے جس میں مختلف علاقوں میں بولے جانے والے کچھ خاص الفاظ بھی ہوتے ہیں اور اپنے ملک کی ہر چیز کی طرح ان الفاظ سے بھی محبت محسوس ہوتی ہے۔

گھریلو زمہ داریوں خصوصاً بچوں کی تعلیم کی وجہ سے اپنا ملک ہی پورا نہیں دیکھ سکے کیونکہ ہماری پہلی ترجیح یہی تھی کہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی جائے، جب تک تینوں بچے اسکول میں تھے تو گرمیوں اور سردیوں کی چھٹیاں ساتھ مل جاتی تھیں اور ہم دو تین سال میں ایک بار پنجاب کا چکر لگا لیا کرتے تھے اور مری اسلام آباد تو چلے ہی جاتے تھے لیکن جب بچے بڑے ہو گئے تو گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا، کسی کا اسکول کسی کا کالج اور پھر یونیورسٹی کے داخلوں کی تیاری وغیرہ وغیرہ نے اتنا مصروف رکھا کہ گھومنے پھرنے کا خیال ہی نہیں آتا تھا اب الحمدللہ ہم اپنی ذمہ داریوں سے کسی حد تک فارغ ہوئے تو پاکستان کی سیر کو نکل جاتے ہیں بھلا ہو ان پیارے رشتے داروں کا کہ جن کے بچوں کی شادی میں شرکت بھی اس گھومنے پھرنے کا بہانہ بنتی ہے۔

پچھلی بار لاہور کی سیر سے واپس آکر میں نے اپنے مشاہدے پر ایک مضمون "میرا بے ترتیب شہر کراچی" لکھا تھا میرے قارئین نے پسند بھی کیا تو سوچا سوات کی کہانی تو ضرور لکھنی چاہیے۔

اس بار اسلام آباد جانا ہوا تو وہاں سے پاکستان کا سوئٹزرلینڈ کہلانے والی وادی سوات جانے کا پروگرام بن گیا پتہ چلا کہ اسلام آباد سے سوات تک Daewoo بس سروس کے ذریعے یہ سفر کافی آسان ہو گیا ہے۔ اسلام آباد سے سوات کا فاصلہ 201 کلومیٹر یا 125.3 میل ہے لیکن اونچائی پر ہونے کی وجہ سے بس میں وہاں پہنچنے میں تقریباً پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے لگ جاتے ہیں اگر کار سے جائیں تو یہ سفر چار گھنٹے کا ہے۔ میرے دل پر راستے کا خوف بھی تھا کہ نجانے کتنا خطرناک ہو گا لیکن جب سفر شروع ہوا تو ہماری بس اسلام آباد سے نکل کر کچھ دیر موٹروے پر ہی چلی اور پھر چھوٹے چھوٹے شہروں سے گذرتی ہوئی سوات کی طرف رواں دواں ہو گئی۔

ان چھوٹے چھوٹے شہروں کے بیچ سے گذرنا جن کے نام ہم بچپن سے سنتے آئے تھے بہت ہی اچھا لگا۔ اسلام آباد تو صاف تھا ہی لیکن خیبر پختونخوا کی بہترین سڑکیں اور صاف ستھرے راستے بہت اچھے لگ رہے تھے حالیہ بارشوں کے بعد کراچی مزید اتنا

**قدم قدم پر اسکول جاتے بچے بچیاں**

گندا ہو چکا ہے کہ کراچی والوں کو صاف ستھرے راستے اور بہترین سڑکیں دیکھ کر عجیب سا لگتا ہے۔ خیر تو بات ہو رہی تھی مانوس ناموں والے شہروں کی جن کے درمیان سے گذر کر ہمارا سفر جاری تھا۔

راستے میں آنے والے خیبر پختونخوا کے ان چھوٹے شہروں کے نام ہم زیادہ تر الیکشن کے نتائج کے وقت ہی سنتے ہیں، رشہ گیی، بٹ خیلہ، مردان کے بازاروں کے بیچ سے ہماری بس گذرتی رہی اور میری نظریں کھڑکی کے باہر جمی رہیں، کھڑکی سے باہر وہاں کے لوگ، خواتین، بچے، گلیاں، دکانیں دیکھنا اچھا لگ رہا

تھا۔

دکانوں کے نام پڑھنا بھی میرا ایک دلچسپ مشغلہ ہے کسی اور شہر میں" کراچی بریانی" بکتے ہوئے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ ہمارے پچھلی بار کے ٹور میں ہم نے پشاور میں ایک آیس کریم کی دکان پر" کراچی کی اصلی پشاوری آئسکریم"لکھا دیکھ کر بہت انجوائے کیا تھا۔" چرسی تکہ" ہر شہر میں دستیاب تھا پتہ چلا کہ یہ پشاور سے مشہور ہوا ہے جہاں کسی ہوٹل کے مزیدار تکے کھانے ڈرائیور حضرات جاتے تھے اور وہاں بیٹھ کر چرس بھی پیتے تھے یوں تکہ" چرسی تکہ" کہلانے لگا اور پھر پورے پاکستان میں" چرسی تکہ" بکنے لگا۔

میری نظریں تیزی سے گذرتے دکانوں کے بورڈز پڑھنے میں مصروف تھیں کہ اچانک "ارزاں چرگاں" پر نظر پڑی بہت دلچسپ لفظ لگا بس تیزی سے آگے بڑھ گئی کچھ پتہ نہیں چلا کہ یہ کس چیز کی دکان تھی لفظ ایسا تھا کہ ذہن سے چپک گیا، کیا ہوسکتا ہے؟ دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا" ارزاں"کا مطلب کم قدر، کم قیمت سمجھ میں آ گیا کچھ اشعار بھی یاد آ گئے مثلاً

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت

لیکن یہ" چرگاں" کیا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا اچانک ایک اور بازار شروع ہو گیا اور میں نے پوری توجہ سے دوبارہ دکانوں کے بورڈز پڑھنے شروع کر دیئے بلکہ اس بار موبائل سے وڈیو بھی بنالی کہ کہیں نظر چوک گئی تو وڈیو دیکھ لوں گی کہ آخر" ارزاں چرگاں" میں کیا بکتا ہے؟ لیکن اس بار مشکل نہیں ہوئی رشہ گئی، مردان، تخت بائی، درگئی میں بار بار یہ بورڈ نظر آئے ساتھ ہی انگریزی میں سیل، سیل، سیل بھی لکھا دیکھا تو پتہ چلا کہ فارمی مرغیاں بک رہی ہیں یعنی" ارزاں چرگاں" کا مطلب" سستی مرغی" ہے۔ اف ساری چوکسی ختم ہوگئی ہنسی آنے لگی چرغہ یاد آ گیا اب پتہ چلا اسے چرغہ کیوں کہتے ہیں، جیسے آجکل کے انگلش میڈیم بچے" غ" کو" گ" کہتے ہیں اسی طرح شاید" چرغہ"" چرگاں" میں تبدیل ہو گیا ہو گا یا" چرگاں" پنجاب پہنچ کر" چرغہ" بن گیا ہو گا، میں نے سوچا کہ چلو علم میں اضافہ ہی ہوا اور ہم آگے بڑھ گئے، کیا پتہ تھا کہ یہ لفظ ایسے پیچھا چھوڑنے والا نہیں آگے جا کر پتہ نہیں کہاں کہاں یاد آئے گا۔

**سوات کے لوگ ہم مہمانوں سے بہت عزت سے بات کر رہے تھے**

بس سوات کی طرف رواں دواں تھی روڈ بہت اچھی ہے اور اسلام آباد سے سوات تک ایک نئی روڈ بھی تکمیل کے آخری مراحل میں ہے جس سے گاڑی میں اسلام آباد سے سوات کا راستہ ڈھائی گھنٹے میں طے ہو جایا کرے گا، کچھ دیر کا گہری کھائیوں والا خطرناک سا راستہ آیا اور پھر مالاکنڈ ڈویژن شروع ہو گیا اب مرغی کی دکانوں پر" ارزاں چرگاں" نہیں لکھا تھا" فارمی مرغی دستیاب ہے" کے بورڈ ہی نظر آ رہے تھے۔ جگہ جگہ اسکول کے بچے چھٹی کے بعد گھروں کو واپس جاتے نظر آئے صاف ستھرے روشن چہروں والے بچے سفید یا کیمل کلر شلوار قمیض میں ملبوس تھے ان بچوں کو دیکھ کر نجانے کیوں" ملالہ یوسف زئی" یاد آ گئی۔

دوپہر کا وقت تھا سوات تک پہنچتے پہنچتے اسکول و کالج کے طالب علم نظر آتے رہے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ سوات میں بچوں اور بچیوں کو اسکول بھیجنے کا رواج ہے۔ لگتا تھا ہر بچہ اسکول جاتا ہے سندھ کی طرح اسکولوں میں بھینسیں بندھی نظر نہیں آئیں۔ صاف ستھرے چھوٹے بڑے اسکول اور پہاڑوں کی پگڈنڈیوں سے اوپر چڑھ کر اپنے اپنے گھروں کو جاتے پیارے پیارے بچے اور بچیوں کو دیکھ کر بہت ہی اچھا لگ رہا تھا یہ خیال بھی آیا کہ سوات اب تک پوری دنیا میں بدنام ہے کہ وہاں تعلیم حاصل نہیں کرنے دی جاتی اور میں نے پوری وادی میں قدم قدم پر اسکول و کالج یہاں تک کہ نرسنگ اسکول بھی دیکھے اور سب سے بڑھ کر طالب علموں کو دیکھا جو الحمدللہ وہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور یہ سب آپریشن راہ حق کے بعد ہی ممکن ہوسکا ہے۔

بس اور آگے بڑھی اور مینگورہ پہنچ گئی، میں حیران رہ گئی یہ سوات ہے؟

میرے ذہن میں مینگورہ اور سیدو شریف کا تصور ایک پہاڑی گاؤں کا سا تھا۔ یہی تصور تھا کہ پہاڑوں کے بیچ چھوٹے چھوٹے کچے گھر ہونگے اور زندگی کی بنیادی ضروریات مشکل سے میسر ہوتی ہونگی کچھ" ملالہ یوسف زئی" کے پیش کردہ سوات کا تصور بھی تھا کہ اسکول ناپید ہونگے لوگ جاہل ہونگے اور پہاڑوں پر لوگ ایک مشکل زندگی گزارتے ہونگے لیکن ایک خوبصورت شہر جو جدید سہولتوں سے آراستہ تھا میرے سامنے تھا۔

بس سے اتر کر گاڑی جب ہوٹل کی طرف بڑھی تو ایک بازار سے بھی گذری، مین بازار سے پہلے چھوٹے چھوٹے شاپنگ مال تھے جن میں تقریباً تمام مشہور برانڈز کی دکانیں موجود تھیں۔ مین بازار تقریباً ویسا ہی تھا جیسا ہر شہر میں ہوتا ہے ہم نے بازار میں

تھوڑی دیر رک کر کچھ ضروری چیزیں جو ساتھ لیجانا بھول گئے تھے خریدیں تو سوات کے لوگوں سے پہلی بار بات چیت کا موقع ملا دکاندار نہایت عزت و احترام سے بات کر رہے تھے ہمیں مہمان کہہ رہے تھے اور مہمانوں کی طرح ہی عزت کر رہے تھے سوات کے لوگوں کا یہی رویہ ہم نے مینگورہ، سیدوشریف، مدین، بحرین اور کالام میں بھی دیکھا۔

بازار میں دو چیزیں بہت کم نظر آئیں

1۔عورت اور 2۔ پینٹ شرٹ۔

سینکڑوں مردوں میں کوئی دو چار عورتیں نظر آرہی تھیں شاید تعلیم یافتہ خواتین ان چھوٹے شاپنگ مالز سے خریداری کرتی ہونگی جو ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے اور کم تعلیم یافتہ خواتین کی ضرورت کی چیزیں ان کے مرد ہی لا دیتے ہونگے وجہ کچھ بھی ہو اندازہ ہوا کہ عورتوں کے باہر نکلنے کا رواج بہت کم ہے لیکن بچیاں اسکول جاتی ہیں یہ بات خوش آئند ہے۔

پینٹ شرٹ پہنے جو بھی نظر آیا وہ مہمان تھا یعنی باہر سے آیا ہوا سیاح تھا وہاں کے لوگ شلوار قمیض میں ہی دکھائی دیتے ہیں جو زیادہ تر سفید ہوتے ہیں۔ دو چار دن رہنے کے بعد ایک دلچسپ مشاہدہ یہ بھی ہوا کہ تقریباً ساٹھ سال کی عمر کے بعد وہاں کے سب لوگ ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ ایک جیسی سفید داڑھیاں، ایک جیسی سفید ٹوپیاں، ایک جیسے شلوار قمیض جو عموماً سفید ہوتے ہیں اور تقریباً ایک جیسا قد و قامت، ایسا لگتا ہے کہ جیسے بہت سے جڑواں بھائی وادی میں گھوم پھر رہے ہیں۔

پوری وادی سوات میں دریا آپ کے ساتھ ساتھ رہتا ہے ہم مینگورہ کے بانی پاس پر جس ہوٹل میں ٹھہرے اس کے بالکل سامنے بھی دریا رواں دواں تھا ہماری بالکونی سے ہم نے دیکھا کہ سوزوکی سے چھوٹی چھوٹی بوریاں اتاری جارہی ہیں اور بہت سے آدمی بڑی بڑی چھلنیاں پکڑے دریا کے کنارے بیٹھے کچھ دھونے میں مصروف ہیں میرے میاں نے ہوٹل بوائے سے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ تو اس نے بتایا کہ یہ زمرد دھو رہے ہیں۔ یہاں قیمتی پتھر بہت ملتا ہے لوگ اسے نکال کر لاتے ہیں اور دریا کے پانی سے دھو کر صاف کرتے ہیں کبھی کبھار کسی کو ہیرا بھی مل جاتا ہے یہ سنکر مجھے اشتیاق ہوا کہ ہم قریب جا کر دیکھیں کہ کیا ہو رہا ہے جب ہم نے قریب جا کر دیکھا تو جو لوگ پتھروں کو دھو چکے تھے وہ نظر آگئے باقی لوگ دریا کی طرف منہ

> **دو چیزیں بہت کم نظر آئیں۔**
> **عورت اور پینٹ شرٹ**

کئے پتھروں کو دھونے میں مصروف تھے اور جو پتھر دھل چکے تھے ان کو دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تقریباً آدھے میٹر کی چھلنی میں ہرے ہرے زمرد جگمگا رہے تھے اور وہاں ایسی دسیوں چھلنیاں موجود تھیں مجھے اپنے سنار کے پاس دیکھی ایک زمرد لگی انگوٹھی یاد آگئی جس کی قیمت ہزاروں میں تھی اور اتنے ڈھیر زمرد وہ بھی اصلی، میں حیران رہ گئی اور نہ جانے کیوں میرے ذہن میں آیا کہ ہیں! زمرد ہیں یا ''ارزاں چرگاں''۔

''ارزاں چرگاں'' کا ایسا استعمال خود بخود ہوا اور بعد میں بھی ہوتا رہا۔

ہم نے ایک گاڑی کرانے پر کرلی تھی جس کا ڈرائیور بہت ہی اچھا آدمی تھا وہ ہمیں سیر بھی کروا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گائیڈ کے فرائض بھی انجام دیے رہا تھا اس نے مرغزار میں واقع "سفید محل" بھی دکھایا جو والیءسوات نے بنوایا تھا وہاں خوبصورت پھول اور اخروٹ اور جاپانی پھل سے لدے ہوئے بے شمار درخت تھے۔ واپسی میں اس نے مینگورہ اور سیدوشریف کی سیر کروائی اور ملالہ کا محلہ بھی دکھایا جس کی کسی گلی میں ان کا گھر تھا۔

پورے سوات میں ایک سے ایک شاندار گاڑیاں نظر آتی رہیں، میں نے سڑکوں کی وڈیو بنا کر اپنے بچوں کو بھیجی تو وہ حیران ہوئے کہ اتنی عالیشان گاڑیاں سڑکوں پر موجود ہیں جن میں پریمو، لینڈ کروزر، پراڈو، کرولا وغیرہ وغیرہ تھیں کہ ایسی مہنگی گاڑیاں ایک چھوٹے شہر میں کیسے نظر آرہی ہیں؟ ڈرائیور نے بتایا کہ یہ سب افغانستان سے اسمگل ہو کر آتی ہیں اور نان کسٹم پیڈ کہلاتی ہیں۔ ان گاڑیوں کو صرف مالاکنڈ ڈویژن میں چلایا جاسکتا ہے اگر اس سے آگے لے جائیں تو گاڑی بھی ضبط ہوگی۔ دو لاکھ جرمانہ بھی دینا ہوگا اور چھ ماہ قید بھی کاٹنا ہوگی۔

ڈرائیور تفصیلات بتاتے ہوئے بولا کہ یہ تمام گاڑیاں یہاں بہت ہی کم قیمت میں مل جاتی ہیں پریمو جیسی گاڑی جس کی قیمت تقریباً پچیس لاکھ ہے وہاں صرف چھ لاکھ میں ملتی ہے، پرانی کرولا صرف دو لاکھ میں مل جاتی ہے، اسی طرح پراڈو اور لینڈ کروزر چوتھائی قیمت میں خریدی جاسکتی ہیں میں ڈرائیور کی باتیں حیرت سے سنتے ہوئے باہر دوڑتی شاندار گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی اور پھر کھٹ سے وہی خیال آگیا کہ ہیں! گاڑیاں ہیں یا "ارزاں چرگاں"۔

## ''مینگورہ سے کالام تک''

مرغزار سے واپسی پر ہمارے ڈرائیور نے ہمیں مینگورہ اور سیدو شریف کی سیر کروائی والیءسوات کا گھر بھی باہر سے ہی دکھایا اور ملالہ یوسف زئی کا محلہ بھی دکھایا واپسی پر وہی شاندار گاڑیاں

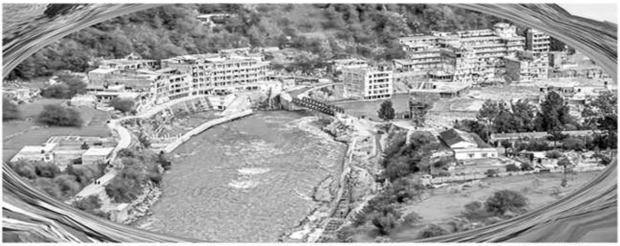

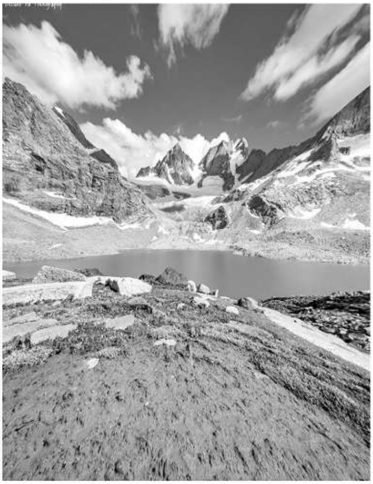

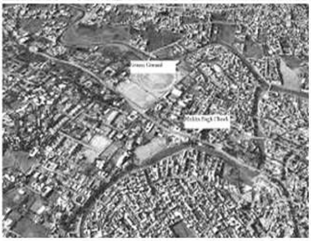

اور راستے دیکھتے دیکھتے ہم اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔

راستے بھر خیالات آتے رہے کہ کیسا اچھا شہر اور محبت سے ملنے والے لوگ ہیں ملالہ نے تو سوات کا ایک الگ ہی خوفناک سا تصور لوگوں میں پھیلا دیا تھا جو آج تک قائم ہے۔ میری یہ سوچ غلط تھی یہ مجھے دوسرے دن پتہ چل گیا، لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ آج کے پر امن سوات کو بھی دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔۔

ہوٹل پہنچ کر ہم نے کچھ دیر آرام کیا اور عشاء کے بعد کھانا کھانے کے لئے باہر نکلے۔ بای پاس روڈ پر لاین سے ہوٹل ہی ہوٹل تھے لیکن ہم جس ہوٹل میں بھی جاتے صرف مرد ہی مرد نظر آتے ان کے بیچ بیٹھنا عجیب لگتا میرے میاں نے پوچھا کہ فیملی ایریا ہے؟ تو ایک ہوٹل والے نے جواب دیا کہ" ہاں ہے" اور ہمیں لیکر بالکل اندھیرے میں دریا کے کنارے کی طرف چلا جہاں پانی کے پاس اندھیرے میں دو تین میزیں لگی تھیں جن میں سے ایک پر سفید بڑی چادروں میں منہ چھپائے ایک دو عورتیں بھی نظر آئیں۔ میں نے کہا،" ہرگز نہیں، میں یہاں نہیں بیٹھوں گی" میرا بڑا بیٹا بھی اس سفر میں ہمارے ساتھ تھا اس نے بھی کہا کہ "نہیں یہاں اندھیرے میں کیسے بیٹھ سکتے ہیں ایک دوسرے کی شکلیں تک تو نظر نہیں آ رہیں کھانا کیسے کھائیں گے" ویٹر کا نام "حضرت عمر" تھا جو ہمیں عجیب لگا لیکن بعد میں حضرت علی نام بھی سننے کو ملا خیر تو ویٹر ہمیں واپس اوپر لے گیا اور ایک اور اندھیری جگہ پر جھاڑیوں کے پیچھے میز لگا کر بٹھانے لگا،

لگ رہا تھا ہم کھانا کھانے نہیں بلکہ کوئی گناہ کرنے آئے ہیں۔

میرے میاں اور بیٹے نے کہا کہ بھائی ہم یہیں ایک سائیڈ کی میز پر بیٹھ جائیں گے تم جلدی سے کھانا لے آؤ۔ میں چادر اچھی طرح لپیٹ کر مردوں کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھی تب حضرت عمر کھانا لایا جو بہت ہی بدمزہ تھا بڑی مشکل سے کھانا کھایا اور واپس ہوٹل پہنچ گئے۔

آج کل سیزن نہیں تھا اس لیے یہ صورت حال تھی ورنہ سیزن کے دنوں میں سیاح خواتین بہت ہوتی ہیں اور عورتوں کو اتنی مشکل نہیں ہوتی۔

اگلے دن صبح ہی ہم کالام کے لئے روانہ ہوئے پہلے مدین پھر بحرین اور پھر کالام۔ سفر لمبا تھا مدین اور بحرین کے راستے میں

**بڑی بڑی چھلنیاں**
**زمرد ڈھل رہے تھے**

سیب اور آڑو کے پھلوں سے لدے ہوئے باغات تھے۔ ڈرائیور کی نظر میں ان کی اتنی اہمیت نہیں تھی کیونکہ وہ ان درختوں کو دیکھنے کا عادی تھا لیکن میں تو ان پھلوں سے لدے درختوں کو پہلی بار دیکھ رہی تھی میں نے اپنے بیٹے سے کہہ کر تھوڑی دیر کے لئے باغات کے پاس گاڑی رکوائی اور پھلوں سے لدے درختوں کو قریب سے دیکھا اور ان کے ساتھ تصویریں بھی کھنچوایں۔

مدین میں ٹراوٹ مچھلی کے بہت سے فارم ہیں لائن سے ہوٹل بنے ہیں جن میں وہ مچھلی کھائی جاتی ہے لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو صبح کے ساڑھے گیارہ بجے تھے دوپہر کے کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا اور ہمیں بھوک بھی نہیں لگ رہی تھی اس لیے فیصلہ ہوا کہ کھانا کالام پہنچ کر ہی کھایا جائے، ڈرائیور ہمارے اس فیصلے سے بہت خوش تھا کہ ہم یہاں ٹراوٹ نہیں کھا رہے اس کی نظر میں فارم کی مچھلی کی کوئی اہمیت نہیں تھی اس کا خیال تھا کہ ہمیں دریا کی ٹراوٹ کھانا چاہیے وہ زیادہ مزیدار ہوتی ہے۔

مدین سے بحرین کے بعد کالام تک کی روڈ زیر تعمیر ہے جس کی وجہ سے ہمیں کالام پہنچنے میں بہت دیر لگی یعنی مینگورہ سے کالام چار گھنٹے میں پہنچے لیکن راستے کے دلکش نظاروں نے اور ہمارے ڈرائیور کم گائیڈ نے بور نہیں ہونے دیا ایک آدھ جگہ چائے پینے اور خوبصورت پکنک پوائنٹ پر بھی رکے۔

راستہ چونکہ لمبا تھا اس لیے ڈرائیور باتیں کرتا رہا اور 2007 سے پہلے کے سوات کے بارے میں اس نے جو کچھ بتایا اس سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے، ملالہ جو لکھتی تھی وہ لفظ بہ لفظ صحیح تھا لیکن ڈرائیور کے بقول طالبان صرف لڑکیوں کے ہی نہیں لڑکوں کی تعلیم کے بھی خلاف تھے اسکول جانے والے بچوں کو واپس بھیج دیا کرتے تھے اور لڑکوں کے اسکولوں کو بھی بموں سے اڑا دیتے تھے۔ ہمارا ڈرائیور خود بھی سوات کچہری بم دھماکے میں زخمی ہو چکا تھا جس میں ستر یا اسی افراد جاں بحق ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ہم نے مینگورہ کے چوک پر اپنی آنکھوں سے ان افراد کی کھوپڑیاں لٹکتی دیکھی ہیں جو طالبان کی بات نہیں مانتے تھے۔ وہ لوگ ایسے ظالم تھے کہ انسانی جان لینا ان کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مینگورہ کے ایک پل پر سے گذرتے ہوئے اس نے بتایا تھا کہ پل کے شروع میں طالبان چارپائی ڈالے بیٹھے ہوتے تھے ہر گذرنے والے کو اس چارپائی پر پیسے لازمی ڈالنا ہوتے تھے جو نہیں ڈالتا تھا پل کے دوسری طرف بیٹھے طالبان اسے سخت سے سخت سزا دیتے تھے کیونکہ انہیں واکی ٹاکی پر اطلاع دے دی جاتی تھی کہ یہ گاڑی بغیر پیسے دیے گذری ہے۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار لرزہ خیز واقعات تھے انسانی جان کی ایسی بے قدری تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہی خیال آ گیا کہ انسانی جان تھی یا

''ارزاں چرگاں''!

سوات کے لوگوں نے بہت قربانیاں دی ہیں۔ بڑا مشکل وقت گذارا ہے۔ آپریشن راہ حق کے وقت پورا سوات خالی کروالیا گیا تھا لوگوں نے مہینوں اپنا گھر بار چھوڑ کر اپنی وادی کو دہشت گردوں سے پاک کروایا۔

ایک بات ہم نے یہ محسوس کی کہ وہاں لوگ ملالہ یوسف زئی کو زیادہ پسند نہیں کرتے جن لوگوں سے بھی ہماری تھوڑی بہت بات چیت ہوئی سب کے لہجوں میں ملالہ اور ان کے والد کے لئے شکوک وشبہات تھے۔ سب کو ان بچیوں سے ہمدردی تھی جو ملالہ کے ساتھ زخمی ہوئی تھیں حالانکہ طالبان کے ظلم وبربریت کے وہ سب گواہ تھے لیکن ان کی اس سوچ کی نجانے کیا وجہ ہے۔ بہرحال یہ ایک الگ ہی بحث چھڑ جائے گی۔

زندگی کے ساتھ موت بھی ہے راستے میں پہاڑوں پر جگہ جگہ قبرستان نظر آئے جن کی عجیب بات یہ تھی کہ کسی کسی قبر پر لکڑی کے ڈولی نما فریم رکھے تھے ڈرائیور نے بتایا کہ کوہستانی لوگ پرانے کیلاش کے لوگوں کی طرح اپنے مردوں کو دفناتے نہیں تھے بلکہ لکڑی کی ڈولیوں میں ایسے ہی کھلا رکھ دیتے تھے لیکن اب مذہب کو جاننے کے بعد دفنانے لگے ہیں۔ اب تو کیلاش میں بھی لوگ مردوں کو دفناتے ہیں۔

ٹوٹے پھوٹے روڈ سے گذر کر ہم کالام پہنچ گئے تھے، مناظر اور بھی دلکش ہو گئے تھے ایک ہوٹل سے ہم نے تازہ تازہ گرما گرم ٹراؤٹ مچھلی بھی کھائی جو 22 سو روپے کلو اور بہت ہی مزیدار تھی۔

ایک مناسب سا ہوٹل دیکھ کر کمرہ لیا کچھ دیر آرام کیا اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر نکل گئے۔ ڈرائیور نے کہا کہ پہلے ہم جنگل دیکھنے جائیں گے، نام سنکر گھنے جنگل اور جنگلی جانوروں کا خیال آیا لیکن جب جنگل پہنچے تو وہ تو "جنگل میں منگل" تھا۔ وہاں تاحدِ نگاہ صرف اونچے اونچے تنوں والے ہزاروں درخت تھے کسی بھی فلم کے لیے زبردست لوکیشن تھی اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے ابھی ہیرو ہیروئن۔

''یہ وادیاں یہ پربتوں کی شہزادیاں''

گاتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے نمودار ہو جائیں گے۔

میرے میاں نے بتایا کہ ان درختوں کی لکڑی بہت مضبوط اور کام کی ہوتی ہے۔ ان کے یہ کہتے ہی میرے ذہن میں پھر وہی خیال آیا کہ اتنے کام کے درخت اور وہ بھی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں! یہ تو ''ارزاں چرگاں'' ہو گیا۔ لیکن واپسی کے سفر میں ڈرائیور نے بتایا کہ یہ "دیار" کے درخت کہلانے ہیں اور ان کی لکڑی چار ہزار روپے فٹ بکتی ہے۔ اف سنکر دماغ چکرا گیا لکڑی کی قیمت اور درختوں کی تعداد سر چکرانے کے لئے کافی تھی۔

جنگل سے نکل کر ہمارا سفر پھر شروع ہوا کالام میں زیادہ تر سڑکوں کی حالت ٹھیک نہیں دل ودماغ ہچکولے کھانے لگتے ہیں۔ ایک بازار سے بھی گذرے جہاں ایک دکان کے باہر بورڈ لگا تھا کہ ''یہاں گندم کا آٹا دستیاب ہے" پتہ چلا کہ یہاں رہنے والے لوگ جو کوہستانی کہلاتے ہیں مکئی کی روٹی کھاتے ہیں اس لئے گندم کا آٹا کہیں کہیں ملتا ہے۔

اب ہماری اگلی منزل" چارپائی ہوٹل" تھا مختلف راستوں چڑھائیوں، اترائیوں اور پھسلنیوں کے بعد ہم دریا کنارے ایک ڈھابے نما ہوٹل پہنچ گئے جہاں دریا کنارے

**نان کسٹم پیڈ۔ مہنگی گاڑیاں**
**جو صرف وہیں چل سکتی ہیں**

پانی میں چارپائیاں ڈال کر مہمانوں کو بٹھانے کا انتظام تھا میں بڑے شوق سے چارپائی پر بیٹھی اور جوتے اتار کر پیر پانی میں ڈالے جو فوراً ہی نکالنے پڑے کیونکہ پانی برف کی طرح سرد تھا، دریا ہر جگہ بہت تیز بہتا ہے ہم نے وہاں شام کی چائے پی اور مغرب کی اذان سنی بہت ہی خوبصورت منظر تھا۔ دریا کا کنارہ، ٹھنڈی ہوا، اذان کی آواز اور دریا کے سامنے والے کنارے پر موجود ہوٹلز کی خوبصورت لائٹیں۔

نماز ہم نے ہوٹل میں آکر پڑھی اس کے بعد کالام کے مال روڈ سے کچھ شاپنگ کی۔ دکاندار بہت ہی عزت واحترام سے پیش آئے اور چیزوں کی قیمتیں بھی بہت مناسب تھیں بلکہ مقیش یا کامدانی کے سوٹوں کی قیمت سنکر ایک بار پھر ''ارزاں چرگاں" کا خیال آ گیا تھا کیونکہ کراچی میں یہ بہت مہنگے ہوتے ہیں۔

رات کو ذرا ٹھنڈ ہو گئی تھی وہاں ہوٹلوں میں پنکھے نہیں تھے کیونکہ

**پھلوں سے لدے**
**درخت۔ جی خوش ہوا**

ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ رات کو شاید تھکن سے میری طبیعت کچھ خراب ہو گئی پہاڑی علاقے ویسے بھی رات کو کچھ اور ہی منظر پیش کرتے ہیں، پرسکون کے ساتھ ساتھ خاموش، اداس اور کچھ کچھ ڈراؤنے بھی، مجھے لیٹے لیٹے خیال آیا کہ "اگر میری طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو یہاں سے اسلام آباد جانے میں ہی دس بارہ گھنٹے لگ جائیں گے" یہ سوچ بھی طبیعت خراب کرنے کو کافی تھی لیکن اللہ کا شکر ہے نیند آ گئی اور الحمدللہ کہ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے "بلیوواٹر پوائنٹ" جانے کے لئے تیار تھی۔ ایک بار پھر گاڑی میں بیٹھے اور دھڑ دھڑاتے ہوئے بلیوواٹر کی جانب روانہ ہو گئے، ایک گھنٹے کا راستہ تھا اور سڑک کا نام ونشان نہیں تھا صرف پتھروں پر گاڑی چل رہی تھی اور شاباش ہے ڈرائیور پر کہ وہ چلا رہا تھا۔

لیکن جب بلیو واٹر پہنچے تو ساری تھکن دور ہو گئی بہت ہی خوبصورت جگہ تھی پانی کی لہریں کچھ اس طرح بہہ رہی تھیں کہ پانی کا رنگ نیلا نیلا لگ رہا تھا اسی لئے اسے بلیوواٹر کا نام دیا گیا ہے سامنے گھنا جنگل تھا جس میں جنگلی جانور ریچھ ٹائیگر وغیرہ بھی ہوتے ہیں، ویاں ہوا اتنی سرد تھی کہ سردی کا احساس ہو رہا تھا ہمیں آج ہی اسلام آباد واپس جانا تھا اس لئے جلد ہی ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔

اس پورے سفر میں ہم نے پہاڑوں پر بکروں کے ریوڑ بھی جگہ جگہ دیکھے جن کے ساتھ کرخت چہروں والے چرواہے بھی تھے معلوم ہوا کہ یہ چرواہے "بکروال" کہلاتے ہیں اور ساری زندگی یہ لوگ گاڑی میں نہیں بیٹھتے بلکہ پیدل سفر کرتے ہیں ان کے رہن سہن پر بھی پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

دوبارہ کالام سے زیر تعمیر روڈ پر تھکا دینے والا سفر کرتے ہم مینگورہ کے بس اسٹاپ تک پہنچ گئے لیکن یہ تھکا دینے والا سفر ایسا تھا جس میں جسم تھک رہا تھا اور ذہن فریش ہو رہا تھا۔ میں تو واپسی کے سفر میں بھی مستقل کھڑکی سے باہر مشاہدات میں مصروف رہی۔ ہمارا ملک بہت خوبصورت ہے کاش کہ حکومت پاکستان کو بھی خیال آئے کہ سیاحت کے فروغ کے لئے ایسے اقدامات کئے جائیں جس سے لوگوں کو آسانیاں ملیں۔

آپ لوگوں کو بھی میں مشورہ دونگی کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے وسائل دیے ہیں وہ ضرور اپنے ملک کی سیر کرے، بچوں کو بھی لیکر جائیں کیونکہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس طرح کی سیر وتفریح سے وطن سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

آخر میں بتادوں کہ وہاں آخری بار "ارزاں چرگاں" کب یاد آیا لیکن اس سے پہلے یہ بھی ضرور کہوں گی کہ عورت کے پردے کی میں دل سے حامی ہوں لیکن یہ منظر جو میں بتانے جا رہی ہوں جب نظر آیا عجیب لگا پورے سفر میں کئی بار یہ منظر سامنے آیا کہ بس اسٹاپ پر ایک مقامی مرد کھڑا ہے برابر میں اس کا سامان بیگ، گٹھڑیاں وغیرہ وغیرہ رکھی ہیں اور بیوی منہ پر چادر لپیٹے زمین پر دیوار کی طرف منہ کیے خود بھی گٹھڑی بنی اکڑوں بیٹھی ہے گاڑی آتی ہے میاں گاڑی میں سامان رکھتا ہے جب تک بیوی منہ نیچا کئے اکڑوں بیٹھی رہتی ہے پھر میاں سامان رکھنے کے بعد بیوی کو بھی گاڑی میں بٹھاتا ہے اور خود بھی بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آیا بیوی ہے کہ "ارزاں چرگاں" !!!

سوات کے پیارے لوگوں سے معذرت کہ شاید یہ ان کا کلچر ہو لیکن آخر میں اسی خوش گمانی کے ساتھ مضمون ختم کرتی ہوں کہ سوات میں بچے پڑھ رہے ہیں، بچیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں آنے والا وقت ضرور ایسا ہو گا کہ جب وہاں کی بچیاں باپردہ رہتے ہوئے بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی نظر آئیں گی۔ انشاللہ۔ ❁

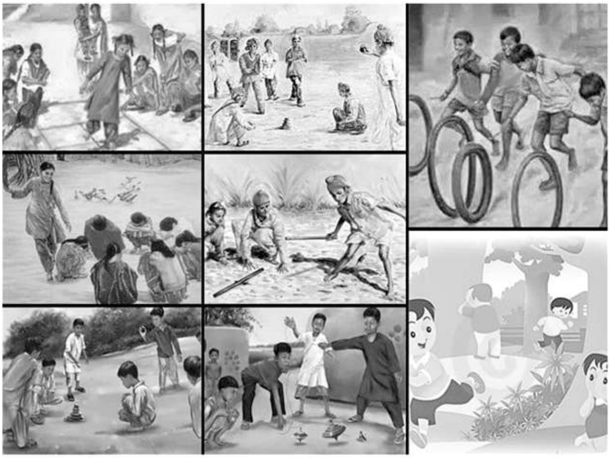

رانا محمد شاہد بورے والا میں 'اطراف' کا ایک مضبوط ستون ہیں۔ان سے جب بھی فرمائش کی جائے وہ مطلوبہ موضوع پر بہت محبت سے تحریر بھیجتے ہیں۔ 'چھٹیاں نمبر' کے لیے ان کی مختصر سی تحریر ان دنوں کی یاد تازہ کرتی ہے جب یہ چھٹیاں متوسط طبقے کے خاندانوں میں قربت کا موقع بنتی تھیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔ یہ وہ چھٹیاں ہیں جو اپنے شہر میں ہی گزاری جاتی ہیں۔

# کانچ کی گولیاں۔چھپن چھپائی۔پکڑن پکڑائی

تحریر: رانا محمد شاہد (بورے والا)

مجھے یاد ہے سکول دور میں گرمیوں کی چھٹیاں ہماری سب سے بڑی خوشی ہوتی تھی۔تین ماہ کے لیے ماسٹر صاحب کے ڈنڈے اور کتابوں سے ایک حد تک جان چھوٹ جاتی تھی۔ان چھٹیوں میں کرکٹ کھیلنا اور بچوں کے ماہانہ رسالے پڑھنا محبوب مشغلہ تھا۔شام اور رات کو گلی محلے میں دوستوں کے ساتھ بنٹے (کانچ کی گولیاں) چھپن چھپائی، پکڑن پکڑائی وغیرہ بھی خوب کھیلتے تھے۔

جیسے ہی جون کے مہینے کی ابتدا ہوتی تھی تو دل میں خوشی کے شادیانے بجنے لگتے تھے کہ اب چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ بلکہ ہمارے ایک استاد تھے۔محمد طفیل چشتی صاحب جو ہمارے محلے دار ہیں اور ماشاءاللہ حیات ہیں۔ان کا سٹیج پر آنا تمام طالب علموں کے چہرے پر خوشی لے آتا تھا۔اس لیے کہ اسمبلی کے بعد انہوں نے کسی نہ کسی چھٹی یا چھٹیوں کی اناونس منٹ کرنا ہوتی تھی۔

ان چھٹیوں کی خوشی کا کیا بتائیں کہ گرمیوں کی یہ چھٹیاں عید کی طرح

**میری چھٹیاں**
**میری مرضی**

لگتی تھیں۔اس وقت شاید وقت کی چال بہت دھیمی تھی۔دوپہریں پرسکون اور بہت طویل ہوتی تھیں۔ان طویل دوپہروں میں بچوں کے رسالوں کا مطالعہ عجیب سرشاری لاتا تھا۔بچوں کے دو رسالے نونہال اور آنکھ مچولی (جو پہلے سلیم مغل اور پھر ڈاکٹر طاہر مسعود کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا) نیوز ایجنسی سے لاتے اور ان کا مطالعہ تصور کی ایک انوکھی دنیا میں لے جاتا تھا کہ جہاں بچوں کی شرارتوں اور

**کراچی کے ایک دوست نے**
**'ٹوٹ بٹوٹ' کے شمارے بھیجے**

بے فکری کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔کبھی پھول اور تعلیم و تربیت بھی پڑھ لیتے تھے۔بچوں کے یہ مخصوص رسالے ہوتے اور نت نئی کہانیاں۔مجھے یاد ہے کراچی سے محمد اسمعیل یونس کھتری نامی ایک قلمی دوست نے محمود شام کی زیر ادارت شائع ہونے والے ''ٹوٹ بٹوٹ'' کے کچھ شمارے مجھے بھیجے۔یہ 1995 کے ابتدائی مہینوں کی بات ہوگی۔ٹوٹ بٹوٹ بورے والا نہیں آتا تھا۔مجھے یاد ہے اسمعیل کھتری صاحب کو شکریہ کا جوابی خط رجسٹری کروانے کے لیے ڈاک خانے گیا تو متعلقہ کلرک نے نام پڑھ کر کہا۔اسمعیل کھتری۔۔۔۔کھتری تو ہندو ہوتے ہیں۔بچوں کے یہ رسالے ہمارے بچپن کا سب سے بڑا رومانس تھا۔سب سے بڑی بات کہ بچوں کے ان رسالوں میں چھوٹی موٹی تحریریں لکھنے کی وجہ سے ہماری لکھائی بہت اچھی ہوگئی تھی۔سکول کے کئی طالب علم اپنی کاپی یا رجسٹر پر نام وغیرہ لکھوانے کے لیے ہماری ہی خدمات لیتے تھے۔

چھٹیوں کا مطلب ہم نے چھٹیاں ہی رکھا تھا۔وہ سب کام کرتے جو دل کرتا۔کھیل کود رسالے پڑھنا۔مطلب میری چھٹیاں میری مرضی۔

ان چھٹیوں میں جو چیز شوق سے کھاتے وہ گولہ گنڈہ اور قلفی تھے۔گولہ گنڈا تو سکول میں بھی پڑھائی کے وقفے میں گیٹ کے باہر موجود ریڑھی والے سے ضرور کھاتے اور برف چوستے چوستے ختم کر دیتے۔گرمی کی لہر میں گولہ گنڈے کے وہ ذائقے آج بھی یاد ہیں۔ریڑھی والے سے کہہ دیتے کہ ریڑھی پر موجود سارے ذائقے ہمارے گولہ گنڈے میں انڈیل دیجیے۔مٹھائی میں شوق سے پیسٹری کھاتے تھے جو فرمائش پر اکثر ابو لا دیتے تھے۔

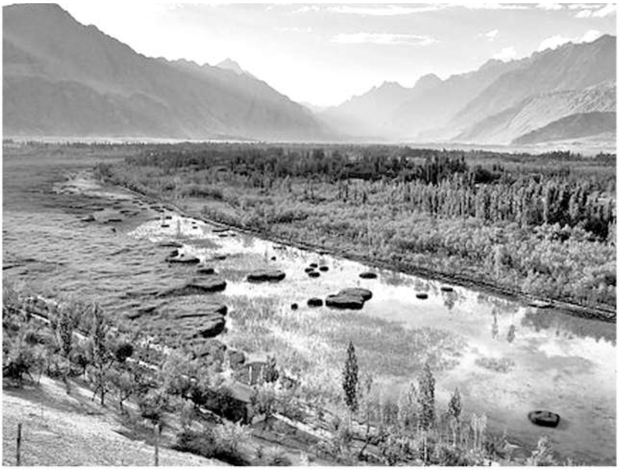

”ظہیر قندیل دردمند پاکستانی ہیں۔ شاعر ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ شعبۂ تدریس سے وابستہ ہیں۔ شاگرد دنیا بھر میں موجود ہیں۔ خاص طور پر افواج پاکستان میں۔ 'چھڈیاں نمبر' کے لیے ان سے درخواست کی تو انھوں نے 'اسکردو' کے بہت ہی دلچسپ سیاحت نامے سے نوازا۔ دل میں اترتی زبان۔ مشاہدہ پوری جزئیات کے ساتھ۔ حسن فطرت کی رنگینی تو اپنی جگہ ہے ہی۔ ظہیر قندیل کا اندازِ بیاں پڑھئے اور اسکردو کے سفر پر روانہ ہو جائیے۔ مگر اس کی روداد 'اطراف' میں ہی شائع ہو گی۔ یہ شرط ہے۔“

# ٹھنڈے پانی کی ندیاں۔ ننگے پاؤں۔ کرسیاں چار پائیاں

تحریر: ظہیر قندیل

پہلی قسط

بہت چھوٹا تھا تو میرے کانوں میں اسکردو کا نام گونجا۔ ہمارا گھرانا چوں کہ فوجی گھرانا تھا۔ اور اتفاق سے والد صاحب سمیت دو بھائی انجینیر نگ کور کی انگلی تھامے زندگی گزار رہے تھے۔ بڑے بھائی کی پوسٹنگ اسکردو ہوئی تو سب نے اشک بار آنکھوں سے انھیں رخصت کیا جس کی دھندلی سی تصویر میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔ معلوم ہوا کہ اسکردو کوئی بہت دور دراز کا پس ماندہ اور خطرناک علاقہ ہے جہاں بھائی کو بھیجا جا رہا ہے۔ اسکردو" جب

## بڑے نالے میں گاڑیاں بند۔ دھکا لگانے والے خدائی خدمتگار موجود

میرے کانوں نے پہلی بار سنا، دماغ نے سوچا کوئی مجبور قیدی ہوگا جو سزا کے طور پر وہاں بھیجا جاتا ہوگا، اس میں کبھی اپنی مرضی اور منشا شامل نہ ہوگی۔ اس وقت، میں یقیناً دس سال سے کم عمر ہی ہوں گا۔ پھر کم سنی، لڑکپن، نوجوانی، جوانی، ادھیڑ عمری کے ہر دروازے میں دستکیں ہوتی رہیں آنے والے مسافر بتاتے کہ اسکردو کے تنوع اور حسن و جمال کی فراوانی سفر کی طوالت اور یکسانیت کو ابھرنے نہیں دیتی۔ دل میں یہ خواہش ضرور پلتی رہی کہ کبھی چل کر دیکھوں تو سہی کہ اسکردو ہے کیسا؟ یوٹیوب اور ٹی وی کی اسکرین پر کئی بار اسکردو کا نظارہ کیا ہر نظارے کے بعد دل مچلا او اصرار کرتا رہا کہ چلو جا کر قدرت کے اس ذائقے کو خود بھی جا کر چکھو۔ 2017 میں گھر سے اسکردو کے لیے رختِ سفر باندھا مگر راستے میں بیگم اور بیٹی نے کہیں سے سن لیا کہ اسکردو کی سڑک بہت خراب ہے وہ گلگت پہنچ کر اڑ گئیں کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے ہم اسکردو نہیں جائیں گے۔ اس لیے درہ خنجراب ہی کی راہ لی۔ ہمیں ان دونوں کے خوف نے اردگرد کی خوب صورتیوں کی طرف بھی گاڑی موڑنے نہ دی۔ اس لیے جو بھی قراقرم ہائی وے پر نظر آیا بس وہی دیکھا۔

سیر و سیاحت کا شوق بچپن ہی سے میری رگ رگ میں رچا بسا ہے۔ فارسی کی ایک ضرب المثل ہے جائے خدا تنگ نیست، پائے من لنگ نیست" یعنی خدا کی زمین تنگ نہیں ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میرے پاؤں میں لنگ نہیں ہے۔ جب تک صحت اور ہمت جواب نہیں دیتی اللہ کی خوب صورتی اور اس کی نعمتوں سے لطف اٹھانے سے باز رہنا کفرانِ نعمت میں شمار ہوتا ہے۔ کالج کی مصروفیات کے بعد موسمِ گرما کی تعطیلات اس کام کے لیے انتہائی موزوں تھیں۔ اپنے رفقائے کار کے سامنے اسکردو جانے کی تجویز رکھی۔ کچھ دوستوں نے ہامی اور کچھ نے آہ بھری۔ میرے اہلِ خانہ نے صاف صاف کہا ملائکہ کے امتحانات کے باعث جانا ناممکن ہے۔ انھوں نے شکر ادا کیا کہ امتحانات کے باعث میں انھیں ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ محترم بھائی احمد ندیم صاحب واحد میرے شریکِ کار تھے جو نہ صرف خود بلکہ اپنے صاحب زادے سعد اور بھابھی کے بھتیجے فہد کے ساتھ چلنے کو تیار تھے۔ انھوں نے اپنی گاڑی کی پیش کش کی جو ظاہر ہے رد نہیں کی جا سکتی تھی۔

اسکردو کا پروگرام بنانے سے قبل انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کو بھی چھانا۔ ہوٹلوں کے کرائے اور قابلِ دید مقامات کے بارے میں علم

## حسین ترین ناران۔ اب ہوٹلوں دکانوں کا جنگل

اکٹھا کیا۔ اپنے بھتیجے تبسم شبیر سے بات ہوئی کیوں کہ وہ پچھلی ایک دہائی سے گلگت اسکردو میں ایک سرکاری ادارے میں بہ طور ڈائریکٹر تعینات تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی پوسٹنگ اب اسلام آباد ہو چکی ہے۔ ساتھ ہی کہا اسکردو جانے کے لیے بسم اللہ کیجیے وہاں کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔ اس نے اپنے محکمے کے ایک وفادا اور مخلص ملازم حفیظ الرحمان کو بھی، جو جگلوٹ میں متعین تھا، ہماری خاطر مدارات کا کہہ دیا۔ اس کا کئی بار فون آیا۔ اس کا ہر جملہ چاچو" سے شروع ہوتا اور چاچو" ہی پر ختم ہوتا۔ چاچو! آپ پریشان نہ ہوں چاچو۔" چاچو!

میں آپ کی خدمت کے لیے یہاں موجود ہوں چاچو" وغیرہ وغیرہ۔ پھر پورے راستے میں جہاں جہاں سگنل ملتے گئے چاچو" کی کال آتی رہی۔ اپنی بیگم کی خالہ زاد کے صاحب زادے اسامہ اعوان سے بھی معلومات لیں اور وہاں کسی ہوٹل کی بکنگ کی فرمائش کی۔ اس نے چند ہوٹل تجویز کیے کہ یہ رعایتی کرائے پر دست یاب ہوں گے۔ میرا شہزادہ زید بن ظہیر اپنے محکمے کی وساطت سے پچھلے سال دس بارہ دن اسکردو جا چکا تھا۔ اس سے مفید مشورے لیے کہ کہاں کہاں جانا چاہیے۔ اس نے کہا دیوسائی میں شدید سردی ہوتی ہے کوئی جیکٹ وغیرہ رکھ لیں اور سر پر پہننے کے لیے اونی ٹوپی بھی رکھ لیں۔ یہی مشورہ اپنے ہم سفروں کو بھی دیا۔ رات کو رختِ سفر باندھا۔ ٹراؤزرز، ٹی شرٹیں، شرٹیں، پتلونیں، جوتے، شیو کا سامان، کیمرے، چارجرز، لیپ ٹاپ ہر ایک چیز رات ہی کو زوجہ محترمہ کی مدد سے پیک کر لی۔ احمد ندیم صاحب نے 18 جون کی صبح پانچ بجے روانگی کا وقت مقرر کیا۔ سوتے سوتے اڑھائی بج چکے تھے گویا صرف دو گھنٹے کی نیند ہی نصیب ہو پائی۔

ایک ہی کار جسے میں سفید رنگت کی مناسبت سے گوری" کہوں گا، 18 جون 2023 کی صبح چار افراد کا قافلہ تقریباً ساڑھے پانچ بجے حسن ابدال سے روانہ ہوا۔ احمد ندیم صاحب نے گوری کی باگیں اپنے ہاتھوں میں تھامیں۔ مگر موٹروے پر جا کر سعد کے حوالے کر دیں۔ چوں کہ ہزارہ موٹروے بننے کے بعد ناران کے راستے پر پہلا سفر تھا اس لیے مجھے معلوم نہیں تھا کہ کہاں سے موٹروے کی گود سے اتر کر عام سڑکوں کا دامن تھامنا ہے۔ گوگل آنٹی کو زحمت دی۔ آنٹی نے جہاں سے ہمیں اتارا وہاں تنگ سی راہ تھی، جسے شاہ راہ کہنا کسی بھی شاہ کی توہین ہوگی۔ جو کھیتوں، درختوں اور آبادی میں سے گزرتی ہوئی مزید تنگ اور خستہ حال ہوتی گئی بعض مقامات پر شک ہوا کہ کہیں آنٹی نے ہمیں دھوکا تو نہیں دے دیا۔ کبھی دائیں کبھی بائیں سڑک کی بہ جائے سڑک کے آثار پر چلتے تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد ہم عطر شیشہ سے ذرا سا آگے بالاکوٹ مانسہرہ روڈ پر آ گئے۔ شکر (ش پر پیش ہے) کا سانس لیا۔ وہاں سے سڑک کے ساتھ ساتھ بل کھاتے کھاتے بالاکوٹ سے ذرا سا پہلے نیومون ریسٹورنٹ میں ناشتے کی نیت سے داخل ہوئے۔ تقریباً آٹھ بج چکے تھے۔ پراٹھے آملیٹ اور چنے منگوائے گئے۔ ناشتے کا یہی مینیو اگلے ایک ہفتے کے لیے قدرتی طور پر سیٹ ہو گیا۔ کہیں کہیں چنوں کی عدم دست یابی رہی مگر ہم نے بھی آملیٹ، پراٹھے اور چائے کو پہلے دن کی سنت کی طرح تقدس دیا۔ بالاکوٹ کا یہ ریسٹورنٹ خاصا مہنگا تھا۔ چنے کی پلیٹ اڑھائی سو روپے، آملیٹ ایک سو اسی روپے، چائے ایک سو روپے اور وہ بھی الہ دین کے چراغ جیسے کپ میں جس کا زیریں حصہ آئس کریم کے کپ کی طرح اتنا اوپر کہ چائے کے تین چار گھونٹ ہی اس کپ میں سما سکیں۔ چمچ اس میں ڈال کر سیدھا کھڑا کیا تو اس کا صرف اگلا حصہ ہی اس میں سما پایا۔ یہ کپ اس کے بعد کئی ہوٹلوں میں ہماری چڑ بنا رہا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد احمد ندیم صاحب نے گوری" کی گدی پر بیٹھ کر پھر گاڑی بانی کے فرائض سنبھال لیے۔ جب تک انٹرنیٹ آتا رہا۔ پسندیدہ موسیقی چلتی رہی۔ موسیقی کے معاملے میں سعد اور احمد ندیم بھائی کا ذوق میری مطابقت کا تھا اس لیے بہت خوب صورت موسیقی کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

**فری میڈوز تک کا کٹھن مگر دل کش سفر**

بالاکوٹ کے بعد کیوائی آ گئی۔ اب کیوائی کے بچے بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک عرصہ پہلے جب کیوائی میں بہتے چشمے پر باذوق ہوٹل والے نے دو چار کرسیاں اور ایک دو چار پائیاں رکھ دیں۔ وہاں سے گزرنے والے جب یہ منظر دیکھتے تو اس بہتے پانی سے لطف اندوز ہونے کے لیے رجوع کرتے اور کچھ وقت یہاں گزارتے۔ ہوٹل والا چائے اور پکوڑے بیچ دیتا۔ اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور کاروباری بھی اُمڈ آئے۔ رفتہ رفتہ کیوائی کا بہتا چشمہ کسی شادی ہال یا مارکی کا منظر پیش کرنے لگا، جس میں کرسیاں، خوشیاں اور کھابے بہ کثرت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اب جب کیوائی میں ایسی کارروائی کے لیے جگہ ختم ہو گئی تو کیوائی سے پہلے اور بعد میں ہر نالے کو کیوائی کی طرز پر کرسیوں اور چار پائیوں کا بازار بنا دیا گیا۔ اب سیاح بھی لاکھوں کی تعداد میں یہاں ہر سال رکتے ہیں۔ ٹھنڈے پانی میں جوتے اتار کے بیٹھتے ہیں۔ چائے کا عام کپ جو عام ہوٹلوں میں پچاس روپے کا ملتا ہے سو روپے میں خریدتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ کیوائی سے ایک سڑک شوگران کی طرف جاتی ہے جہاں سے سری اور پائے کی سیاحت سے لطف اٹھانے سیاح جاتے ہیں۔ یہ سری اور پائے بھیجے کے نہیں ہیں دو مختلف سیاحتی مقامات کے نام ہیں مزے کی بات یہ ہے کہ سری نیچے ہے اور پائے اوپر، جس میں ایک رمز یہ ہے کہ سیاحوں کو جیپ اور ہوٹل والے الٹا ہی لٹکا دیتے ہیں۔

**آرڈی ننس میس میں بھی ہمارے قیام کا انتظام۔ ایک کرنل اور میجر نے کر رکھا ہے**

کیوائی کے بعد اگلا مقام پارس آتا ہے۔ یہاں اب کئی ہوٹل بن چکے ہیں اور جگہ جگہ کار پارکنگ ان لوگوں کی گاڑیوں کے لیے بنی ہوئی ہے جو شاران (شڑان) جنگل کی سیاحت کے لیے جاتے ہیں۔ پارس اور جرید میں یہاں کی مقامی دست کاری کے کئی مراکز ہیں۔ جہاں سے سیاح لکڑی کی بنی ہوئی آرائشی اور روزمرہ ضرورت کی اشیا خرید سکتے ہیں۔ پارس سے ہم آگے نکلے تو جرید اور مہانڈری کے بازاروں سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ موسیقی جاری تھی۔ خوب صورت مناظر اور دل کش دھنیں ہماری خوب خاطر مدارت کر رہے تھے۔ ہماری منزل بہت دور تھی اس لیے ہم رکے نہیں اور آگے ہی بڑھتے رہے۔ سڑک کی حالت شروع میں تو بہت اچھی تھی مگر کھینیاں کے مقام سے آگے بہت خستہ حال ہو گئی جو کہ ناران سے آگے تک اسی حالت میں رہی۔ گاڑی صراطِ مستقیم پر چل ہی نہیں سکتی گڑھوں کے باعث کبھی دائیں اور کبھی بائیں کہیں بیچ میں کہیں بین السڑک ڈرائیونگ کرنا پڑتی ہے۔ مہانڈری کے بعد جگہ جگہ پانی سڑک کے اوپر بہتا نظر آیا۔ کاغان، جو اس پوری وادی کا سب سے پرانا قصبہ ہے اور پہلے یہ وادی اسی سے موسوم تھی، جب گزرا تو اس کے فوراً بعد دریائے کنہار پر سوکی کناری کا آبی بجلی گھر اور بند زیرِ تعمیر ہونے کے باعث سڑک کو بند کی جانب پھیرا گیا۔ سڑک کچی ہے۔ یہاں بھی گاڑیوں کی اچھی خاصی قطار لگی ہوئی تھی۔ بغیر رکاوٹ یہ علاقہ پیچھے چھوڑنے کا شکر ہی کر رہے تھے کہ آگے ٹریفک کی روانی ساکت ہوئی نظر آئی، لیجیے جناب ایک بہت بڑے نالے میں سے گزرنے کی تیاری پکڑ لیجیے جہاں بالکل بیچ میں کئی گاڑیاں بند بھی ہو جاتی ہیں۔ خدائی خدمت گار دھکا لگانے کے لیے بھی موجود ہوتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ندیم صاحب کی مہارت

نے یہ گہرا نالہ با آسانی عبور کرلیا۔ نالے کے بعد ناران کا بازار آ گیا۔ ناران کسی زمانے میں ایک نہایت خوب صورت قصبہ تھا جو اس پوری وادی میں حسین ترین مقام ہوتا تھا۔ ہوٹلوں کے جنگل اور بازار میں دکانات کے باعث اب یہ راجا بازار کا منظر پیش کرتا ہے۔ میں 1998 میں جب یہاں پہلی بار آیا تھا تو اس کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا مگر اس کے بعد جب بھی یہاں آیا یہ سحر ٹوٹتا ہی گیا۔ کاش ہوٹل اور دکانات بناتے ہوئے خاص منصوبہ سازی کی جاتی۔ سوئیٹزرلینڈ کے بنکوں میں اکاؤنٹ کھلوانے والے سوئیٹزرلینڈ کے تعمیراتی منصوبے ہی کو دیکھ لیتے تو ہمارا پاکستان دنیا کا حسین ترین مرکز بن جاتا۔ ہمارا یہاں بھی رکنے کا کوئی ارادہ نہیں بنا۔ ہم آگے ہی بڑھتے رہے۔ ناران کے بعد بٹا کنڈی بھی ہم گزر گئے۔ بڑاوئی جا کر کائنات ہوٹل میں تازہ دم ہونے کے لیے رکے چائے اور پکوڑوں کو اپنے پیٹ کا ایندھن بنایا۔ واش روم میں جا کر خود کو ذرا ہلکا کیا اور اب گاڑی کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں آ گئی۔ اس کے بعد جل کھڈ آ گیا یہاں سے ایک راستہ خوب صورت وادی نیلم کی طرف بھی جاتا ہے جہاں آپ جیپ یا موٹر سائیکل پر جا سکتے ہیں، راستے میں بلند ترین مقام نوری ٹاپ بھی آتا ہے جل کھڈ کے بعد بیسر، بیسر سے ایک ٹریک دودی پت جھیل کی طرف جاتا ہے۔ جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے، بلندی اور ٹھنڈک بڑھتی جا رہی تھی، سڑک کے اطراف میں برفانی تودے پڑے ہوئے تھے۔ بعض اوقات تو برف کی عمارت کے درمیان سے راستہ نکل رہا تھا۔ لولوسر جھیل ایک بہت وسیع جھیل ہے اور یہ وادیِ کاغان کی وسیع ترین جھیل ہے۔ لولوسر جھیل ابھی ہمارے بائیں جانب لیٹی ہوئی تھی کہ ہمیں ایک اور ٹریفک جام کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک بڑا برفانی تودہ سیاحوں کا راستہ روکنے عین سڑک پر نیم دراز تھا۔ اسے ایک طرف ہٹانے کے لیے کرین بھی موجود تھا۔ لمبی لائن لگی ہوئی تھی ہماری بے صبری قوم نے یہاں بھی دو سے تین لائنیں بنا رکھی تھیں تاکہ گاڑیوں کی آمد و رفت میں خلل ڈالا جا سکے اور انتظار کی گھڑیوں کو خاطر خواہ طوالت بخشی جائے۔ یہ تو بھلا ہو پولیس والوں کا کہ وہ موٹر سائیکل پر آئے اور ڈبل لائن بنانے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر پیچھے جانے کو کہا۔ مگر ہماری ڈھٹائی تو عالمی سطح پر مسلّم ہے۔ جوں ہی وہ ادھر ادھر ہو جاتے یارانِ بے صبراں پھر پیچھے سے آتے اور آگے نکل جانے کو عمرے کی سعادت سمجھتے۔ ویگو ڈالے" والا ایک بدتمیز تو اتنی تیزی سے ہمارے پاس سے گزرا کہ سڑک پر بہتے ہوئے پانی کے چھینٹے ہماری گاڑی، ہمارے کپڑوں اور چہروں پر آ کر براجمان ہو گئے۔ برفانی تودوں سے رِستا یخ پانی ہمیں اتنا گیلا کر گیا کہ ہمارے دانتوں نے سردیوں میں کٹکٹانے کا شوق جون ہی میں پورا کرلیا۔ اڑھائی گھنٹے ہم ٹریفک جام کی اس قیدِ میں مبتلا رہے۔ جس جگہ تودہ گرا تھا وہاں چوں کہ کنکریٹ کی روڈ تھی جس میں سے لوہے کے سریے بھی سر اٹھا اٹھا کر ہماری بے بسی کا تماشا کر رہے تھے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے یہی خطرہ اور خدشہ رہا کہ یہ سریے کہیں ہماری گوری کے چرن چھوتے ہوئے جوشِ جذبات میں ان کے اندر ہی نہ گھس جائیں مگر اللہ کا شکر ہے کہ ایسی کسی صعوبت کے جال میں ہم نہیں پھنسے۔ بابوسر ٹاپ تک پہنچتے پہنچتے تقریباً سات بج چکے تھے۔ یہاں آ کر پہلے تو بیت الخلا کا رخ کیا۔ معلوم ہوا بیت الخلا استعمال کرنے کا نرخ پچاس روپے فی فرد ہے۔ ایک سیاہ رو مگر ہنس مکھ نوجوان یہ ٹیکس وصول کر رہا تھا۔ اس سے کہا: اے نوجوان! ہم اساتذہ کرام ہیں اور معمارِ قوم ہیں۔ ہم

## ہوٹل جس کے نام میں پٹھان چوہدری اکٹھے

سے بھی اتنا بھاری بھرکم جرمانہ جب کہ ہم نے کچھ لینا نہیں دینا ہے۔" وہ نوجوان ہنس پڑا اور بولا سر! آپ چاروں میں سے ایک شخص فری میں رفع حاجت کر سکتا ہے۔" ہم نے اس کے اس احسانِ عظیم کا شکریہ ادا کیا لیکن اس شخص کی عظمت میں مزید اضافہ ہوا جب اس نے ڈیڑھ سو کی جگہ ہم سے صرف سو روپے وصول کیے۔ بیت الخلا کے سامنے ہی چائے کا کھوکھا تھا۔ یہاں سے پکوڑے اور چائے سے اپنی خاطر داری کی۔ پکوڑے زیادہ سخت نہیں تھے ذرا سی تگ و دو کے بعد انھیں کھایا جا سکتا تھا۔ بھوک میں لکڑ بھی پاپڑ لگتی ہے۔ بابوسر ٹاپ میں اب کچھ پختہ تعمیرات ہو چکی ہیں جو کہ یہاں کے حسن کو بہت زیادہ ماند کر چکی ہیں، یہاں سے کبھی بہت دل کش نظارہ کیا جا سکتا تھا مگر بے ہنگم تعمیرات اور ڈھابے اس منظر کو روکنے میں خاصے کام یاب نظر آ رہے ہیں۔ حکومت اور محکمۂ سیاحت کی شان دار منصوبہ بندی کے باعث اگر یہاں بھی ایک نیا ناران بن گیا تو پھر کیا ہوگا؟ اللہ کے لیے قدرتی حسن کو تحفظ دو۔ بابوسر ٹاپ سے احمد ندیم صاحب نے گوری" کی پائلٹی کی۔ یہاں سے چلاس تک کا سفر مسلسل اور عمودی ڈھلان کا ہے اور پورے راستے میں ڈرائیور کی مہارت کا سب سے بڑا امتحان یہیں ہوتا ہے۔ پیچ در پیچ موڑوں سے اترتے جب نیچے اترتے آ رہے تھے کہ ہمیں گاڑی کے بریک لیدر کی بو سی محسوس ہوئی۔ گاڑی ایک طرف روکی۔ گاڑی رکتے ہی ہر

## پی ٹی ڈی سی کا ریسٹ ہاؤس۔ بالکل لاوارث

عمر کے بچے آ کر گاڑی کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ان سے پوچھا پانی لا دیں گے؟ ایک بچے نے رضاکارانہ خدمات پیش کیں۔ بھاگ کر پانی کی بوتل بھر لایا۔ جب اس پانی کو گاڑی کے پہیے پر ڈالا گیا یوں محسوس ہوا کہ ہم نے تنور میں پانی ڈالا ہو۔ پھر اس بچے نے بار بار بھاگ کر پانی کی بوتل بھر کر لائی۔ جن سے ہم نے سارے پہیے ٹھنڈے کیے۔ اس بچے کو خاطر خواہ انعام دیا اور آگے کی طرف بڑھے۔ چلاس پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھا چکا تھا۔ ہم رکے بغیر آگے بڑھتے گئے۔ ہماری پہلی منزل جگلوٹ تھی۔ ہمیں راستے میں سب سے زیادہ ڈر تا پانی کا تھا کیوں کہ وہاں کے پہاڑ بھر بھری مٹی کے باعث ہمیشہ لینڈ سلائیڈنگ پر آمادہ رہتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر کہ وہاں سے ہم با آسانی گزر گئے۔ عائے کوٹ کا ٹپل آیا جہاں سے ایک خطرناک کچی سڑک تاتو گانو تک جاتی ہے جہاں سے فیری میڈوز تک کا ایک کٹھن مگر دل کش سفر پیدل طے کیا جاتا ہے۔ چاچو" کی کال آئی کہ میں انتظار کر رہا ہوں۔ اس نے ہمارے لیے یونائیٹڈ ہوٹل میں قیام کا بندوبست کیا مگر ہمارا آرمی میس میں رکنا طے ہو چکا تھا اس لیے اس سے معذرت کی۔ رائے کوٹ ٹپل کے کچھ دیر بعد ہم بونجی سے ہوتے ہوئے رات دس بجے جگلوٹ پہنچے جہاں آرڈیننس میس میں ہمارے قیام کا بندوبست ہمارے شاگردوں لیفٹیننٹ کرنل زاہد نواز ملک جن کا تعلق اقبال ونگ سے اور میجر مبارک گھمن جن کا تعلق اورنگزیب ونگ سے تھا، نے کر رکھا تھا۔ ان دونوں برخورداران کا خصوصی شکریہ۔ ان دونوں نے ہر طرح سے ہمارے اس سفر میں ساتھ دیا اور ہمارے آرام کا خیال رکھا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو اور ہمارے باقی تمام ابدالین شاگردوں کو بہت سی کامیابیاں عطا فرمائے جو ہر لمحہ اپنے اساتذہ کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ ایسے فرماں بردار شاگرد سب کو عطا فرمائے۔ آمین۔ عشائیے کے لیے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ جاتے ہی گرما گرم کھانا کھایا۔ چاچو" بھی وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔ اس کا چچا زاد بھائی وہیں پر میجر تعینات تھا وہ بھی ہم سے ملنے خود آ گیا۔ چاچو بھاگ کر گیا کولڈ ڈرنک لے آیا۔ چاچو" ناراض تھا کہ ہم نے اس کا کھانا کیوں نہیں قبول کیا۔ ہم نے کہا پھر کبھی ان شاءاللہ۔ ہم نے ایک ہی کمرا بک کرایا تھا۔ سعد و فہد کے لیے میٹرس کا کہہ دیا تھا۔ چاچو" نے اپنے کزن سے کہا: بچوں کے لیے ایک اور کمرا کھول دو۔ یوں ہی ہوا۔ ان کے لیے ایک اور کمرا کھول دیا گیا۔ جہاں وہ ہم بزرگوں کی پہنچ سے محفوظ رات بسر کرنے چلے گئے۔ دن بھر چار سو بیس کلومیٹر اور دو بار ٹریفک جام کا شکار ہونے کی وجہ سے جلد ہی نیند ہم پر حاوی ہونے لگی۔ چاچو" سے رخصت لی۔ وہ بادلِ نخواستہ چلا گیا اور ہم نیند کی گہری وادیوں میں کھو گئے۔

19 جون 2023

جگلوٹ میں ہماری صبح پانچ بجے ہی ہو گئی، بچے ابھی سو رہے تھے۔ جگلوٹ دریائے سندھ کے کنارے آباد ایک زرخیز قصبہ ہے، یہاں کچھ ہوٹل اور سرکاری ریسٹ ہاؤس بنے ہوئے ہیں۔ ایک چھوٹا سا بازار بھی ہے جہاں ضرورت کی تقریباً تمام اشیا دست یاب ہیں۔ پٹرول پمپس بھی ہیں۔ یہ سطح سمندر سے 6222 فٹ کی بلندی پر ہے اس لیے موسم قدرے خوش گوار ہوتا ہے اس لیے اسکردو جانے والوں کے لیے رات کے قیام کے لیے چلاس سے بہتر جگہ ثابت ہوتی ہے۔ پاکستان کی دفاعی افواج کا اہم مرکز ہے اس لیے کہ یہاں سے کارگل اور سیاچن کے محاذوں کے لیے سامانِ حرب اور اشیائے ضروریہ کی ترسیل ہوتی ہے۔

تقریباً سات بجے بچوں کو جگایا گیا۔ میس والوں سے بل لانے کا کہا

گیا۔ انھوں نے ہم سے یہ شکریہ چاچو" اور ہمارے شاگردان عزیز ایک ہی کمرے کا رعایتی کرایہ وصول کیا۔ ہم سفروں کا خیال تھا کہ ناشتا باہر سے کیا جائے۔ اس لیے تقریباً آٹھ بجے ہم میس سے باہر نکلے اور ناشتے والے ہوٹل کی تلاش شروع کر دی۔ آخر کار پٹھان ہوٹل اینڈ چودھری ریسٹورنٹ" کا بورڈ نظر آیا۔ اس میں حیرت کی بات نہیں تھی کہ پٹھان اور چودھریوں کو اگر یک جا کر دیا گیا۔ اس لیے کہ ہمیں پورے گلگت بلتستان میں ایسے بورڈ اکثر نظر آئے جس میں دو یا اس سے زاید مختلف علاقوں کو یک جا کیا گیا۔ کوئٹہ بلتستان شنواری ہوٹل" کراچی ہزارہ ہنزہ کیفے" "لاہور کی بٹ کڑاہی اور کابلی پلاؤ" وغیرہ وغیرہ۔ ناشتا منگوایا گیا۔ پراٹھے، چنے، آملیٹ اور چائے آ گئے، پراٹھا بنانے میں اچھا خاصا ربر بنانے کا فارمولا استعمال کیا گیا تھا۔ منھ میں ڈالیں تو دور تک کھنچتے چلے جائیں۔ سعد کو تندوری پراٹھا کھانے کا شوق پیدا ہوا اور وہ قریب ہی ایک تنور سے دو پراٹھے لے آیا۔ وہ پراٹھے پٹھان ہوٹل والے کی نسبت سے کافی خستہ اور مزے دار تھے۔ چنے بھی چنے سے زیادہ چنوں کے غسل کا پانی لگ رہے تھے۔ جوں توں ناشتا کیا اور ہم اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ابھی جگلوٹ سے نکلے ہی تھے کہ وہ مقام آ گیا جہاں دنیا کے تین بلند ترین پہاڑی سلسلے آ کر ملتے ہیں۔ یہاں پر ہمالیہ، ہندوکش اور قراقرم کا ملاپ ہوتا

ہے۔ انتظامیہ نے چھوٹا سا پکنک اسپاٹ بھی بنا دیا ہے۔ وہاں کچھ دیر تینوں پہاڑی سلسلوں کی گفتگو کا احساس لیا۔ انھوں نے ہمارے ساتھ تصاویر بنوائیں اور ہم آگے کی طرف بڑھ گئے۔ اب یہاں سے شاہ راہِ ریشم کو الوداع کہا اور دائیں طرف جانے والی نئی تعمیر شدہ اسکردو روڈ پر گوری کو دوڑانے لگے۔ سڑک بہت مہارت اور عمدگی سے تعمیر کی گئی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے مخمل کا فرش بچھا دیا ہو۔ کہیں کہیں لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے سڑک کو نقصان پہنچا ہے مگر ایف ڈبلیو او والے تعمیر شاہ راہ میں ہر وقت کوشاں رہتے ہیں، دریائے سندھ کے ہم راہ یہ 162 کلو میٹر کے طویل سفر میں سنگ لاخ اور ویران پہاڑوں کے درمیان جب کبھی سبزہ اور ہریالی

نظر آتی ہے وہیں آبادی اور ہنستے بستے انسان بھی دکھائی دیتے ہیں۔ وہیں پر کئی رنگوں کی دنیا دکھائی دیتی ہے سرخ و سیاہ چیری کے باغات، زرد رنگ کی خوبانیاں، سبز رنگ کے کچے سیبوں کے درخت جا بجا دکھائی دیے۔ یعنی کوہ ساروں کے درمیان رنگینیاں کئی رنگوں کی چادریں لیے لیٹی ہوئی تھیں۔ جوں ہی اس نخلستان سے نکلتے تو سلگتی دُھوپ میں تپتے پتھر ایک نیا رنگ دکھاتے۔ اچانک ان پتھروں میں سے بہتی ہوئی آب شار کا نظارہ ہوتا ایسے عالم میں مجھے اقبال یاد

## شنگریلا ریزارٹ۔ سیاحوں کے لوٹنے کا تجربہ

آ جاتے۔

کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فراز کوہسار آمد

جگلوٹ تا اسکردو سفر میں یک سانیت محسوس ہوتی ہے، تنگ وادی، دونوں طرف آسمان سے باتیں کرتے پہاڑ، ان کے اوپر سے جھانکتی برف پوش چوٹیاں، درمیان میں پتھروں سے سر پٹختا، غیظ و غضب دکھاتا دریائے سندھ اور اس کے ساتھ نو تعمیر شدہ سڑک، کہیں کہیں بھر بھری زمین لڑھک کر سڑک پر بھی آ جاتی ہے، وہاں ہلکی سی آف روڈ والی کیفیت بھی محسوس ہوتی ہے مگر زیادہ سے زیادہ سو میٹر تک ہی یہ حالت رہتی ہے۔ یہ نظر بٹو" ضروری بھی ہے ورنہ دلھن کو نظر لگنے کا احتمال رہتا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہم استک نالے کے مڈوے ریسٹورنٹ" پر موجود تھے۔ یہیں پر پی ٹی ڈی سی کا ایک ریسٹ ہاؤس بھی ہے۔ مگر محسوس ہوتا ہے جیسے حکومت نے اسے عاق کر دیا ہو۔ نہ کوئی بورڈ نہ کوئی نشانی۔ بالکل لاوارث بالک کی طرح ایک طرف پڑا ہوا۔ ہم مڈوے" کو کئی وی لاگز میں دیکھ چکے تھے۔ اسٹریٹ فوڈز کے ضیا تبارک صاحب یہاں بھی اپنا مخصوص چلیں" کا نعرہ لگا چکے ہیں۔ یہاں ریسٹورنٹ کے مالک مٹن یخنی کو اپنی خاص ڈش بتاتے ہیں اور

چوں کہ اسے کھانے کے بعد ہم ضیا تبارک" بھائی کا منھ دیکھ چکے تھے اس لیے صرف چائے ہی منگوائی۔ ہمارے بالکل نیچے استک نالا بھی ابھرا ابھر کر اپنی تڑپ اور اضمحلال دکھا رہا تھا۔ بہت مٹیالا پانی تھا۔ چائے بھی بالکل ایسی ہی تھی ٹھنڈی اور خاکی۔ اس کے بعد ہم اپنی اگلی منزل پر روانہ ہونے کے لیے گوری کو تھپتھپا رہے تھے۔ سخت دھوپ کی وجہ سے گوری تپ رہی تھی۔ دھوپ تیز تھی مگر احمد ندیم بھائی گاڑی بہت آہستہ چلا رہے تھے۔ اس لیے ارد گرد کا ماحول بہت آہستگی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ دریا کے پار کبھی کبھی کوئی سرسبز علاقہ نظر آتا تو وہیں آبادی بھی موجود ہوتی۔ استک نالے کے بعد سڑک کے دوسری طرف ایک گانو آباد ہے جس کا نام گنجی رونڈو" ہے۔ ہمارے ہاں رونڈو یا تو فراڈ کرنے والے کو کہتے ہیں یا بات بات پر رونے والے کو اور اگر رونڈو، گنجی ہو تو سونے پر سہاگا ہی ہو سکتا ہے۔ پھر ہر گانو کے ساتھ رونڈو ہی لکھا دیکھا۔ کہیں تا جار ونڈو اور کہیں اور رونڈو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رونڈو ضلع کا نام ہے اس کے علاوہ جو خاص بات محسوس ہوئی وہ یہ تھی کہ بلتستان کے بہت سے علاقوں کے نام کے ساتھ داس لگا ہوا ہے۔ گلگت بلتستان کے ضلع دیامر میں موجود گیتی داس جو بابوسر ٹاپ سے پہلے کا منطقہ ہے سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ داس کا سلسلہ شاہ راہِ ریشم پر شاید ضلع کوہستان کے ہربن داس سے شروع ہوتا ہے۔ ہربن داس وہی قصبہ ہے جہاں 2012ء میں ایک انسانیت سوز واقعہ ہوا تھا، جب راولپنڈی سے گلگت جانے والی بسوں کو شاہراہ قراقرم پر روک دیا گیا اور شناختی کارڈ دیکھنے پر جس کا شیعہ ہونا یقینی ہو گیا اس کو شہید کیا گیا۔ اس واقعے میں 19 شیعہ مسافر شہید ہوئے تھے۔ بعد میں اس طرح کے ظلم و بربریت کے کھیل کئی بار کھیلے گئے۔ قصبہ داسو بھی داس ہی کی کوئی شکل لگتی ہے۔ اسکردو روڈ پر دمبو داس، گربی داس، سور داس کے نام کے قصبے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح کانی داس اور دوئی داس بھی دو قصبے ضلع استور میں واقع ہیں۔ داس ہندی میں غلام کو کہتے ہیں۔ ہم بھی اس علاقے کے حسن کے باعث دیو داس ہو چکے تھے۔ دمبو داس جو رونڈو ضلع کا صدر مقام بھی ہے جگلوٹ اور اسکردو کے درمیان سب سے بڑا قصبہ ہے۔ اسے 2019 میں ضلع کا درجہ دیا گیا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ یہاں خواندگی کی شرح 97 فی صد ہے۔ دمبو داس کے بازار میں ہجوم کے باعث گاڑی کی رفتار بہت دھیمی ہو جاتی ہے۔ گاڑیوں اور انسانوں کے ہجوم کو چیرتے ہم پھر آگے کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ راستے میں بشو کا بورڈ نظر آیا اور سامنے نیچے دریا کے ذرا سا اوپر ایک آب شار اور ایک معلق پل بھی دکھائی دیا۔ سڑک کنارے جیپیں بھی کھڑی دیکھیں۔ مجھے میرے بیٹے زید نے مشورہ دیا تھا کہ میں بشو ویلی ضرور جاؤں اور اگر ہو سکے تو رات وہیں بسر کروں۔ میں نے سعد سے کہا ذرا پوچھو تو سہی کہ جیپ والے بشو جانے کا کتنا کرایہ لیتے ہیں۔ اس نے آ کر بتایا آٹھ ہزار اگر دیکھ کر واپس آ جائیں، اگر رات ادھر ہی رہنی ہے تو دس ہزار۔ احمد ندیم بھائی سے کہا یہ کام ہم واپسی پر کریں گے۔ پھر گوری کو آگے کا رستہ دکھا دیا۔

اس کے بعد کچورا کا علاقہ آیا۔ دریائے سندھ کا پل عبور کیا اور کچھ ہی دیر بعد کچورا کے جنکشن پر پہنچ گئے۔ یہاں مارکو پولو شیپ کا مجسمہ بنا ہوا نظر آیا۔ بائیں طرف اسکردو کی طرف راستہ چلا جاتا ہے اور دائیں طرف کچورا کا راستہ نکلتا ہے۔ ہم نے کچورا کی طرف گوری موڑ دی۔ ہمارے شاگردِ عزیز میجر مبارک گھمن نے کچورا جھیل کے کنارے آرمی کے میس میں ہمارے کھانے اور کچھ دیر قیام کا بندوبست کر رکھا تھا۔ کچورا جھیل دیکھنے کا سپنا ہم عرصۂ دراز سے آنکھوں میں سجائے پھر رہے تھے۔ یہ جھیل کچورا نام کی نسبت شنگریلا ریزورٹ کے نام سے زیادہ معروف ہے۔

کچورا میں دو جھیلیں بہت مشہور ہیں لوئر کچورا جو کہ شنگریلا جھیل بھی کہلاتی ہے اور دوسری اپر کچورا جھیل۔ لوئر کچورا بہت چھوٹی سی جھیل ہے جس کے تقریباً آدھے حصے پر شنگریلا ریزورٹ والوں کا قبضہ ہے۔ شنگریلا ریزورٹ والے سیاحوں کو لوٹنے کا خاصا وسیع تجربہ رکھتے ہیں یہاں کی انٹری فیس ایک ہزار روپے فی فرد ہے اور یہ صرف داخلے کا جرمانہ ہے، اندر جا کر ایک کپ چائے اور سینڈوچ کھانے کے لیے پندرہ سو روپے فی فرد کا خرچ الگ ہے۔ یہاں پر ایک رات گزارنے کے لیے کمرے کا کرایہ کم از کم چھبیس ہزار روپے ہے۔ وہی جھیل ہم نے فوجی گیسٹ ہاؤس سے نہ صرف مفت دیکھی، بلکہ وہاں سے شنگریلا استراحہ کا بھی نظارہ کیا۔ یہ استراحہ یعنی ریزارٹ 1983 میں بنایا گیا اور یہ اسکردو بلتستان کا پہلا ٹورسٹ ریزارٹ تھا۔ اس جھیل کا نیل گوں صاف شفاف پانی، دل کش نظارے اور فرحت بخش موسم سیاحوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ دیومالائی حسن سے مالا مال شنگریلا جھیل دنیا بھر میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے، شنگریلا جھیل کی ہر سمت میں قدرت نے اپنے حسن کے لنگر ایسے کھولے ہیں کہ پورا علاقہ جنت کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ وہاں ہمارے موبائل کے کیمرے مسلسل آن ہو گئے۔ اپنے گھر والوں کو بھی شریکِ نظارہ بنانے کے لیے براہ راست وٹز ایپ پر گروپ کال کر دی۔ اس وقت سب کے سب لوگوں کے موبائل مسلسل مصروفِ عمل رہے۔ موسم انتہائی خوش گوار تھا۔ آسمان پر ننھے ننھے بادل اٹکھیلیاں فرما رہے تھے۔ جھیل کے عین اوپر کچھ بزرگ سفید ریش بادل پر پھیلائے فرشتے نظر آ رہے تھے۔ ان کا عکس جھیل میں ایک مقدس فضا کا ماحول بنا رہا تھا۔ جھیل پر کشتی رانی کا بندوبست بھی تھا لیکن وقت کی قلت کے باعث ہم نے ارادہ ملتوی کیا، ہمیں مطلع کیا گیا کہ کھانا تیار ہے۔ چیری کے تازہ جوس کے ساتھ چکن بریانی، سلاد اور رائتے پر مشتمل کھانا اس دل فریب ماحول میں کچھ زیادہ ہی لذیذ ثابت ہو رہا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے پی۔ اس سب کھانے کا بل چار ہزار روپے بنا جو مناسب تھا۔ جب بل ادا کر چکے، وہاں سے رخصت ہونے کے لیے تیار ہی تھے کہ مینیجر آ کر معذرت کرنے لگا کہ سوری سر! ہم نے آپ سے کھانے کا بل نہیں لینا تھا ۔ ویٹر نے لاعلمی کی وجہ سے لے لیا۔ میجر گھمن صاحب نے ہمیں سختی سے منع کیا ہوا تھا۔ گھمن کو فون کر کے کہا کہ بیٹا اتنا ہی کافی تھا کہ ہم نے گیسٹ ہاؤس میں بہت آرام و سکون اور جی بھر کے جھیل کو دیکھ لیا یہ آپ نے کیا زیادتی کی تو گھمن کا کہنا تھا؛ سر! آج ہم جو کچھ ہیں یہ آپ کی محنت اور تربیت کے باعث ہیں، جو آپ نے ہمیں دیا ہے اس کے بدلے میں یہ کچھ بھی نہیں، اس لیے آپ انکار مت کریں۔" اس کی اتنی اچھی سوچ کو بھلا ہم رد کیسے کر سکتے تھے، قبول کی اور اب ہماری اگلی منزل اپر کچورا تھی جو وہاں سے چار پانچ کلومیٹر اوپر کی طرف کچورا گانو کے بعد آتی ہے۔

**درختوں۔ سیاحوں۔ پہاڑوں کے بیچ گھری کچورا جھیل**

اپر کچورا جھیل سے ذرا پہلے گوری کو پارکنگ میں کھڑا کیا اور وہاں سے پیدل جھیل کی طرف روانہ ہوئے۔ سیاحوں کا بہت بڑا ہجوم راستے میں پایا۔ وہاں سے جھیل زیریں علاقے میں واقع تھی اس لیے خاصی اترائی اترنے کے بعد ہم جھیل پر پہنچے۔ یہ بہت بڑی جھیل ہے۔ درختوں اور سیاحوں کے بیچ میں گھری ہوئی جھیل انتہائی بارونق نظر آ رہی تھی۔ کئی موٹر بوٹس چل رہی تھیں جن پر کشتی رانی کا لطف اٹھایا جا رہا تھا۔ وہاں سب سے اچھی بات یہ بھی دکھائی دی کہ کشتی پر بیٹھنے سے پہلے سب کو لائف جیکٹیں بھی پہنائی جا رہی تھیں۔ ہم نے بھی ایک کشتی کرائے پر حاصل کی جس کا کرایہ اس نے پندرہ سو روپے وصول کیا۔ اس کشتی میں ہمیں جھیل کے کنارے سے دوسرے کنارے تک لے جایا گیا اور پھر واپس لایا گیا۔ کشتی پر بیٹھنے کا لطف اور اردگرد کے فلک پیما پہاڑوں میں گھری جھیل کی قوتِ جاذبہ نے ہم پر فریفتگی کا سحر طاری کر دیا۔ وہ پندرہ سو روپے کی سیر پندرہ لاکھ سے بھی قیمتی تھی۔ جب جھیل کی جی بھر کر سیر کر لی تو اب مرحلہ اس چڑھائی چڑھنے کا تھا جو آتے وقت اترائی کے باعث زیادہ مشکل محسوس نہیں ہوا تھا۔ میری جسامت کو آپ جانتے ہی ہیں۔ اتنے بڑے وزن کو اٹھا کر چڑھائی چڑھنا اچھا خاصا کارِ دشوار تھا جو وقفوں کے ساتھ طے کیا۔ چڑھائی چڑھنے کے بعد سانس بحال کیا۔ اب ہماری اگلی منزل وادیِ سوق تھی۔ وہاں تک جانے کے لیے ایک گاڑی حاصل کی۔ میں فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو گیا اور احمد ندیم بھائی بچوں سمیت پچھلی نشستوں پر جلوہ افروز ہوئے۔ وادیِ سوق جانے کا راستہ کسی بھی موشن رائیڈ" سے کم نہیں تھا۔ وہاں پر فور بائی فور کے ساتھ ساتھ کاریں بھی جا سکتی ہیں لیکن وہاں کی مقامی کاروں والوں نے کار کی پچھلی سائیڈ کو خاصا بلند رکھا ہے تاکہ پتھروں سے بچ سکیں۔ وادیِ سوق میں پہنچے تو اس کی خوب صورتی بھی دیدنی تھی۔ ایک طرف دریا زور و شور سے بہہ رہا ہے اور اس کے ساتھ ہوٹلوں والے اپنے گاہکوں کی آؤ بھگت کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ وہاں ایک ہوٹل پر بیٹھ کر چائے اور پکوڑوں سے لطف اندوز ہوئے اس وقت مغرب ہونے والی تھی وہاں سے واپسی کی راہ لی۔ گوری کو اسکردو کی طرف دوڑایا۔

اسکردو شہر پہنچے تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سب سے پہلے ہوٹل تلاش کرنے لگے۔ تبسم شبیر کے بتائے ہوئے ہوٹل سنولینڈ پہنچے تو معلوم ہوا کہ سارا ہوٹل بک ہے کوئی کمرا خالی نہیں۔ تبسم کا حوالہ دیا تو مینیجر متبسم ہوا اس نے فوراً چیری منگوالیں، چائے کا کہہ دیا لیکن کمرے سے معذرت کر لی کہ کوئی خالی نہیں۔ اس ہوٹل کے مالک سلیم صاحب کے بھائی ہمیں ایک اور ہوٹل بلتستان ریزورٹ لے گئے، جنھوں نے ہمیں ڈرائیوروں کے لیے مخصوص کمرا دکھایا۔ انتہائی مختصر کمرے میں تین بستر لگے ہوئے، واش روم بھی خاصا گندا۔ ہمیں افسوس ہوا کہ یہ کس قسم کا کمرا ہمیں دکھایا جا رہا ہے تو وہ بولے بس یہی کمرا بچ گیا تھا۔ اس کے بعد ایک دو ہوٹلوں پر گئے کمرے پسند نہ آئے۔ پھر اسامہ اعوان کے بتائے ہوئے ٹراؤٹ ولا" پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی کمرے دست یاب نہیں۔ اس ہوٹل کے مالک نے ہمیں کہیں اور کا پتا بتایا لوکیشن بھیجی مگر کسی کا نیٹ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے اس لوکیشن پر پہنچنا ہم اجنبیوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ رستے میں ایک صاحب مل گئے انھوں نے کہا آپ شاہی ولا" چلے جائیں۔ اچھا ہوٹل ہے۔ ہم نے کہا وہ کہاں ہے اس نے کہا میرے پیچھے پیچھے آئیں۔ وہ موٹر سائکل پر آگے آگے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے۔ شاہی ولا" پہنچ کر کمرے دیکھے تو یہی لگا شاہی دور" کے کمرے ہیں۔ کمرے مجھے تو بالکل پسند نہیں آئے مگر احمد ندیم صاحب اور بچے تھک چکے تھے وہ بولے آج یہیں بسر کر لیتے ہیں کل صبح کہیں اور دیکھ لیں گے۔ دو بیڈ لگے ہوئے تھے ہم نے دو میٹرس بھی لے لیے۔ کھانا کھانے کی طلب ہوئی تو شاہی ولا سے ایک نوجوان ہماری رہ نمائی کے لیے ہمارے ساتھ بازار گیا۔ ایک ہوٹل میں کھانا کھلایا۔ کھانا مزے دار اور مناسب نرخ والا تھا۔ شاہی ولا والے بہت مہمان نواز تھے۔ بااخلاق اور خوش مزاج، رات کو انھوں نے آ کر کہا سر! آپ چاہیں تو ہمارے پاس دوسرا کمرا خالی ہے آپ اس میں جا کر سو سکتے ہیں۔ ہم نے کہا؛"کرایہ ہم نے ایک ہی کمرے کا دینا ہے۔" وہ بولا: سر! آپ سے کون کرایہ مانگ رہا ہے۔ آپ ہمارے بہت محترم مہمان ہیں، آپ آرام سے سو جائیں گے۔" اس کا شکریہ ادا کیا اور میں اور احمد ندیم صاحب اوپر والے کمرے میں شفٹ ہو گئے۔ کمرے میں کچھ حبس محسوس ہو تو کھڑکی کھولنے کا کہا۔ معلوم ہوا کوئی ماہر کاری گر اس کمرے کی کھڑکیاں بناتے ہوئے جالی اندر کی طرف اور شیشے باہر کی طرف لگا گیا ہے اور لطف کی بات یہ کہ شیشے کھلتے ہی نہیں البتہ اندر سے جالی والی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ آفرین ہے اس کی کاری گری پر۔ کچھ دیر حبس محسوس کیا مگر دن بھر کی تھکاوٹ کے باعث نیند نے جلد ہی ہمیں اپنی بانہوں میں لے لیا۔ (جاری ہے) ❁

# ”پاکستان لائبریری“ کا وطن عزیز میں قیام

101 کتب جن کی مالیت دو لاکھ روپے ہے صرف تیس ہزار روپے (Rs:30,000) میں حاصل کریں۔ پاکستان لائبریری کے نام سے اپنے گھر، محلے، گاؤں، ہسپتال، جیل خانہ جات، کالونی، سکول، کالج، یونی ورسٹی میں اور اپنی اپنی مادرِ علمی میں، اپنے والدین، قومی ہیروز اور اپنے پیاروں کے نام پر یہ کتب خرید کر لائبریری قائم کریں۔

نوٹ: 100 خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم لائبریریوں کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے۔

**قدم بڑھائیں، لائبریری بنائیں**
**کتابیں ایک سو ایک، مقصد اعلیٰ اور نیک**

## قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

یثرب کالونی، بینک سٹاپ، والٹن روڈ، لاہور کینٹ

ای میل: qalamfoundation2@gmail.com 0300-0515101 / 0309-4105484

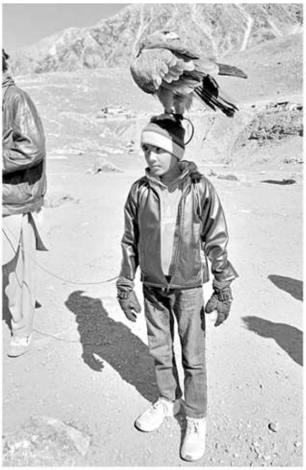

”پروفیسر شاداب احمد صدیقی خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتے ہیں۔ کوشش ہوتی ہے کہ ہر موضوع پر مختلف انداز میں لکھیں۔ لیکن معلومات زیادہ سے زیادہ فراہم کریں۔ ”چھٹیاں نمبر“ کے لیے انہوں نے حیدر آباد میں شرافت میاں زبیری کو تلاش کیا۔ شمالی علاقوں میں سیر و ترویج کے لیے جانے میں کیا احتیاط کی جائے۔ کس طرح لطف اٹھایا جائے پر گفتگو کی۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔“

# پنڈی پہنچیں اور ٹور کمپنیوں سے رابطہ کریں

## پروفیسر شاداب احمد صدیقی کی شرافت میاں زبیری سے خصوصی گفتگو

آج کل تعلیمی اداروں میں موسم گرما کی تعطیلات ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے نوجوانوں کی بڑی تعداد اور فیملیز پاکستان کے ٹھنڈے سیاحتی مقامات کا رخ کر رہے ہیں۔ پاکستان قدرتی خوبصورت نظاروں اور حسین وادیوں کا انمول شاہکار ہے۔ جبکہ پاکستان کے چند مقامات ”جنت نظیر“ کی طرح ہیں جنہیں دیکھ کر آپ سوئٹزرلینڈ اور یورپ کو بھی بھول جائیں گے۔ پاکستان کا چپہ چپہ، علاقے خوبصورت جھیلوں، آبشاروں، برف پوش پہاڑوں، لہلہاتے کھیتوں، خوبصورت ریگستانوں اور تاریخی مقامات سے مالا مال ہے۔ پُرفضا خوبصورت اور ہرے بھرے مقامات کا سفر کرنا، سیر و تفریح پارکس کھلے میدان سمندر، ندیوں، پہاڑوں اور آبشاروں کے مقامات پر وقت گزارنے والے افراد میں جذباتی لگاؤ میں بہتری آتی ہے۔ ان کی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں اور صحت پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں اور جسمانی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح محمود شام صاحب ماہنامہ اطراف کے لیے ہر مہینے کی مناسبت سے نت نئے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔

جولائی کے لیے ”چھٹیاں نمبر“ کا انتخاب قابل ستائش ہے۔ چھٹیاں اور تفریح لازم و ملزم ہیں۔ اس موضوع کی مناسبت سے میں نے سیاحت کے ایک دلدادہ جو ہر سال آل پاکستان ٹور پر تفریحی مقامات پر جاتے ہیں ان سے ملاقات کی۔ انہوں نے بہت قیمتی مفید معلومات ماہنامہ اطراف کے قارئین کے لیے فراہم کی ہیں جن کی بدولت ہمارے محترم قارئین استفادہ کر سکتے ہیں۔ میری ملاقات شرافت میاں زبیری صاحب سے خوشگوار

ماحول میں ہوئی۔ تو آیئے شرافت میاں زبیری صاحب سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

**سوال:** سب سے پہلے آپ اپنے بارے میں بتایئے کہ کیا کرتے ہیں؟

**جواب:** میں گورنمنٹ کمپری ہینسیو ہائیر سیکنڈری اسکول لطیف آباد حیدرآباد میں بطور لیب اسسٹنٹ گریڈ 16 میں گزشتہ 30 سال سے خدمات انجام دے رہا ہوں۔

**سوال:** آپ کی تعلیم کتنی ہے؟

**جواب:** میں بی ایس سی ہوں۔

**سوال:** آپ کو سیاحت کا شوق کس طرح ہوا؟

**جواب:** جس وقت میں طالب علم تھا تو 1989ء میں اسکول کے طلبا اور اساتذہ کے ساتھ آل پاکستان ٹور پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے بہت مزہ آیا اور پھر اس طرح شروعات ہوگئی۔ یہ میرا پہلا ٹور تھا۔

**سوال:** آپ کتنی مرتبہ سیاحت کے لیے جا چکے ہیں؟

**جواب:** جب میری سروس ہوگئی تو 1995 میں اپنے اسکول اسٹاف کے ساتھ دوبارہ جانا ہوا۔ اس ٹور میں، ہم اسلام آباد، ناران، کاغان، جھیل سیف الملوک، شوگران، یہ سطح سمندر سے 10600 فٹ بلند شوگران کا اونچا ترین مقام سری پائے ہے۔ سری نیچے کا علاقہ اور بلندی کو پایہ کہا جاتا ہے۔ یہاں ہر طرف سبزہ نظر آتا ہے۔ یہاں پر انرجی ڈرنکس اور ببل گم ہونے چاہیں اسی کو ایک دم منہ میں ڈالیں کیونکہ 10000 فٹ کے بعد سانس لینے میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے اور آکسیجن کی کمی کی وجہ سے کان میں سائیں سائیں ہوتی ہے لیکن اگر آپ متواتر ببل چبائیں گے اور انرجی ڈرنکس لیں گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہاں گھوڑا سواری بھی کیجیے۔

2005 میں اپنی فیملی کے ساتھ لاہور، اسلام آباد، مری، دامن کوہ، راول ڈیم، شکر پڑیاں گھومنے گئے۔ اس ٹور میں امی ابو وائف، بچے، بھائی بھابھی تھے۔ میں 8 مرتبہ سیاحتی مقامات پر جا چکا ہوں اور فیملی کے ساتھ میں 5 مرتبہ گیا ہوں۔ اس کے علاوہ ہم مری، نیو مری، پتریاٹہ جسے منی یورپ بھی کہتے ہیں۔ یہاں کی خاص تفریح چیئر لفٹ اور کیبل کار ہے۔ پیٹریاٹہ، نیو مری لوئر ٹوپا کی سمت میں بڑی پہاڑیوں سے تقریبا 15 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ کیبل کار اور چیئر لفٹ رائیڈ سسٹم 7 کلومیٹر کی سواری پر چلتے ہیں۔ ایبٹ آباد، مانسہرہ، بالاکوٹ، کاغان،

## سیاحت پر جانے والوں کے لیے احتیاطی تدابیر

ناران، بابوسر ٹاپ وادی کاغان کے شمال میں 150 کلومیٹر طویل ایک پہاڑی درہ ہے۔ جو چلاس کو شاہراہ قراقرم سے ملاتا ہے۔ یہ وادی کاغان کا بلند ترین نقطہ بھی ہے۔ گلگت، ایبٹ آباد، ماشہرہ، بالاکوٹ، سترنگی جھیل ہنٹر ویلی، گلگت، ہنزہ عطا آباد جھیل پہاڑ کے ایک حصے کے سرکنے یعنی لینڈ سلائیڈ کے نتیجے میں 2010 میں وجود میں آئی۔ یہ جھیل عطا آباد نامی گاؤں کے نزدیک ہے۔ عطا آباد تحصیل ہنزہ کا آخری گاؤں ہے۔

چائنا باڈر، سوات، کالام۔ہم نے تقریباً 80فی صد آل پاکستان ٹور کیا ہے ۔آخری ٹور 2023 میں کیا تھا۔

**سوال** : ایک ٹور پر کتنے اخراجات آجاتے ہیں اور کس طرح Manage کرتے ہیں؟

**جواب**: ڈیڑھ سے پونے دو لاکھ پانچ افراد کے ساتھ خرچہ ہوتا ہے۔ جہاں تک پیسوں کی بات ہے تو ہر سال گھومنے ے لیے لاٹری ڈالتا ہوں ۔گورنمنٹ تنخواہ بڑھاتی ہے اور میں ان پیسوں سے گھومنے تفریح کے لیے لاٹری ڈالتا ہوں۔

**سوال**: آپ کون سے مہینے میں جاتے ہیں؟

**جواب**: میں اکتوبر یا نومبر میں گھومنے کے لیے جاتا ہوں کیونکہ ان مہینوں میں موسم نا زیادہ ٹھنڈا اور نا ہی زیادہ گرم ہوتا ہے۔موسم معتدل ہوتا ہے۔اگر برف باری دیکھنی ہے تو جنوری یا فروری میں جائیں اور اگر قدرت کے حسین نظارے دیکھنے ہیں تو اکتوبر یا نومبر میں جائیں۔ جون جولائی کے مہینے میں گرمی بہت ہوتی ہے اور برسات کی وجہ سے لینڈ سلائڈنگ کا خطرہ ہوتا ہے۔

**سوال**:۔آپ پاکستان کے سیاحتی مقامات کے بارے میں کیا کہیں گے؟

**جواب** :سب سے زیادہ خوبصورتی اور تفریحی مقامات kpk میں ہیں۔یہاں قدرت کے حسین نظارے خوبصورت منظر کشی دیو مالائی پہاڑ فطرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے پنجاب بہترین ہے۔

**سوال**: دوران سفر کن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے؟

**جواب**: ٹرین کا سفر تکلیف دہ ہوتا ہے۔جن ٹرینوں کا کرایہ بہت زیادہ ہے اور سفر بھی آرام دہ ہے پاکستانی ٹرینوں کا نظام بہت برا ہے۔عام آدمی کے لیے فیملی کے ساتھ بزنس کلاس یا گرین لائن ٹرین میں ٹکٹ مہنگا ہونے کی وجہ سے سفر کرنا مشکل ہے۔

**سوال**: وہاں رہائش کے لیے کیا کرنا چاہیئے؟ ہوٹل کیسے ہیں اور کرایہ کتنا ہے؟

**جواب**: رہائش کا بہترین حل یہ ہے کہ آپ پنڈی پہنچ کر ٹورسٹ کمپنی والوں سے رابطہ کریں۔ان کا پورا پیکیج ہوتا ہے اس میں رہائش، طعام ،ناشتہ، کنوینس، ٹور گائیڈ تمام سفری سہولتیں موجود ہوتی ہیں۔ان سے پورا پیکیج لے لیں اور بے فکر ہو کر فیملی کے ساتھ آسانی سے انجوائے کریں۔ یہ ٹورسٹ کمپنیاں اچھے ہوٹل اور معیاری کھانا فراہم کرتے ہیں۔آپ کا وقت بچے گا اور تمام جگہیں آپ آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔اس میں سیفٹی بھی ہے اس کے علاوہ آپ اپنے مقامی شہر میں موجود ٹورازم کارپوریشن کے دفاتر یا ٹورسٹ کمپنیوں کے ذریعے ٹور پر جائیں۔

**سوال**: تفریحی مقامات پر مقامی لوگوں کا رویہ کیسا ہے؟

**جواب** : مری کے لوگوں کا رویہ اور برتاؤ بہت خراب ہے۔ یہاں ہوٹلوں کا کرایہ بہت زیادہ ہے اور کھانے بھی معیاری مزیدار نہیں ہیں مہنگے بھی ہیں۔مقامی لوگ سیزن میں یہاں آئے ہوئے سیاحوں کو بلیک میل کرتے ہیں ۔مری ایک ایسا سیاحتی مقام ہے جس کے وسائل اور سہولتیں محدود ہیں لیکن سیاحوں کا ہجوم روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دیگر پہاڑی مقامات کی نسبت یہ میدانی علاقوں سے زیادہ نزدیک ہے۔زیادہ لوگ آسانی سے کم وقت اور کم بجٹ میں اس خوبصورت مقام پر جا سکتے ہیں اگر ٹورازم محکمہ ان نجی ہوٹلوں اور ریسٹورنٹس کو ریگولیٹ کرے تو بہت سی شکایات دور ہو سکتی ہیں۔گلگت اور پاکستان

> **سیاحت سے ذہن تازہ**
> **جسم فعال۔ مایوسی ختم**

کے پی کے مقامی لوگ اور تاجر مہمان نواز ہیں ۔ یہاں کے لوگ پر خلوص ہیں رویہ بہت اچھا ہے اور یہ ملنسار ہیں۔

**سوال** : ہمارے قارئین جو سیاحت کے لیے جانا چاہتے ہیں تو آپ اُن کو کیا احتیاطی تدابیر بتائیں گے؟

**جواب**: سب سے پہلے کپڑے موسم کے حساب سے رکھیں اگر سردی میں جا رہے ہیں تو گرم کپڑے لازمی رکھیں، بارش سے بچنے کے لیے چھتری، فرسٹ ایڈ کے لیے ضروری ادویات، خشک کھجور ببل گم، راستے کے لیے گھر سے کھانا اور پینے کا پانی لے لیں۔ٹورسٹ کمپنی سے رابطہ لازمی کریں۔ چائنا بارڈر پر خشک خوبانی ملتی ہے اسے چبائیں۔اونچائی

> **تفریحی مقامات پر ڈاکٹروں کی موجودگی**
> **اور طبی سہولتوں کو یقینی بنایا جائے**

کی وجہ سے کانوں میں سائیں سائیں نہیں ہوگی۔

**سوال**: کیا آپ وہاں شاپنگ بھی کرتے ہیں؟

**جواب**: جی بالکل ساتھ میں خواتین ہوں اور شاپنگ نہیں ہو یہ ممکن نہیں ہے۔وہاں سے احباب دوستوں کے لیے تحائف بھی لاتے ہیں خاص طور پر ڈرائی فروٹ، ہر شہر کی سوغات لیتے ہیں۔

**سوال**: سیاحت سے صحت پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

**جواب**: ذہن فریش ہوتا ہے۔جسم متحرک ہوتا ہے۔تازہ ہوا ملتی ہے۔ ذہنی سکون ملتا ہے۔اینزائٹی اور ڈپریشن ختم ہو جاتا ہے۔

**سوال**: پاکستان میں ٹورازم کے فروغ کے لیے حکومت کو کیا اقدامات کرنا چاہئیں؟اس سے پاکستان کی معیشت کو کیا فائدہ ہوگا؟

**جواب** : سیاحت کا فروغ معیشت کے لیے اچھی بات ہے۔ حکومت سیاحت کے فروغ اور سیاحتی مقامات میں اور مشکلات کو قابو پانے کے لیے پاکستان ٹورازم محکمہ کو فعال بنائے ۔وہاں سہولتیں بہتر بنانے کی سفارشات پر مبنی ایک جامع حکمت عملی بنا کر اس پر عملدرآمد کیا جائے ۔ان دور دراز علاقوں میں ڈاکٹروں کی عدم دستیابی کا مسئلہ بھی رہتا ہے۔میدانی علاقوں کے سیاح سرد مقامات پر جاتے ہیں تو انہیں بلند مقام پر ٹھنڈ لگنے سے تکلیف ہو سکتی ہے۔حکومت یہاں پر

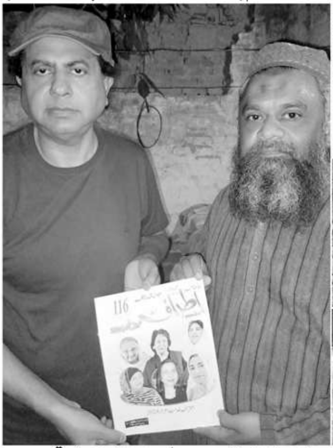

ڈاکٹروں کی تعیناتی اور ضروری طبی سہولتوں کی فراہمی کو یقینی بنائے۔ سیاحت بڑھانے کی خاطر مقامات کی خوبصورتی، دلکشی کافی نہیں ۔ان جگہوں پر امن و امان اور تحفظ کی اچھی صورتحال اور قیام و طعام کی سہولتیں، صفائی ستھرائی اور با اخلاق میزبانی، ٹوائلٹ، واش روم جیسی چیزوں کا ہونا بھی لازمی عوامل ہیں۔

**سوال** : ماہنامہ اطراف چھٹیاں نمبر جولائی میں شائع کر رہا ہے؟ اس حوالے سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

**جواب** : یہ ایک بہترین عمدہ اقدام ہے۔سیاحت کے فروغ میں مثبت کاوش ہے۔ اس عمل سے سیاحت پر جانے والی فیملیز مفید مشوروں سے مستفید ہو سکیں گے اور مکمل رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ پاکستان ٹورازم کے فروغ میں ماہنامہ اطراف بھی اپنا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ میں محترم محمود شام کا ممنون اور شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اس اہم موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا موقع فراہم کیا۔

## مری کا سفراور علی کی جیکٹ

’چھڈیاں نمبر‘ میں بھی ’اطراف‘ کے قلمی سرپرستوں اور معاونین کا تعاون حوصلہ افزا ہے۔ ریحانہ اعجاز شاعرہ ہیں۔ نثرنگار ہیں۔ بچوں کے لیے لکھتی ہیں۔ ہمارے جھنگ کے ساتھی عبداللہ رفیق کی صاحبزادی ہیں۔ مطالعہ بھی بہت ہے۔ مشاہدہ بھی۔ اور مشترکہ خاندان کی عملاً حامی مری کے ایک روزہ سفر کی روداد سنیں۔ علی کی جیکٹ کو یاد رکھیں۔

# سب چیئرلفٹ کی سیر۔ سامان کے ساتھ کون رکے گا

تحریر: ریحانہ اعجاز، ڈیفنس

یوں تو زندگی کے سفر میں بے شمار دن سیر و سیاحت وتفریح کی نذر ہوئے ہیں مگر کچھ دن الف لیلوی کہانی بن کر اپنے طلسم میں گرفتار رکھے ہوئے ہیں۔ عہد گم گشتہ پر نظر ڈالوں تو وہ بہت سے خوش گوار اور انمول دن جو مٹھی سے پھسلتی ریت کی مانند گزر تو گئے لیکن وقت کی دھول میں گم ہو کر بھی دل پر روز روشن کی طرح جگمگاتے محسوس ہوتے ہیں۔ یوں تو کوہ مری کی برف پوش وادیوں میں کئی بار سیر وتفریح کی

## کم سن علی نے بلندی کا ڈر جلد ہی اڑا دیا

غرض سے جانا ہوا ہے، میں آج مری کے سفر کی ایک خوبصورت و یادگار روداد اطراف کے صفحات کے حوالے کرنا چاہوں گی۔
یہ ان دنوں کی بات ہے جب بچے اسکول جایا کرتے تھے۔ آج سے قریباً گیارہ سال قبل دسمبر 2013 میں دسمبر کی چھٹیوں میں بچوں کی فرمائش پر اسلام آباد کا رخ کیا جہاں بڑے بھائی نعیم خالد اور چھوٹے بھائی علی عمران G9 کراچی کمپنی میں، جبکہ بہن رابعہ وہاب بنی گالا میں رہائش پذیر تھے۔ میں اپنے دو بچوں (علینہ بنت اعجاز علی بن اعجاز) اور کراچی میں مقیم بڑے بھائی ندیم کی فیملی کے ساتھ اسلام آباد بڑے بھائی کے گھر پہنچی۔ ان دنوں چھوٹی بہن رابعہ وہاب بھی بنی گالا سے آئی ہوئی تھی اور بڑے بھائی کے گھر ہی مقیم تھی۔

دو چار دن بعد مری کی سیر کا پروگرام بنایا گیا تو نعیم بھائی نے فیصل آباد میں مقیم امی اور دیگر بہن بھائیوں کو بھی اس سیر میں شامل ہونے کے لیے فون کر ڈالا۔
پورے ملک میں چھٹیوں کا دور دورہ تھا سو فیصل آباد سے بھی امی جان، بہن رضوانہ ارشد، بہن نزہت عابد اور بڑے بھائی عظیم بمعہ فیملی

کے دوسرے دن ہی بذریعہ موٹروے اسلام آباد آ پہنچے۔
یوں ہم سب کل مل ملا کے 32 افراد ہو گئے تھے جو مری جانے لیے تیار تھے۔ شام میں فیصل آباد سے اسلام آباد پہنچنے والے افراد تھکن کے باوجود مری جانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ ہم بہنوں نے مل کر کراچی کمپنی کی مارکیٹ کا رخ کیا، بڑوں اور بچوں کے لیے دستانے، گرم موزے، اسکارف اور دیگر چھوٹا موٹا سامان خریدا۔

## بڑی چادر پر گھر سے لائی گئی مزیدار بریانی کا لطف

سب بھائی گھر پر مل کر اس سامان کی فہرست بنانے میں مصروف تھے جو مری ساتھ لے کر جاتے۔ کھانے پینے اور دیگر استعمال کی اشیاء کی فہرست مرتب کی جا رہی تھی۔ بھابیاں مل کر کچن میں پکوان تیار کر رہی تھیں۔ چاند رات کا سماں لگ رہا تھا۔ دیر رات گئے سب سونے لیٹے تو جیسے سب کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ پھر بھی دو تین گھنٹے سب نے نیند لے ہی ڈالی۔
صبح ناشتے کے بعد دس بجے کے قریب فیض آباد کے اڈے سے ایک عدد ہائی روف بک کروائی گئی معہ ڈرائیور۔ اور ہمارا سفر شروع ہوا۔ زیادہ تر سفر خوش گپیوں میں طے کیا گیا۔

سب سے پہلے چیئر لفٹ کا پروگرام بنایا گیا اور طے یہ ہوا کہ ایک بندہ سامان کے ساتھ وہیں رکے گا باقی سب چیئر لفٹ کی سیر کو جائیں گے ۔ اور یہ بہت مشکل فیصلہ تھا کہ کون رکے گا ؟ کیونکہ سبھی جانا چاہتے تھے ۔

اس مشکل فیصلے کو بڑے بھائی نعیم نے اپنے ازلی نرم دوستانہ رویے

**اس سفر میں امی جان سمیت سارے بہن بھائیوں کا ساتھ پھر کسی سفر میں ممکن نہ ہوا**

سے آسان بناتے ہوئے خود رکنے کا فیصلہ کیا تو امی نے بھی چیئر لفٹ پر جانے کی بجائے نعیم بھائی کے پاس رکنے کا عندیہ دے ڈالا جو امی کی تھکاوٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے مان لیا گیا۔

چیئر لفٹ کے لیے جب ٹکٹس لینے والی لائن میں لگے تو ایک لمبی قطار صرف ہماری فیملی کی تھی۔ سب دو دو کر کے چیئر لفٹ میں سوار ہوئے ۔ بچوں کی خوشی دیدنی تھی۔

میرا شہزادہ علی پہلی بار چیئر لفٹ میں سوار ہو رہا تھا سو خاصا ڈر رہا تھا لیکن بظاہر بہادری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

وہ میرے ساتھ چیئر لفٹ میں بیٹھنے کا خواہشمند تھا سو ہم دونوں ماں بیٹا بیٹھے۔

جوں ہی چیئر لفٹ فضا میں بلند ہوئی علی نے اپنے ڈر کو بلند آوازوں میں اڑاتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ بالکل نہیں ڈر رہا۔

پیچھے مڑ کر اپنے کزنز کو دیکھتے ہوئے، اور سامنے سے آنے والی برابر سے گزرنے والی چیئر لفٹ پر بیٹھے افراد پر شوخ جملے کستا ہوا علی جلد اس فضائی کارروائی سے لطف اٹھانے لگا۔ چیئر لفٹ سے اتر کر سب گھومتے ہوئے مختلف چیزوں سے لطف اٹھاتے ہوئے ونڈو

**جلد ہی پوتا یوسف چاچو کی جیکٹ پہنے گا**

شاپنگ کرتے رہے اور جلد ہی واپسی کے لیے دوبارہ چیئر لفٹ میں سوار ہو گئے ۔ واپس آئے تو نعیم بھائی سلنڈر پر سب کے لیے مزیدار کافی تیار کیے ہمارے منتظر تھے ۔ ہم نے ساتھ لائے ہوئے مالٹے مری کی نرم نرم برف میں دبا دیے تھے ۔

کافی پینے کے بعد جب مالٹے نکالے تو وہ پوری طرح جم کر ہارڈ کاک بال بن چکے تھے ۔ شدید سرد موسم میں برف پر کھڑے ہو کر وہ برفیلے مالٹے کھانے کا مزہ آج تک زبان پر محسوس ہوتا ہے۔

ابھی تک ہم سب ساتھ ساتھ تھے لیکن پھر سب مختلف ٹولیوں میں بٹ کر کوئی کسی طرف نکل گیا تو کوئی کسی طرف ۔ ہم پانچ افراد مال روڈ کی سیر کرتے ہوئے شاپنگ کرنے لگے ۔ اونی ٹوپیاں، لکڑی کے کی چین ، شیشے والی رنگا رنگ ٹوپیاں اور جیکٹس ، اسی طرح کی بے شمار چھوٹی چھوٹی چیزیں اپنے لیے اور احباب کے لیے خرید

ڈالیں ۔ بعد ازاں سب نے گھڑ سواری کی ۔ اور جب بھوک لگی تو نعیم بھائی کا رخ کیا کہ وہ بڑی خوش دلی سے مستقل ایک جگہ ڈیرہ لگائے بیٹھے تھے ۔

ہم سب رفتہ رفتہ پھر ایک جگہ جمع ہو گئے تو ایک بڑی چادر بچھا کر گھر سے لائی گئی مزیدار بریانی کا لطف اٹھانے لگے جو نعیم بھائی سلنڈر پر ہمارے پہنچنے تک گرم کر چکے تھے ۔ بریانی کے بعد ڈھیروں کے حساب سے لائے گئے کیلوں سے انصاف کیا گیا جبکہ بچہ پارٹی وقتاً

فوقتاً اسنیکس کا استعمال بھی کر رہی تھی ۔ چائے بھی تیار ہو چکی تھی ۔ سب مزیدار چائے سے ٹھنڈک کو مات دینے کی کوشش کرنے لگے لیکن سردی تو لگتا تھا ہڈیوں میں سرایت کرتی جا رہی ہے ۔

شام کا دھندلکا پھیلتے ہی سب نے مل کر سامان سمیٹنا شروع کر دیا کہ رات ہونے سے پہلے ہمیں واپس اسلام آباد پہنچنا تھا کہ آرام بھی ضروری تھا کیونکہ دوسرے دن فیصل مسجد کے ساتھ ساتھ چڑیا گھر کی سیر کا پروگرام تھا۔

اس ٹرپ کے بعد سے تادم تحریر میں اپنی فیملی کے ساتھ ان گنت ٹرپس پر گئی ، بہت سے تفریحی مقامات کی سیر کی لیکن امی جان سمیت سارے بہن بھائیوں کا ساتھ ممکن نہ ہوا سو یہ تفریح ہمیشہ کے لیے یادگار بن گئی۔

اس تفریح سے وابستہ اک اور خوبصورت یاد ہے "جیکٹ"۔ اس ٹرپ میں سبھی بچوں نے موٹی موٹی جیکٹس پہن رکھی تھیں جو اتفاقاً سبھی کی ایک جیسی تھیں موٹی، موٹی پھولی ہوئی، بلو، وائٹ اور یلو کنٹراس کی۔ پیراشوٹ کپڑے کی بنی ہوئی اندرونی ساخت گرم فر کی بنی ہوئی۔ علی کی جیکٹ بھی اسی طرح کی تھی جو خاصی مہنگی بھی تھی اور گیارہ سال قبل لی جانے والی وہ جیکٹ علی نے صرف اس وقت مری میں پہنی ، دوبارہ اسے پہننے کی نوبت نہیں آئی کہ جب کبھی سردیوں میں اسے پہننے کے لیے کہا علی نے جواب دیا" یہ مری میں پہنتے ہیں" لاکھ کہنے پر بھی نہ پہنی کہ وہ دوبارہ مری جب گیا تو جیکٹ چھوٹی ہو چکی تھی اور علی بڑا۔

ہم بہن بھائی عموماً بچوں کے کپڑے ایک دوسرے کو دے دیا کرتے تھے لیکن وہ جیکٹ میں نے کسی کو نہیں دی وجہ یہ کہ سبھی کے پاس ویسی ہی جیکٹ موجود تھی اور ایک بار پھر مری ٹرپ کے شاید دو سال بعد کی بات ہے میں نے سردیوں میں علی کو جیکٹ دی پہننے کے لیے تو اس نے پچھلے سال کی طرح پہننے سے انکار کر دیا کہ یہ مری میں پہنتے ہیں ، میں نے بھی اصرار نہ کیا کہ وہ ویسے بھی چھوٹی ہو چکی تھی ۔ دس سالہ علی کی جیکٹ میں نے یہ کہتے ہوئے پیک کر دی کہ یہ میں اپنے پوتے کو پہناؤں گی جبکہ میرا بڑا بیٹا محض پندرہ سال کا تھا اور دور دور تک اس کی شادی کے آثار نہ تھے ۔

اور آج جب انکل شام کی فرمائش پر بچوں کے سنگ تفریحی مقامات کی سیر پر لکھنے کا قصد کیا تو جھٹ سے وہ جیکٹ بھی یاد آ گئی جو آج بھی ایک دم نئی ہے اور میرا پوتا یوسف دو سال کا ہو چکا ہے کوئی دن جاتا ہے جب یوسف چاچو کی جیکٹ میں ملبوس میرے سامنے کھڑا ہو گا ۔ ان شاء اللہ ۔ ❀

# ’اطراف‘ کے خیر خواہ قیصر مفتی کا انتقال پر ملال

ایک دردمند پاکستانی۔معیشت بالخصوص ٹیکس کے مختلف شعبوں کے ماہر۔ بہت بامروت۔ نرم لہجے والے قیصر مفتی 28 مئی کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ماہنامہ ’اطراف‘ کے اجراء سے پہلے ہم نے ملک بھر کی جن 100 شخصیات سے مشاورت کی تھی قیصر مفتی ان میں سرفہرست تھے۔ ہفت روزہ ’معیار‘، روزنامہ ’جنگ‘ کے دنوں میں بھی ان کی سرپرستی حاصل رہی ماہنامہ ’ٹوٹ بٹوٹ‘ کی تقریبات اور خاص طور پر تنقیدی نشست میں وہ اپنے صاحبزادے عدنان مفتی کو میٹنگ میں شمولیت کے لیے لاتے تھے۔ عدنان مفتی اب ماشاء اللہ خود ایک نامور مشیر ٹیکس ہیں۔ قیصر مفتی انسٹی ٹیوٹ آف کاسٹ اینڈ مینجمنٹ اکاؤنٹس کے بانیوں میں شمار ہوتے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ آف کارپوریٹ سیکرٹریز آف پاکستان میں بھی اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف پبلک فنانس اکاؤنٹس (PIPFA) کے بانی رکن اور پہلے صدر کی حیثیت سے ان کی خدمات قوم کی تعمیر میں قابل ذکر ہیں۔

تعلیم۔ کارپوریٹ۔ مالی قوانین۔ بینکاری۔ مالی تجزیات۔ صنعتی ترقی کے شعبوں میں ان کی رائے کو ہمیشہ وقیع خیال کیا جاتا تھا۔ اپنے چار دہائیوں کے اس طویل سفر میں وہ کویت انوسٹمنٹ کے ڈائریکٹر فنانس۔ چیف ایگزیکٹو پیراماؤنٹ انوسٹمنٹس۔ چیئرمین جائنٹ کمیٹی آف چارٹرڈ اکاؤنٹس اور آئی سی ایم اے۔ ممبر اخلاقیاتی کمیٹی فاؤنڈیشن فیڈریشن آف اکاؤنٹنٹس۔ آئی سی پی کے میگزین۔ سہ ماہی کارپوریٹ سیکرٹری کے چیف ایگزیکٹو۔ اور کئی دوسرے عہدوں پر بہت ہی کامیابی سے ملکی مالیاتی معاشی اور اقتصادی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

’اطراف‘ اپنے خیر خواہ اور مخلص سرپرست قیصر مفتی صاحب کی رحلت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے عدنان مفتی اور اہل خانہ سے دلی تعزیت۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ اہل خانہ سے گزارش ہے کہ قیصر مفتی صاحب کی انگریزی اُردو تحریروں کو جلد کتابی شکل میں محفوظ کرنے کا اہتمام کریں۔ ❁

## ہر باپ عظیم۔ لائق تعظیم

'اطراف' کا یہ سلسلہ 'ہر باپ عظیم۔ لائق تعظیم' بھی اُردو رسالوں میں سب سے مختلف۔ سب سے متنوع رہا۔ الحمد للہ۔ بہت پذیرائی ہو رہی ہے۔ ہر روز ہی کسی کرم فرما کی تحریر مل جاتی ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ مختصر اظہار خیال کریں۔ طویل خراج تحسین روکنا پڑ رہے ہیں۔ وہ بھی کسی وقت شامل اشاعت ہوں گے۔ ملک کے ہر گوشے سے ہی تحریریں مل رہی ہیں آپ جیسا بھی لکھ سکتے ہیں ارسال کریں۔ ہم ان کی نوک پلک سنوار لیں گے۔ اس بار۔ فرزین لہرا کراچی۔ رانا محمد شاہد بورے والا۔ فریدہ انجم پٹنہ بھارت۔ شاہین رشید کراچی۔ طوبیٰ خلیل مظفر گڑھ۔ علی فیصل ملیر کینٹ کراچی۔ جویریہ یاسمین میرپور آزاد کشمیر۔ ریحانہ اعجاز کراچی ڈیفنس۔ ممتاز قلم کار کئی کتابوں کے مصنف میر حسین علی امام کی تحریریں شامل ہیں۔ ایک الگ حاشیوں میں میری ہمشیرہ سکینہ ناصر کی تحریر۔ نبی اکرم ﷺ بطور والد محترم پیش خدمت ہے۔ اس کے علاوہ بچی معذور باپ کا بازو۔ دیوار پر والد کے ہاتھوں کے نشان۔ سوشل میڈیا سے۔

# حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''باپ بیٹی کا رشتہ''۔ سب سے زیادہ اہمیت دی

تحریر: سکینہ ناصر، کراچی

سرورِ کونین آقائے دو جہاں خاتم النبیین ﷺ نے یوں تو ہر رشتہ ہی بحسن و خوبی نبھایا اور امت کو ایک بہترین مثال پیش کی۔ لیکن جس رشتے کو ہمیشہ سب سے زیادہ اہمیت دی وہ ہے ''باپ بیٹی کا رشتہ''۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ جاہلیت کا دور تو بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کا دور تھا۔۔ ایسے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ پاک نے چار صاحب زادیاں۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا۔ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور جنت کی خواتین کی سردار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا عطا فرمائیں۔

### حضرت فاطمہؓ اور والد محترم ﷺ

آپ ﷺ کو اپنی چاروں ہی صاحب زادیاں بہت پیاری تھیں لیکن سب سے زیادہ محبت آپ ﷺ کو حضرت فاطمہؓ سے تھی اور خود حضرت فاطمہؓ کو بھی آپ ﷺ سب سے زیادہ محبوب تھے۔

قریش کی دشمنی جب ابتدائے اسلام میں انتہائی عروج پر تھی اور وہ آپ ﷺ کو نہ صرف یہ کہ کعبہ میں نماز پڑھنے سے روکتے تھے بلکہ آپ ﷺ کو تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ کعبہ شریف میں نماز پڑھ رہے تھے جب آپ ﷺ سجدے کی حالت میں تھے تو عقبہ بن معیط نے اُونٹ کی اَوجڑی آپ ﷺ کی پشت مبارک پر لا رکھی نبی ﷺ اُسی طرح سجدہ میں تھے کہ حضرت سیّدہ فاطمۃ الزھرہؓ آئیں اور اُنہوں نے آپ ﷺ کی پشت سے اوجڑی گرائی اور عقبہ بن معیط کو بد دعا دی۔

> بیٹیوں میں سب سے زیادہ محبت حضرت فاطمہؓ سے

مسور بن مخرمہ سے روایت ہے' رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا: ''فاطمہؓ میرے جسم کا ٹکڑا ہے جس نے اِنہیں ناراض کیا اُس نے مجھے ناراض کیا اور ایک روایت ہے جو چیز اِنہیں پریشان کرے مجھے پریشان کرتی ہے اور جو اِنہیں تکلیف دے وہ مجھے ستاتا ہے۔

تمام مسلمانوں کے نزدیک آپ ایک برگزیدہ ہستی ہیں۔۔

ولادت 20 جمادی الثانی بروز جمعہ بعثت کے پانچویں سال میں مکہ میں ہوئی۔ آپؓ کی شادی حضرت علی ابن ابی طالبؓ سے ہوئی جن سے آپ کے دو بیٹے حسنؓ اور حسینؓ اور دو بیٹیاں زینبؓ اور ام کلثومؓ پیدا ہوئیں۔ آپ کی وفات اپنے والد کی وفات کے کچھ ماہ بعد 632ء میں ہوئی۔

### سیدہ زینبؓ بنت محمد ﷺ

(پیدائش: 600ء۔ وفات: مئی/ جون 629ء) پیغمبر اسلام حضرت ﷺ کی پہلی صاحبزادی اور دوسری اولاد تھیں۔ وہ قاسم بن محمد کے بعد پیدا ہوئی تھیں۔ حضرت زینب آنحضرت ﷺ کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں۔ آپ بعثتِ نبوی سے دس برس پہلے پیدا ہوئیں۔ اس وقت آپؐ کی عمر 30 برس تھی۔ آپ اوّلین مسلمان ہونے والوں میں سے تھیں۔ مشرکین مکہ کی جانب سے حضور ﷺ اور آپ کے اہل و عیال کو جو تکلیفیں پہنچیں، ان سب میں آپ اور آپ کی بہنیں شریک رہیں۔ آپؓ بالخصوص تکالیف کے دور میں حضور ﷺ کو معاونت اور مدد بہم پہنچاتیں۔ مکہ کے مشکل ترین دور میں کہ جب حضور ﷺ اور آپؓ کے اہل خانہ پر روزانہ مصائب کے پہاڑ توڑے جاتے، آپ ﷺ اپنی اس ہونہار صاحبزادی کو تسلی

دیتے کہ: ''دینِ حق کی حمایت میں کھڑے ہونے پر اللہ تعالیٰ تمھارے والد کا حامی و ناصر ہے۔ تم اپنے ابا پر مت خوف کھاؤ''۔ سنہ 7 نبوی میں آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو شعبِ بن ابی طالبؓ میں قید کیا گیا۔ وہاں آپ ﷺ تین برس تک قید رہے اور فاقوں پر فاقے گذرے۔ ان سب مصائب میں حضرت خدیجہؓ اور آپ ﷺ کی سب ہی اولاد شریک رہی۔ حضرت زینبؓ کو جو تکلیف پہنچی، اس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''وہ میری سب سے اچھی بیٹی تھی، جو میری محبت میں ستائی گئی''۔ حضرت زینبؓ کا نکاح ابوالعاص بن ربیع سے ہوا، جو حضرت زینبؓ کے خالہ زاد تھے۔ وہ تجارت میں امانت داری کے حوالے سے مشہور تھے۔ نبوت کے تیرہویں سال جب آنحضرت ﷺ نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو آپ ﷺ کے اہل وعیال مکہ میں رہ گئے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی اہلیہ حضرت سودہؓ اور اپنی صاحبزادیوں حضرت فاطمہؓ اور حضرت اُم کلثومؓ کو مدینہ منورہ بلا لیا، لیکن حضرت زینبؓ اپنے شوہر کے پاس ہی رہیں۔ یہاں تک کہ غزوۂ بدر ہوا اور اس میں آپؓ کے شوہر ابوالعاص کفار کی طرف سے شریک ہوئے اور گرفتار ہوگئے۔ انھیں اس

**حضرت اُم کلثومؓ حضرت عثمانؓ بن عفان کے ساتھ خوشگوار گھریلو زندگی**

شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ مکہ جا کر حضرت زینبؓ کو مدینہ منورہ بھیج دیں گے۔ اس طرح آپؓ نے اپنے شوہر کو حالتِ شرک ہی میں چھوڑ کر سنہ ہجری میں غزوۂ بدر کے بعد مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ اس کے بعد ایک موقع پر پھر آپؓ کے شوہر ابوالعاص گرفتار ہو کر مدینہ لائے گئے تو حضرت زینبؓ نے ان کو پناہ دی۔ ابوالعاص بن الربیعؓ نے مکہ جا کر لوگوں کی امانتیں حوالہ کیں اور اسلام لائے اور ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے۔ حضرت زینبؓ نے ان کو حالتِ شرک میں چھوڑا تھا، اس لیے دونوں میں باہم تفریق ہوگئی تھی۔ وہ مدینہ آئے تو زینبؓ دوبارہ ان کے نکاح میں آگئیں۔

## اُم کلثوم بنت محمد ﷺ

18) ق۔ھ/9ھ) حضور اقدس ﷺ کی تیسری صاحبزادی تھیں۔ آپؓ بعثتِ نبویؐ سے 6 سال پہلے مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں۔ حضور اکرم ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد اسلام قبول کرنے والی خواتین میں اپنی والدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے ساتھ اپنی بہنوں اور دیگر اسلام قبول کرنے والی خواتین کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ گہوارۂ نبویؐ میں علم و اخلاق اور پیکرِ حسن حیا کے عمدہ فطری ماحول میں پروان چڑھیں۔ تمام انسانی، دینی اور نسوانی خوبیوں کی حامل

**حضرت زینبؓ ۔ میری سب سے اچھی بیٹی ۔ میری محبت میں ستائی گئی**

تھیں۔ مکی زندگی کی مشکلات میں دینِ حق اور اجتماعی تحریک میں صحابہ کرامؓ اور اہلِ بیت نبی کریم ﷺ میں صبر واستقامت کے ساتھ احیائے دین اور غلبۂ دین کی عظیم الشان جدوجہد میں اسوۂ کامل کا معیار ٹھہریں۔ حضور ﷺ کی معیت میں خاندان کے ساتھ تین سال کے قریب شعبِ ابی طالب کی مشکلات جھیلیں اور مکہ کے مشرکانہ نظام کے ظلم کا شکار رہیں۔ اُم کلثومؓ اپنی ماں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے ساتھ بہت مشابہت رکھتی تھیں۔ ان کے دل کا سرور اور آنحضرت ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھیں۔ اپنی دونوں بڑی بہنوں کی شادی کے بعد گھریلو سرگرمیوں میں ماں کا ہاتھ بٹاتیں اور ابا جان کی آنکھوں میں مقام صدق و حیا کی تصویر تھیں۔ مکی زندگی کے آخری سالوں میں ماں کی جدائی کا صدمہ برداشت کیا۔ آپ ﷺ اپنے دینی وعلمی کاموں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں کا خیال بھی رکھتے تھے۔ ایک طرف سیّدہ اُم کلثومؓ ہیں، دوسری طرف جنت کی عورتوں کی سردار سیّدہ فاطمہؓ ہیں۔ گھریلو امور میں نگرانی، مشاورت، حفاظت، رہنمائی کے حوالے سے آپ ﷺ اپنی بیٹیوں کے دلوں کی آواز شدت سے محسوس فرماتے اور ان کو اپنی شفقت سے فیضیاب فرماتے۔ اُم کلثومؓ کی نسبت ابولہبؓ کے بیٹے عتیبہ کے ساتھ طے تھی۔ اس نے محض حضور ﷺ کو دکھ پہنچانے کے لیے رخصتی سے قبل ہی اُم کلثومؓ کو طلاق دے دی۔ حضور اقدس ﷺ کی دوسری صاحبزادی سیّدہ رُقیہؓ حضرت عثمانؓ کے نکاح میں تھیں، ان کی وفات کے بعد ربیع الاوّل 3 ہجری میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سابقہ مہر کی مقدار پر حضرت اُم کلثومؓ کا نکاح بھی حضرت عثمانؓ بن عفان سے نکاح کر دیا۔ حضرت اُم کلثومؓ کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ 6 سال تک حضرت عثمانؓ بن عفان کے ساتھ خوشگوار گھریلو زندگی بسر کرنے کے بعد شعبان 9 ہجری میں حضرت اُم کلثومؓ کا انتقال ہوگیا۔ آپؓ کے غسل وکفن کے انتظامات کی حضور ﷺ نے خود نگرانی فرمائی، خود نمازِ جنازہ پڑھائی اور آپؓ کی مغفرت کی دعا مانگی۔ تمام صحابہ کرامؓ نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ آپؓ کی تدفین جنت البقیع میں ہوئی۔ سیّدہ اُم کلثومؓ کی وفات کا آپ ﷺ کو سخت ملال ہوا۔ ''صحیح بخاری'' میں ہے کہ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک بار آپؐ اُم کلثومؓ کی قبر پر تشریف فرما تھے اور آپ ﷺ کی آنکھوں سے شدتِ غم کی وجہ سے آنسو جاری تھے۔

## حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا

آپ اعلان نبوت سے سات برس پہلے جب کہ حضور ﷺ کی عمر شریف کا تینتیسواں سال تھا پیدا ہوئیں اور ابتدا اسلام ہی میں مشرف بہ اسلام ہوگئیں۔ پہلے آپ کا نکاح ابولہب کے بیٹے ''عتبہ'' سے ہوا تھا لیکن ابھی آپ کی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ ''سورہ تبت یدا'' نازل ہوگئی۔ ابولہب قرآن میں اپنی اس دائمی رسوائی کا بیان سن کر غصہ میں آگ بگولا ہوگیا اور اپنے بیٹے عتبہ کو مجبور کر دیا کہ وہ حضور ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کو طلاق دے دے۔ چنانچہ عتبہ نے طلاق دے دی۔ اس کے بعد حضور اقدس ﷺ نے حضرت رقیہؓ کا نکاح حضرت عثمان بن عفانؓ سے کر دیا۔ نکاح کے بعد حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت بی بی رقیہؓ کو ساتھ لے کر مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی پھر حبشہ سے مکہ واپس آ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اور یہ میاں بیوی دونوں ''صاحب

**حضرت رقیہؓ حضرت اُم کلثومؓ سے پہلے حضرت عثمانؓ کے نکاح میں تھیں**

الہجرتین'' (دو ہجرتوں والے) کے معزز لقب سے سرفراز ہوگئے۔ جنگِ بدر کے دنوں میں حضرت رقیہؓ بہت سخت بیمار تھیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے حضرت عثمان غنیؓ کو جنگِ بدر میں شریک ہونے سے روک دیا اور یہ حکم دیا کہ وہ حضرت بی بی رقیہؓ کی تیمارداری کریں۔ حضرت زید بن حارثہؓ جس دن جنگِ بدر میں مسلمانوں کی فتح مبین کی خوشخبری لے کر مدینہ پہنچے اسی دن حضرت بی بی رقیہؓ نے بیس سال کی عمر پا کر وفات پائی۔ حضور ﷺ جنگِ بدر کے سبب سے ان کے جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔ حضرت عثمان غنیؓ اگرچہ جنگِ بدر میں شریک نہ ہوئے لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے ان کو جنگِ بدر کے مجاہدین میں شمار فرمایا اور جنگِ بدر کے مالِ غنیمت میں سے ان کو مجاہدین کے برابر حصہ بھی عطا فرمایا اور شرکا جنگِ بدر کے برابر اجرِ عظیم کی بشارت بھی دی۔ حضرت بی بی رقیہؓ کے شکم مبارک سے حضرت عثمان غنیؓ کے ایک فرزند بھی پیدا ہوئے تھے جن کا نام ''عبدہ'' تھا۔ یہ اپنی ماں کے بعد سن 4ھ میں چھ برس کی عمر پا کر انتقال کر گئے۔

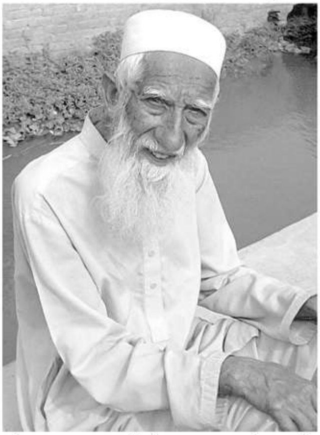

# میرے ابو کو اپنی ضرورت سے زیادہ بچوں کی ضروریات کی فکر رہتی

## ریٹائرمنٹ کے بعد ہر سال تبلیغ پر جاتے۔رانا محمد شاہد، بورے والا

والدین میں سے ماں کی عظمت واہمیت پر تو بہت لکھا گیا ہے مگر ایک باپ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت اور دیگر ضروریات کے لیے جن مصائب ومشکلات سے گزرتا ہے، وہ بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ایک باپ کا سایہ اولاد کے لیے شجر سایہ دار کی مانند ہے۔باپ کا وجود اولاد کو زندگی کی مشکلات سے لڑنے اور ایک تحفظ کا احساس دلاتا ہے۔معروف افسانہ نگار بانو قدسیہ نے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔"ایک طرح کی پژمردگی ان گھروں میں ضرور ہوتی ہے۔جن میں والد نہ ہوں۔خاص طور پر لڑکیوں میں یہ کمی کوئی پوری نہیں کرسکتا"۔یہاں۔مجھے اپنے ہی شہر کے معروف شاعر افتخار حسین الفی کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

ماں کے جیسا نہیں مخلص یہاں رشتہ کوئی
باپ جیسا نہ زمانے میں ہے سایہ کوئی

میری چھوٹی ہمشیرہ سے ابو کا بہت پیار تھا۔ایک دن انہیں یاد کرتے ہوئے کہنے لگی۔ان دنوں میں مدرسے میں قرآن حفظ کر رہی تھی۔ابو روزانہ سائیکل پر مجھے مدرسے سے لاکر گھر چھوڑتے اور پھر دکان پر چلے جاتے تھے۔اس دن امی سے معلوم ہوا ہوگا کہ میں صبح ناشتہ کرکے نہیں گئی۔چنانچہ جب مجھے مدرسے سے گھر لائے تو برآمدے میں سموسے، تین چار اقسام کی چٹنی اور جلیبیاں لاکر سجائی ہوئی تھیں کہ میری بیٹی صبح ناشتہ کرکے نہیں گئی، اس لیے آج اسے سپیشل کھلایا جائے۔

ابو کی زندگی کا بیشتر وقت اللہ کے راستے میں تبلیغ کرتے گزرا۔خاص طور پر ریلوے سے ریٹائرمنٹ کے بعد تو تقریبا ہر سال تبلیغ پر چلے جاتے تھے۔سہ روزہ وغیرہ تو معمول تھا۔شاید یہ تبلیغ پر جانے کی برکت تھی کہ ان کا اس بات پر ایمان پختہ تھا کہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت بھی اللہ سے بیان کرو اور اسی سے مانگو۔ان کی دائمی رخصتی بھی رمضان المبارک کے دسویں روزے کی رات تھی۔

ابو نے نہایت سادہ زندگی گزاری۔1988ء میں ریٹائرمنٹ کے وقت ابو کی پنشن پانچ سو روپے تھے اور اسی پنشن سے گھر کے اور بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے ہوتے تھے۔اپنی ضروریات سے زیادہ بچوں کی ضروریات پوری کرنے کی فکر رہتی۔

یہاں مجھے ابو کے دوسرے عمرے کی ایک بات یاد آ گئی۔ابو نے پہلا عمرہ امی کے ساتھ 2004ء میں کیا تھا۔ایک دوست کی بلنگ والی سم میرے نام تھی۔اس سم پر عمرے کا ٹکٹ نکلا تو ابو کو عمرے کے لیے تیار کیا۔ابو جانے کے لیے رضامند نہ تھے۔شاید گھر سے اکیلے جانے پر کچھ گھبراہٹ تھی۔امی نے کوشش کے بعد انہیں منایا کہ اگر اللہ نے دوسری دفعہ اپنا گھر دیکھنے کا موقع دیا ہے تو جانا چاہیے۔ابو کے ساتھ جانے والوں کا پورا ایک گروپ تھا۔جن کا عمرہ ٹکٹ نکلا تھا۔لاہور سے جدہ جانے کے لیے بھائی نے جب ابو کو لاہور ائیرپورٹ پر الوداع کیا تو دس ہزار روپے دیئے کہ وہاں ضرورت ہوگی۔بھائی کے زور دینے پر ابو نے وہ پیسے رکھ لیے۔چار دن کے بعد ان کی واپسی ہوگئی۔واپسی پر ابو نے دس ہزار بھائی کو پکڑا دیئے۔بھائی حیران کہ یہ واپس کیوں لے آئے تو ابو نے کہا کہ ضرورت ہی نہیں پڑی۔سارا انتظام اسی موبائل کمپنی کا تھا جنہوں نے عمرے پر بھیجا تھا۔بتانے کی بات یہ ہے کہ ایک باپ اپنی اولاد کا ایک روپیہ بھی خرچ کرنا نہیں چاہتا۔حالانکہ اسی اولاد نے ساری زندگی پیسے کھائے بلکہ اڑائے ہوتے ہیں۔کسی شاعر نے باپ کی محبت کو کیا خوبصورت پیراہن عطا کیا ہے۔

رہا پا برہنہ وہ خود سدا، نیا بوٹ مجھ کو دلا دیا
مرے باپ کے اسی روپ نے مجھے باپ جیسا بنا دیا
وہ جو سردیوں میں ہوا چلی تو ٹھٹھرتی رات کو فرش پر
مرا باپ چپکے سے سو گیا، مجھے اپنا کھیس اوڑھا دیا

---

# میری ہر تحریر پر میرے والد کچھ نہ کچھ انعام ضرور دیتے

## نہایت دھیمے مزاج کے انسان تھے۔شاہین رشید، کراچی

ان کے ہونے سے بخت ہوتے ہیں
باپ گھر کے درخت ہوتے ہیں
شاہین رشید

ہپی فادرز ڈے۔
دنیا کے تمام فادرز کو فادرز ڈے مبارک ہو۔
میرے امی ابو میری نظر میں وہ واحد والدین ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کے لئے بہت قربانیاں دیں خاص طور پر میرے لئے۔لیکن آج ذکر صرف والد صاحب کا ہوگا۔
میں نے جب لکھنے کی۔فیلڈ (شعبے) میں قدم رکھا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں صحافی بنوں گی۔
ہمارا گھر دوسرے فلور پر تھا اور ہمارے گھر کے نیچے ایک چاچا اخبارات اور میگزین لے کر بیٹھا کرتے تھے۔اب اتنے پیسے تو ہوتے نہیں تھے کہ سب کچھ خرید لیتے اور پڑھنے کا شوق بہت تھا تو میں نیچے جاکر چاچا سے اخبار اور ایک دو میگزین آدھے ایک گھنٹے کے لئے لے آتی اور پڑھ کر واپس کر دیتی۔۔اخبار والے چاچا بہت اچھے تھے۔۔۔میرا بہت خیال رکھتے تھے۔۔
یہاں سے ہی لکھنے کے شوق نے سر ابھارا۔۔۔اس وقت میں نویں کلاس کی طالبہ تھی...میرے ساتھ صحت کے کچھ مسائل تھے جس سے دل بجھا بجھا سا رہتا تھا۔۔۔سوچا ہر وقت رونے دھونے سے بہتر ہے کچھ کر ہی لوں۔۔۔چنانچہ ایک کہانی لکھی"روشنی کی کرن"اور یہ کہانی اپنے پر لکھی۔۔۔ایک لفافے میں ڈالی اور والد صاحب سے کہا اسے پوسٹ کر دیں۔۔۔ایک مقامی اخبار کے خواتین کے صفحہ پر یہ کہانی دوسرے ہفتے ہی لگ گئ۔۔۔
مختصر یہ کہ لکھنے کے سفر کا آغاز ہوا اور میری حوصلہ افزائی کرنے میں

میرے والدین کا بہت تعاون شامل ہے.... میری ہر تحریر پر میرے والد انعام کے طور پر کچھ نہ کچھ ضرور دیا کرتے تھے.... میرے لئے اخبار اور میگزین کے دفاتر میں خود جا کر میرے مضامین دے کراتے کہ کہیں ڈاک سے میٹر گم نہ ہو جائے
اکثر کہتے تمہارا نام اخبارات اور رسائل میں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے....اور میری خواہش ہے کہ تم صحافت کی فیلڈ کو اپناو.. تا کہ تمہارا نام زندہ رہے

میرے والد نہایت دھیمے مزاج کے انسان تھے.. غصہ نہیں آتا تھا اور اگر آتا تو گھر سے ذرا فاصلے پر بنے ہوئے چائے کے ہوٹل چلے جاتے کہ غصے کے دوران وقتی طور پر جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔
وہ ایک بے ضرر انسان تھے ان کے لئے ان کے دوست کہتے تھے کہ رشید تو جس کرسی پر بیٹھ جائے اسے بھی تکلیف نہیں ہوتی ہوگی
شام کو گھر آتے تو خالی ہاتھ نہیں آتے تھے انہیں اچھا لگتا تھا کہ وہ گھر آئیں تو بچے ان کے ہاتھ سے چیزیں لیں.. وہ ہم سب بہن بھائیوں کا سائبان تھے خاص طور پر میرے لئے تو سب کچھ تھے..
میں تھرڈ ایر میں تھی تو تحریر کی دنیا میں تھوڑا بہت نام بنا چکی تھی اور یہی چیز میرے والدین کے لیے باعثِ اطمینان تھی۔
ہمارا ان کا ساتھ بس اتنا ہی تھا وہ بیمار رہنے لگے تھے چیک اپ کرایا تو کینسر ڈائگنوز (تشخیص) ہوا.اور چھ ماہ کی زندگی۔
اللہ تعالیٰ میرے والد صاحب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔

# والد محترم کو مجھ سے بہت انسیت تھی ۔طوبیٰ خلیل

## نو بہن بھائیوں کے واحد کفیل ۔سب کی تعلیم کا انتظام کیا

جب تک ہاتھ میں ہاتھ تھا سب سہی تھا
باقی بہت مشکل سفر ہے بابا

ماں ہو کہ باپ ، دونوں ہی عظیم المرتبت ہیں۔ ان کی قدر و اہمیت کا اندازہ زیادہ اس وقت ہوتا ہے جب یہ نعمتیں ہمیں میسر نہیں ہوتیں۔
بچپن سے بلوغت اور بلوغت سے جوانی تک ناز نخرے اٹھانے والے ماں بابا قسمت والوں کو ملتے ہیں، الحمد اللہ میں ان لوگوں میں سے ایک ہوں۔ میرے والد محترم کو گزرے تقریبا نو سال بیت چکے ہیں، اب بھی بیٹھے بیٹھے جب یادوں کا دروازہ کھل جاتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ جیسے تیسے کر کے ان کو دوبارہ واپس لے آؤں۔

جو وقت ان کے ساتھ گزرا، گو یا وہ پلک جھپکنے میں غائب ہو گیا۔ ان لمحوں کی قدر اب معلوم ہوتی ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے پاس وہ شے ہوتی ہے اس کی قدر نہیں ہوتی اور جب وہ دور ہو جاتی ہے تو ساری دنیا ہی وہی تھی۔ والدین تو ایسی شے ہیں جنکے کھو جانے کا تصور بھی انسان نہیں کر سکتا لیکن جب یہ گھنا سایہ اُٹھ جاتا ہے تو کڑی دھوپ کی تلخی محسوس ہوتی ہے۔
ہم آٹھ بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ بہنوں میں سب سے آخری نمبر میرا ہے، لہذا آخری اولاد ماں باپ کی لاڈلی ہوتی ہے۔ والد صاحب کی میرے ساتھ بے حد انسیت تھی۔ باقی بچوں کو بھی وہ بے حد پیار کرتے ہیں۔ بیٹیاں زیادہ ہونے کی وجہ سے اکثر خاندان والے طنز و تشنیع کرتے ،لیکن میرے والد صاحب نے کبھی بیٹیوں کے بوجھ کو محسوس نہ کیا۔ سب سے برابری کا سلوک کرتے کبھی بیٹے کو ہم پر ترجیح نہ دی۔
میرے والد صاحب محکمہ انہار میں پہلے D.C.R (ڈپٹی کلکٹر ریڈر) اور ترقی ہو جانے کے بعد پٹواری کے عہدے پر فائز رہے ۔صبح دفتر کے اوقات میں بھی سب کو اسکول چھوڑ کے آنا انہی کی ذمہ داری تھی۔ شام کو اکثر وہ لیٹ ہو جائے تو رات کے کھانے پر والد صاحب ایک بیٹی کے اِدھر اُدھر ہو جانے پر کھانا شروع نہیں کرتے تھے۔ والدہ صاحبہ لکڑیوں والے چولہے پر گرما گرم چپاتیاں اتاری جاتیں اور ہم سب بہن بھائی ابو جی کے ساتھ مل کر نوش کرتے۔ دن بھر کی مصروفیات بتاتے اور سب ایک دوسرے سے ہنسی مذاق بھی کرتے رہتے۔
اب بھی جب یہ لمحات یاد آتے ہیں تو لگتا ہے کہ وہی اصل زندگی تھی۔
ازدواجی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد تو انسان خود کو دوسروں کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ والدین اگر حیات ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ قفس کے قیدی کو ابھی ٹھنڈی ہوا کے تازہ جھونکے کی امید ہے وگرنہ دل بیٹھنے کو ہی ترس جاتا ہے۔
میرے والد صاحب ہم نو بہن بھائیوں کے واحد کفیل تھے اور الحمدللہ گھر کا سارا نظام اتنے احسن طریقے سے چلا رہے تھے کہ ہر ایک کی فرمائش بھی پوری کی جاتی اور بجٹ تب بھی منظم رہتا۔
والد صاحب نے ہم سب کی تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا۔ خاندان والوں نے اس پر بھی باتیں کیں کہ لڑکی ذات کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کی کیا ضرورت مگر وہ خود یونیورسٹی ، اسکول، کالج تک ہر کسی کو خود لینے اور چھوڑ کر آنے کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں اخراجات کی وجہ سے کسی کو تعلیم چھوڑنے کو نہیں کہوں گا۔ جس کا جتنا دل چاہتا ہے پڑھے، جب تک تم خود نہ کہو گے تب تک پڑھتے جاؤ۔
باپ واقعی لائقِ تعظیم ہے، وہ اکیلا پورے کنبے کا بار اٹھا سکتا ہے، خواہ وہ دھوپ میں کمائے یا چھاؤں میں۔اس کے لیے موسم کی کوئی اہمیت نہیں اگر اہم ہے تو صرف اسکے بچے۔ جن کی خاطر وہ اپنی جان سے بڑھ کر مشقت کرتا ہے تا کہ بچے اپنے بچوں کو بہتر معیار زندگی فراہم کر سکے۔

منسوب ہیں تیری ذات سے رعنائیاں تمام
تیرے بنا حیات میں کچھ دلکشی نہیں ۔۔۔ بابا
یہ اذیت ہے اور مسلسل ہے بابا
آپ کو دیکھ نہیں سکتے سن نہیں پاتے

# میرے والد وضعدار ۔ با اصول ۔نفاست پسند انسان تھے

## ہومیو پیتھک طریق علاج میں مفت علاج کرتے تھے ۔علی فیصل ،ملیر کینٹ

میرے والد انوار اللہ عباسی کا انتقال 11 جنوری، 2003 بروز ہفتہ صبح صادق ہوا۔ انہوں نے پاکستان آرمی میں بطور سویلین آفیسر 32/33 سال اپنی پیشہ وارانہ خدمات انجام دیں۔ نہایت دیانتدار، وضعدار، با اصول، صاف گو، نفیس اور ڈسپلنڈ انسان تھے۔ جی ایچ کیو، راولپنڈی میں بھی تعینات رہے اور اپنی ڈیوٹی کے دوران انہیں دو مرتبہ تمغہ جرات سے نوازا گیا۔ دو وجوہات میں سے ایک واقعہ ذہن میں ہے کہ جب آپ 1966_67 میں GHQ میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے رات کے وقت ایک پیڑ کے اوپر کوئی شخص (جاسوس)
ٹارچ کی روشنی آسمان کی طرف کئے کوئی سگنل دے رہا تھا، اس کو ہالٹ کر کے والد صاحب نے نیچے اتارا اور پکڑا تھا۔

یہاں ابا کی ایمانداری کا ایک چشم دید واقعہ یاد آ گیا کہ جب مکان نمبر 2/75 سی او ڈی میں رہائش کے وقت 80 کی دہائی کے زمانے میں دوپہر کو ایک شخص 2/3 کینو کی پیٹیاں دروازے پر لا کر رکھ گیا۔ والدہ نے پیٹیاں کمرے میں رکھوا دیں اور ہم بچوں کو منع کر دیا کہ ابا کے آنے سے پہلے کوئی انہیں ہاتھ نا لگائے۔ اسی دن یا شاید اگلے دن جب وہ شخص آیا تو ابا نے سخت لہجے میں اسے ڈانٹا اور کہا کہ یہ سب لے جاو اور آئندہ ایسی حرکت کی ہمت نا کرنا۔۔۔ ابا ان دنوں آرمی اسٹور میں تعینات تھے اور وہ شخص رشوت دے کر یا زائد کمیشن پر اپنا سامان کلیئر کرانا چاہتا تھا۔۔۔!
وقت کی پابندی اور کھانے پینے کے اوقات ہمیشہ متعین رہے۔ شادیوں میں دیر سے کھانا لگنے اور فضول رسومات سے بہت چڑتے تھے۔ کچھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کھانا (مرغن قسم کے جو ویسے ہی ناپسند تھے) لگنے میں

زیادہ دیر ہونے پر واپس گھر آ گئے یا اکثر گھر سے کھانا کھا کر شادیوں وغیرہ میں جاتے تھے۔رات کا کھانا 8 بجے رات تک کھا لینے کی عادت تھی۔

والد صاحب نے نیشنل ہومیوپیتھک کالج سے ہومیوپیتھی کا کورس بھی کیا تھا۔رجسٹرڈ ہومیوپیتھ تھے۔لیکن باقاعدہ کوئی کلینک نہیں کی بلکہ گھر،اہل محلہ( سی او ڈی،آرڈیننس اسٹیٹ،ڈرگ روڈ۔کراچی )اور عزیز و رشتہ داروں کو بلا معاوضہ دوائی دیتے تھے۔عمدہ تشخیص اور ہاتھ میں شفاء کی وجہ سے سب کو فائدہ بھی ہوتا تھا۔ سب سے بڑھ کر ان کا یہ عمل بے لوث و عین خدمت انسانی تھا۔ڈاکٹر ہانمین،شوسلر و دیگر ہومیوپیتھ کی کتابیں ان کے ہمیشہ زیر مطالعہ رہیں۔

وہ لکڑی کا سیاہ پینٹ شدہ باکس اب تک یاد ہے کہ جس میں لمبی پتلی کانچ کی شیشیاں کئی گول گول کھانچوں میں رکھی ہوتیں اور ابا سفید چکنے چٹ نما نما کاغذوں میں تھوڑا سا گلوکوز ڈال کر ہومیوپیتھک کی ننھی ننھی سی گولیاں ڈالتے ہوئے دواء کی پڑیا مخصوص تہہ میں بناتے جاتے تھے۔ہم بہن بھائی نزلہ،کھانسی و بخار کی حالت میں ان "میٹھی گولیوں" سے ٹھیک ہو جاتے تھے۔

آج جو ہم میں لکھنے، پڑھنے اور کتابوں سے دوستی و محبت کے جراثیم آئے ہیں وہ سب ابا کی طرف سے منتقل ہوئے ہیں۔برنارڈ شاہ،شیکسپیئر،ٹالسٹائی، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، رئیس امروہوی ،مرزا ادیب ،انتظار حسین ،قدرت اللہ شہاب و دیگر بہت سے قدآور مصنفین و شعراء سے پہلا تعارف ہی ابا کی کتابوں کی الماری سے ہوا تھا۔!!

خط و کتابت، پوسٹ کارڈ لکھنا اور پھر گھر سے پیدل ایک ڈیڑھ میل دور جا کر لیٹر باکس میں خود خط یا پوسٹ کارڈ بھیجنا، 70 سال کی عمر تک ان کا معمول رہا۔اخبار جنگ کا مطالعہ کرتے تھے اور اہم خبروں پر سرخ بال پوائنٹ سے نشان لگانے کی عادت تھی۔

انتقال سے کچھ سال پہلے انہیں شیزوفرینیا کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔اس کی وجہ یا پس منظر یہ تھا کہ ابا کے کلیم شدہ زمینوں کی فائل کے اہم کاغذات کہیں گر گئے یا فوٹو کاپی کرواتے ہوئے بھول گئے یا دکان میں ہی چھوڑ آئے جو نا مل سکے جس کے دکھ و ٹینشن میں ابا کی ذہنی حالت پر برا اثر پڑا۔۔۔بعد میں فالج بھی ہو گیا تھا۔۔۔انتقال اس کے 7/8 سال بعد 78 سال کی عمر میں ہوا۔

ہم بچوں کو بھی نظم و ضبط کا پابند بنانے کے لئے سمجھاتے رہتے تھے۔

ابا نے دولت کو کبھی اہمیت نا دی البتہ علم،تعلیم کے حصول اور متوازن زندگی گزارنے کا ہمیشہ عملی درس دیا۔یہی وجہ ہے کہ ہم بچوں میں یہ خصوصیات ان ہی کی وجہ سے آئیں۔

اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطاء فرمائے۔آمین ثم آمین۔

## وہ میرے صرف والد ہی نہیں۔استاد اور رہنما بھی

جویریہ یاسمین،میرپور آزاد کشمیر

لفظ باپ زبان پر آتے ہی ایک مٹھاس اپنائیت خلوص سا لہجے میں گھل جاتا ہے

پھر اگر میں بات کروں اپنے باپ کی جنہیں دنیا ایک استاد اور ایک شاعر پروفیسر محمد امین طارق قاسمی کے نام سے جانتی ہے تو بحیثیت بیٹی میرے پاس الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔

وہ میرے لئے صرف والد ہی نہیں تھے استاد تھے دوست تھے رہنما تھے اور ایک رول ماڈل تھے اور ہیں۔

ایک مخلص اور مشفق استاد اپنے ہوں یا غیر سب کے لئے سراپا محبت تعاون اور خیر خواہی وطن کی مٹی سے محبت خون میں گندھی ہوئی زندگی میں ڈسپلن اور ایمانداری اتنی کہ ہر کوئی گرویدہ۔

بحیثیت باپ ہمہ وقت استاد بے تکلف دوست اور دین اور

**سب کے لیے سراپا محبت۔**
**محب وطن**

معاشرت کے حوالے سے ایک سخت گیر رہنما اور تربیت کا انداز ایسا کہ آج انہیں بچھڑے ہوئے سولہ سال ہو گئے لیکن

پروفیسر محمد امین طارق قاسمی

قدم قدم پر ان کی ہدایات سامنے آ جاتی ہیں اور میرے قدم خود بخود اس سمت اٹھنے لگتے ہیں جو ان کی پسندیدہ تھی اور اور وہاں رک جاتے ہیں جو بات یا انداز انہیں ناپسند تھا۔

بس یہی دعا ہے اللہ اپنی نعمتوں بھری جنت میں انہیں آسودہ رکھے آمین۔

## اپنی محنت کے بل بوتے پر گیارہ بچوں کو پڑھایا لکھایا شادیاں کیں

ریحانہ اعجاز،کراچی

ابو کے بارے میں لکھنے لگی تو جیسے میرے جذبات میں تلاطم برپا ہو گیا۔چشمِ نم میں ابو کے سنگ ابو کے گھر گزرا پل پل کسی فلم کی مانند چل پڑا۔

میرا دل چاہ رہا ہے میں اپنے ابو کی ڈھیر ساری باتیں ، یادیں شیئر کروں۔بطور انسان ابو کی پروقار شخصیت میں کچھ کمیاں اور خامیاں بھی ان کی ذات کا حصہ رہی ہوں گی لیکن بحیثیت والد ان کی شخصیت بے مثال تھی۔مجھے یاد ہے ذرا ذرا کہ کیسے مجھ سمیت دیگر دس بہن بھائیوں کو ابو نے امی کی ہمراہی میں تراش خراش کر ہیرا بنایا ۔بالکل تن تنہا۔اپنی محنت کے بل بوتے پر گیارہ بچوں کو پڑھایا،

لکھایا، شادیاں کیں اور ایک روپیہ کبھی قرض کے نام پر نہیں لیا۔
زندگی میں قدم قدم پر نامساعد حالات کا سامنا کیا لیکن کبھی سپر نہ ڈالی ہمیشہ ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔
بے انتہا محنتی ۔گورنمنٹ قابل ٹیچر سے گورنمنٹ ہائی اسکول کے پرنسپل اور پھر انسپکشن آفیسر کے عہدے تک اپنی محنت سے پہنچے۔ریٹائرمنٹ کے بعد بھی فارغ نہیں بیٹھے بلکہ پراپرٹی کا کام شروع کیا اور ساتھ ہی پرائیویٹ اسکول بھی۔
میرے والد کی سب سے اچھی عادت اللہ پر یقین و بھروسہ۔ہم نے کبھی انہیں نماز، روزہ چھوڑتے نہیں دیکھا۔ہم نے انہیں کبھی فارغ بیٹھے نہیں دیکھا۔ہم نے انہیں کبھی وقت برباد کرتے نہیں دیکھا۔ہم نے انہیں کبھی مایوس نہیں دیکھا۔ہم نے انہیں کبھی بیٹیوں کو برا کہتے نہیں سنا۔
ہم چھ بہنیں ہیں،ہم سب کو ابو نے بڑے پیار و مان محبت سے پروان چڑھایا۔کبھی پانچ بھائیوں کو ہم پر فوقیت نہ دی بلکہ انہیں بھی بہنوں، بیٹیوں سے پیار کا درس دیا۔
اور جب سب سے بڑے بھائی کے یکے بعد دیگرے پانچ بیٹیوں نے جنم لیا تب بھی ابو نے ہمیں ہمیشہ خوشی سے سرشار لہجے میں اطلاع دی۔
آپ کے بھائی کے گھر ایک اور کلی کھلی ہے"
جب ابو اس دنیا سے گئے تب ہم پر ان کی وہ خوبیاں بھی منکشف ہوئیں جن سے کم از کم ہم گھر والے کلی طور پر بے بہرہ تھے۔اکثر تپتی دوپہر میں سائیکل پر گھر سے ضروری کام کا کہہ کر نکل جاتے تھے،کبھی نہیں بتایا کہاں گئے تھے۔۔نہ کبھی پوچھنے کی نوبت آئی کہ مردوں کو گھر سے باہر کئی کام ہوتے ہیں۔یہ تو ان کی وفات کے بعد

**تپتی دوپہر میں اسپتالوں میں مریضوں کو پھل دینے جاتے**

پتا چلا جب انجان لوگ گھر پر آئے اور والد صاحب کی وفات کا سن کر بے یقینی کا اظہار کرتے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے کہ حاجی صاحب ایسے کیسے چلے گئے؟ تب کئی لوگوں کی زبانی علم ہوا وہ تپتی دوپہروں میں مختلف ہاسپٹلز جایا کرتے تھے۔مریضوں کی عیادت کے لیے۔مریضوں کو حوصلہ دینے کے لیے۔ انہیں پھل فروٹ دینے۔
ابو کے انتقال کے بعد ایک قریبی ہاسپٹل میں جانا ہوا تو ایک وہیل چیئر مریض کو لیے پاس سے گزری جس پر "الحاج محمد عبداللہ رفیق" کا نام کندہ تھا۔
بہت حیرت ہوئی۔ہاسپٹل والوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کچھ عرصہ پہلے ایک صاحب چند وہیل چیئرز ہاسپٹل کے لیے دے گئے تھے۔ابو کی تصویر دکھانے پر تصدیق ہوگئی کہ وہ وہیل چیئرز ابو ہی کی جانب سے دی گئی تھیں۔۔۔۔
ابو ہمیشہ کہا کرتے تھے۔اللہ کے نام پر ایسے دو کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو"اور ہمیں بعد میں علم ہوا وہ محض کہتے نہیں تھے۔عمل بھی کرتے تھے۔میرے ابو اخبار جہاں میں بھی لکھا کرتے تھے اور ان کی اپنی ایک تنظیم بھی تھی"اصلاح معاشرہ" کے نام سے۔
میرے ابو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک کتاب لکھ رہے تھے افسوس صد افسوس کہ ابو کی کتاب زندگی ختم ہونے کی وجہ سے وہ کتاب ہمیشہ کے لیے ادھوری رہ گئی۔
ہائے میرے ابو جی۔۔۔۔۔۔۔۔
اچھے بھلے،ٹھیک ٹھاک میرے ابو محض معدے کے عارضے میں مبتلا ہو کر چند دنوں میں ہی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔پوسٹ پر موجود تصویر میرے ابو کے انتقال سے محض تین ماہ پہلے کی ہے۔
جب ابو اس دنیا سے گئے تو حتی الامکان اپنی ذمے داریاں پوری کرنے کی کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہے تھے۔بہت ہلکے پھلکے ہو کر گئے کہ کسی قسم کا قرض کا بوجھ نہ تھا۔
وقت جنازہ ان کے چہرے کا اطمینان و سکون گواہ تھا کہ اللہ نے انہیں اپنی رحمت میں لے لیا ہے۔ابو کے بارے میں لکھنے کے لیے اتنا کچھ ہے لیکن طوالت کا اندیشہ ہے سو قلم کو بمشکل روکنا پڑ رہا ہے۔بہت سی سنہری یادیں ہیں، باتیں ہیں۔بس ابو ہی نہیں ہیں ۔اللہ میرے والد کی مغفرت فرمائے۔آمین ثم آمین۔

---

# میرے والد کے روزمرہ کے معمولات بہت سخت تھے

## کثرت سے درود شریف پڑھتے ۔میر حسین علی امام

میری عمر تریسٹھ سال ہے۔وصال کے وقت میرے پپا کی عمر باون اور میری تیئیس سال تھی ) ہم سات بھائی بہن تھے۔میں یاد کرتا ہوں کہ کسی بھی بھائی یا بہن کو کم یا زیادہ محبت یا طرف داری پپا نہیں کرتے تھے ان کے کچھ معمولات تھے بہت سخت ایسے معمولات کو عمر بھر برقرار رکھنا ہر ایک کے بس میں نہیں۔میں نے ساتویں آٹھویں جماعت کے طالب علم کی عمر سے دیکھا وہ تہجد کے وقت اٹھ جاتے تہجد ادا کرتے ذکر اذکار کرتے فجر کے بعد ایک پارہ عربی اور اس کے ترجمے کے ساتھ پڑھتے تھے۔اور پھر نماز اشراق کے بعد کلام کرتے۔اشراق کے بعد ہم بچوں سے اسکول کالج کی بات یا کوئی اور اہم بات یا تاکید کرتے۔۔والدہ چھ بھائی بہنوں کا ناشتہ تیار کرتی تھیں پہلے چھوٹی بہنیں قریب کے اسکول اتاترک جاتی تھیں بڑی ہوئی تو دس نمبر پر انجمن اسلامیہ اسکول۔ہم دوپہر میں بہادر یار جنگ اسکول جیل روڈ جاتے تھے۔بھائی بہن کے بعد والد کا ناشتہ اور پھر ان کا توشہ۔۔۔
والد صاحب کا ایک وصف خاموش کلام تھے ان کے ہم عمروں میں سے بھی جو ہم مزاج یا چادر گھاٹ اسکول یا جامعہ عثمانیہ کے دوست احباب آتے تو تب ان کی دوستی گپ شپ رونق دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی زندہ دل ہیں یا اسکول کالج کی یادیں تازہ دم کر دیتی ہیں سال میں دو بڑی دعوتوں کا اہتمام کرتے تھے ایک رمضاں میں دادھیال کے رشتہ داروں کی افطار پارٹی۔دوسرے ربیع الاول میں میلاد النبی اور قصیدہ بردہ شریف کا اہتمام۔
والد صاحب کی ایک عادت تھی ۔۔سرکار فرماتے تھے کبھی پورا اسم مبارک نہیں لیتے تھے احترام رکھتے تھے کثرت سے درود شریف پڑھتے اور ہم بچوں کو بھی تاکید کرتے تھے امتحان سے پہلے انٹرویو سے پہلے کسی بھی پریشانی ہو درود شریف پڑھیں۔جمعہ کی نماز کے بعد آدھا گھنٹہ درود شریف پڑھنے کے لئے پابند کیا۔پابندی بری لگتی ہے ہمیں بھی لگنے لگی تو والدہ نے سفارش کی تو پانچ سو کی تاکید کی آخر میں ایک تسبیح پڑھنے کی اجازت دی۔آج چالیس سال گزر گئے ھم سب بھائی بہن اور ان کے بچے جمعہ کے بعد ایک تسبیح درود شریف کی پڑھتے اور دوست احباب کو بھی تاکید کرتے۔
ہم سمن آباد میں تھے ہر چھ ماہ بعد پانی کے انڈر گراؤنڈ ٹینک کی صفائی ہوتی تھی ایک شام صفائی کے دوران پپا پھسل گئے ٹنکی میں گر گئے ہم سب پریشاں ہو گئے پپا پھر اٹھے اور کام کرنے لگے ۔ہر وزنی بڑا کام خود کرتے تھے الماری فریج صوفہ سیٹ مسہری اٹھاتے بچوں کو کم تکلیف دیتے مہینہ میں ایک اتوار سلائی مشین کو چیک کرتے بڑے بھائی کو انجینئرنگ کرانے کی

نیت سے بجلی کا کام اور دیگر چھوٹے ریڈیو ٹی وی کے کام کے متعلق بتاتے تھے۔عام یونیفارم وغیرہ والدہ لالوکھیت سے لیتی تھیں۔کالج میں آ گئے تو زیب النساء اسٹریٹ لے جا کر عید کے کپڑے سلوانے لگے کہ یہ صدر ہے یاں اچھی معیاری چیزیں ملتی ہیں اچھی دکانوں سے خریدتے دکاندار بھی جانتے تھے احترام کرتے۔

والد کی ایک عادت تھی وہ پان کھاتے تھے پاندان کا اہتمام تھا آفس جاتے وقت چار پانچ والدہ سے بنوا کر لیجاتے تھے۔شام آفس سے آکر شام کی چائے اور رات کے کھانے کے بعد پان۔۔ جب سقوط ڈھاکہ ہوا اور پان آنے بند ہوئے تو گٹکا جاری ہوا۔بعد میں پان دوبارہ ملنے لگے مگر والد صاحب نے پاندان کا اہتمام ختم کیا اور محلے کی دکان سے پان لے کر کھانے لگے اس دوران مراد آبادی شہزادی تمبا کو کی عادت ہوئی۔دو تین سال کے بعد کھانے میں تکلیف شروع ہوئی بعد میں کھانا نگلنا دشوار رہوا۔۔محلے کے ڈاکٹروں کے بعد حیدرآباد کالونی کے مشہور معالج محی الدین قریشی کے پاس گئے انہوں نے تیزابیت اور السر کا کہا اور پھر چرانیا اسپتال میں بڑے فزیشن کا نے ہسٹا پتھالوجی بائیو پسی کرائی۔ایسوفیگس میں کینسر نکل آیا۔سرجن حمید نے سرجری کے لئے آغاز کیا تو ایسوفیگس معدہ سب متاثر نکلے انہوں نے غذا کے لئے نلکی ڈالی اور ریڈیائی شعاعوں سے علاج کا کہا۔بیس دن جناح میں ایڈمٹ رہے شعاعوں سے علاج جاری تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اذیت تکلیف کم کی اور اپنے نیک بندے کو فکر سے آزاد کیا اور اپنے حضور طلب کر لیا۔میں بھی اور دوستوں لوگوں کی طرح تمبا کو کھانے کو کینسر کی وجہ سمجھتا ہوں اور اپنے دوستوں اور جاننے والوں کو بتاتا ہوں کہ تمبا کو کھانے سے السر کینسر ہوتا ہے۔

جب والد کا انتقال ہوا تو محلے کے بڑے جنازوں میں ایک تھا والد کے ننھیال دادھیال ہماری ننھیال۔ہمارے تینوں بھائیوں کے آفس کے دوست محلے کے دوست جمعیت جماعت تبلیغی جماعت ہمارے تینوں بھائیوں کے شاگرد والد کے جاننے والے مختلف آفس کے دوست ملاقاتی۔۔آخری سفر میں سب شامل ہوئے۔سب اشکبار ہوئے۔

لوگ کہتے ہیں کہ والد والدہ کی کوئی نہ کوئی خوبی کسی نہ کسی بچے میں آتی ہے۔۔میرے دادا حضرت بی کام تھے اور صدر محاسبی یعنی آڈیٹر جنرل میں ملازم تھے مگر طب سے شوق رکھتے تھے ہومیو ڈاکٹری بھی کرتے اور غریبوں کا مفت علاج۔۔انگریزی میں قرآن شریف پر مضامین دکن کرونیکل میں لکھتے تھے۔۔۔میرے والد بھی کامرس میں بی کام کیا اور ہومیو علاج دادا سے سیکھا اور فری میں علاج کرتے تھے قرآن پڑھتے حاشیہ لکھتے تھے۔میں نے ہومیو ڈاکٹری کی باقاعدگی سے علاج بھی کیا پڑھایا بھی۔۔ہومیو انگریزی ہربل ادویہ سازی میں کام کیا اور پھر قرآن پر۔مضامین کتب اردو میں لکھنے کی سعادت عطا کی۔ہم سب ایک نظام کے تابع کام کر رہے ہیں والد دادا کی ہومیو ڈاکٹری قرآن کا مطالعہ میرے حصے میں آیا دوسرے بھائیوں نے والدہ کی خدمت کی برادری میں والد جس طرح خوشی غمی کے موقع پر شریک ہوتے تھے وہ بڑے بھائی کرتے۔غرض ہر بیٹا اپنے باپ کی خوبی لے کر آتا اور اپنے حصے کا کام کرتا ہے اب ہم سب پپا ہیں بابا ہیں ابو ہیں ہم نے اپنی تہذیبی اقدار اپنے بچوں میں منتقل کر دی ہیں عمر کے ساتھ ساتھ ہمارے بچے جب پپا بابا ڈیڈ ڈیڈی ابو جانی بنیں گے یہ روایت مذہبی اقدار اخلاق اقدار سب آنے والی نسلوں میں۔منتقل کریں کوئی کم کوئی زیادہ۔

# ڈیڈی مجھے خوش قسمتی کا استعارہ کہتے ہیں۔فرزین لہرا

(یہ مضمون سہو نظر سے مکمل نہیں شائع ہوا تھا فرزین سے معذرت کے ساتھ اب پوری تحریر نذر قارئین)

آیئے آج آپ سب کو اپنے محترم والد صاحب سے ملواؤں جنہیں ہم سب بھائی بہن ابو، ابا، پاپا یا بابا نہیں بلکہ ڈیڈی کہتے ہیں۔اب یہ اصطلاح اکثر لوگ برگر بچوں کے والدین کے لئے طنزیہ استعمال کرتے ہیں لیکن میں اور ہم سب بہن بھائی انہیں ہمیشہ ہی ڈیڈی کہتے آئے ہیں۔شاید وہ زمانہ اور تھا۔شاید تب برگر بچوں کا کوئی تصور نہ تھا۔شاید ایسا اس لئے تھا کہ والد صاحب بیرون ملک رہا کرتے تھے اور وہاں سے ہمیں سکھایا ہو۔

خیر۔۔ویسے تو پیارے والد صاحب کا نام عبدالرشید لہرا ہے لیکن پہچانے وہ کسی اور نام سے جاتے ہیں۔بھلا وہ کیا؟

اب اس کے لئے ایک کہانی سناتی ہوں۔

ڈیڈی ایک سیلف میڈ انسان ہیں۔انہوں نے بالکل بھی سونے کے چمچ سے کھانا نہیں کھایا بلکہ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کے لئے ہر چھوٹا بڑا کام کیا۔یہاں تک کہ ریڑھی تک لگائی اور جوتے بھی پالش کئے لیکن محنت سے کبھی جی نہیں چرایا اور نہ کسی کام کو چھوٹا تصور کیا۔

پھر قسمت نے انہیں روزگار کے لئے دبئی کے صحرا میں پہنچا دیا۔جی اس وقت تو صحرا ہی تھا یہ ساری چمک دمک تو اب ہے۔ڈیڈی وہاں "جمبو الیکٹرانکس" نام کی کمپنی میں سیلز مین کی جاب کرنے لگے۔یہ نوکری انہوں نے اتنا

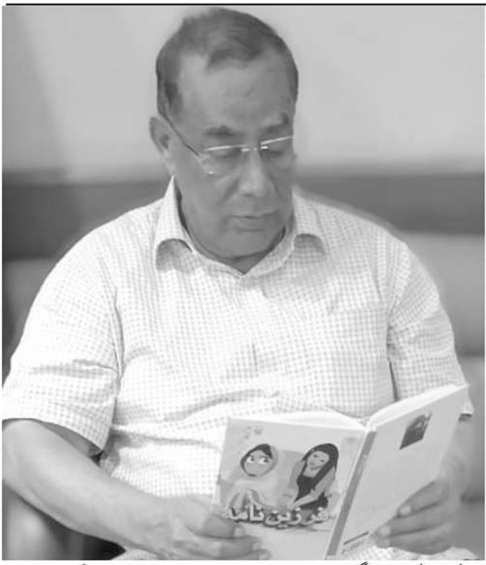


عرصہ کی کہ ان کی پہچان بن گئی۔اب وہ رشید لہرا سے رشید جمبو کے نام سے جانے پہچانے لگے۔

ڈیڈی بتاتے ہیں کہ میری پیدائش سے پہلے کا عرصہ کافی تنگدستی میں گزرا۔میرے دنیا میں آتے ہی ان کے حالات بدلنے لگے اور جب میں ایک سال کی تھی تو ہمارے گھر پہلا اے سی لگا تھا۔اس کے کچھ عرصے بعد ہی پہلی سیکنڈ ہینڈ گاڑی لی تھی۔ڈیڈی مجھے ہمیشہ ہی اپنے لئے خوش قسمتی کا استعارہ کہتے آئے ہیں۔

دبئی چھوڑنے کے بعد والد صاحب نے کنسٹرکشن کا کام کیا اور کتنی ہی بلڈنگز بنائیں۔ میرے چچا آرکیٹکٹ تھے اور یہ دونوں بھائی مل کر نقشہ پر خوب غوروخوض کیا کرتے تھے۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ ہر کنٹریکٹ ملنے پر ڈیڈی وہ فائل میرے ہاتھ سے الماری میں رکھواتے اور پلاٹ پر میرا چکر ضرور لگواتے۔

ڈیڈی اب بھی مجھے قسمت کی چڑیا کہتے ہیں۔

آپ نے ساری زندگی بے انتہا کام کیا اور ایسا کوئی ملک نہیں جو ہمیں نہ دکھایا ہو۔ جتنا وہ ہم تینوں بہن بھائیوں سے محبت کیا کرتے تھے اتنی ہی سختی کے بھی قائل تھے۔ ہمارے ہر دوست کا ڈیڈی کو پتہ ہوتا تھا۔ میری اسکول کی تمام سہیلیاں انہیں بہت اچھے سے جانتی تھیں اور وہ ان سب کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے۔ آپ ہمیشہ سے ہی خدمت خلق سے وابستہ رہے اور الحمداللہ اب بھی وابستہ ہیں۔

اب میرے پیارے والد محترم اپنی ریٹائیرڈ لائف گزار رہے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف ہماری کمیونٹی کی جماعت میں اچھا نام کمایا بلکہ کراچی کلب کی مینیجمنٹ کمیٹی کے رکن بھی رہے۔

کراچی کلب کے سارے ویٹرز کے مسائل جیسے ان کے اپنے مسائل ہیں۔

میمن کمیونٹی میں عبدالرشید جمبو کا اپنا مقام اور اپنی عزت ہے۔ ان کی گواہی کو معتبر مانا جاتا ہے۔

ویسے تو بتانے کو بہت سارے قصے ہیں لیکن ابھی حال کا قصہ بتاتی ہوں۔

میں اور سرتاج رات ساڑھے گیارہ بجے ایک مشہور آئسکریم پارلر میں آئسکریم کھانے گئے۔ واپسی میں مجھے امی کے گھر اتار کر وہ چلے گیے۔ میرا پلان رکنے کا تھا۔ امی سے گھنٹہ بھر گپیں لگانے کے بعد میں نے فون نکالنے کے لئے پرس کھولا تو فون غائب۔۔ میری تو سانس ہی اٹک گئی۔ میرا فون آئی فون تھا اور بالکل نیا تھا۔ میاں کو رو رو کر فون کیا تو انہوں نے کہا کہ اب دو گھنٹے بعد تو فون ملنے سے رہا تو چپ کر کے سو جاؤ اور آئندہ دھیان رکھنا۔ بھائی سے کہا تو اس کا بھی یہی جواب تھا۔ میں ان دونوں سے یہی کہہ رہی تھی کہ آئسکریم پارلر جا کر دیکھنا چاہئے لیکن دونوں میری ایک سننے کو تیار نہیں تھے۔

رو رو کر میری آنکھیں ایک الگ ہی منظر پیش کر رہی تھیں۔ امی کا الگ حال تھا کہ ڈیڈی کو بالکل پتہ نہیں لگنا چاہئے ورنہ وہ پریشان ہونگے کل ہی ان کا بی پی نارمل ہوا ہے۔ ایسے ہی روتے روتے میں اپنے کمرے میں چلی گئی اور حسب عادت ڈیڈی مجھے خدا حافظ کہنے کمرے میں

**میمن کمیونٹی میں عبدالرشید جمبو کا اپنا مقام اپنی عزت**

آئے۔ اس وقت ایک بج رہا تھا۔ میرے سوجے پپوٹے دیکھ کر وہ بے چین ہو گئے اور وجہ دریافت کی۔ میں نے ٹالا تو انہوں نے ایک بار پھر درشتی سے پوچھا اور میرے سارے بند ٹوٹ گئے۔ ایک بار پھر آنسوؤں کے ساتھ موبائل کھونے کا بتایا اور سر اٹھا کر دیکھا تو ڈیڈی اپنے کمرے میں جا رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے ڈیڈی نے مجھے زور سے پکار کر اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ کسی سے فون پر بات کر رہے تھے"جی میری بیٹی سے پوچھیں سب" میں نے نا سمجھی میں فون تھاما تو وہ سی پی ایل سی کے آفیسر تھے جو مجھ سے میرے فون کی آئی کلاؤڈ آئی ڈی مانگ رہے تھے۔ میں ان کے مطلوبہ جوابات دیتی گئی اور پھر فون ڈیڈی کو دے دیا۔ ڈیڈی نے اسپیکر پر فون رکھا۔ آفیسر کی آواز آئی، "رشید بھائی فون وہیں ہے۔ آپ جائیں بچی کے ساتھ۔ اگر نہیں ملے تو ہم اپنی ٹیم کے ساتھ اسی وقت آتے ہیں۔"

ڈیڈی نے فوراً ہی گاڑی کی چابی اٹھائی اور مجھے لئے گاڑی میں روانہ ہوئے۔ سارے راستے سمجھاتے رہے کہ دنیا سے چھپا لینا لیکن باپ سے کچھ مت چھپانا۔ آنسو قیمتی ہیں آئی فون نہیں۔ اگر فون نہیں ملا تو صبح ایسا ہی لے کر دونگا لیکن آنسو نہیں چاہئے مجھے۔۔ "میں سوں سوں کرتی سن رہی تھی۔ جلد ہی ہم وہاں پہنچ گئے۔ صرف اسٹاف ہی رہ گیا تھا جو جانے کی تیاری میں تھا۔

ڈیڈی نے بڑے تحمل سے کہا، "میری بیٹی کا فون یہاں رہ گیا ہے۔ میں اسے لینے آیا ہوں"

مینیجر سمیت سارے اسٹاف نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

اب ڈیڈی نے دبنگ انداز میں کہا، "تھوڑی دیر میں ٹیم یہاں پہنچ ہی جائے گی۔ اب نتائج کے ذمہ دار آپ ہونگے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے لے کر گاڑی میں آبیٹھے۔ ابھی ڈیڈی آفیسر کو فون کرنے ہی لگے تھے کہ ایک بندہ بھاگتا ہوا گاڑی تک آیا، "سر! یہ رہا آپ کی بیٹی کا فون۔۔ پلیز مجھے معاف کردیں۔ میری نوکری نہ چلی جائے۔۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے سی پی ایل سی سے فون آنے لگا، ڈیڈی نے فون اٹھا کر کہا، "جی مل گیا ہے فون۔۔ یہیں پارکنگ میں گرا ہوا تھا۔"

یہ کہہ کر ڈیڈی نے فون رکھا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس بندے کی آنکھوں میں تشکر اور سکون اتر آیا تھا۔

گھر آکر ایک لیکچر اور ملا کہ چیزوں کی اہمیت نہیں ہوتی۔ آنی جانی ہے۔ مجھے سب بتایا کرو۔ وغیرہ وغیرہ

جب میاں اور بھائی کو پتہ چلا کہ فون مل گیا ہے تو ان کی شکلوں پر بے یقینی مزہ دے گئی۔

آج میری کتاب اپنے ہاتھوں میں لئے اتنے پیارے لگے کہ بس آپ سب سے شیئر کرنے کا دل چاہا۔

مجھے فخر ہے کہ میں رشید جمبو کی بیٹی ہوں۔

اللہ میرے والد صاحب کی عمر دراز کرے اور انہیں کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔ آمین

## بچی ۔ معذور باپ کا بازو

مجھے آج آٹو رکشہ پر سفر کرنے کا اتفاق ہوا جب میں آٹو میں بیٹھا تو دیکھا کہ ڈرائیور کی گود میں ایک چھوٹی سی بچی ہے تو میں سمجھا کہ شاید بچی نے آج ضد کی ہوگی کہ ابو میں بھی ساتھ جاؤں گی یا پھر اسے چلنے سے پہلے اتار دے گا مگر جب رکشہ چلا تو دیکھا کہ وہ بچی ریس دے رہی ہے اور اس کا ابو دوسری طرف سے سٹیرنگ پکڑ کر اسے کچھ بتا رہا ہے راستے میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور سنتا رہا جب منزل پر پہنچے تو اسے کرایہ دینے کے بعد پوچھا تو اس پر رکشہ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ میں اک بازو سے معذور ہوں اس لیے ہم دونوں مل کر رکشہ چلاتے ہیں مجھے یہ گوارا نہیں کہ میری بیٹی کسی کے گھر میں صفائی کرے اور میں بھکاری بنوں بچی کو تعلیم بھی دلوا رہا ہوں اور گھر کا نظام بھی چل رہا ہے اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں خوش باش زندگی بسر کر رہا ہوں۔ سلام ہے ایسے شخص کو۔

# باپ ہی بے مثال رحمت ہے۔باپ ہی پیکر محبت ہے

## پیکر محبت

باپ ہی سائبان شفقت ہے
باپ ہی اک عظیم نعمت ہے
زندگانی کے آخری پل تک
ہم پہ لازم ان ہی کی طاعت ہے
سب نشیب وفراز میں ہر پل
باپ ہی پیکر محبت ہے
باپ سے ہیں ہماری سب خوشیاں
روز، اپنی تو عیش وعشرت ہے
ان کو ہر گز کبھی نہ تم جھڑکو
اپنے مذہب کی یہ ہدایت ہے
ان کی تعلیم نے ہی بتلایا
زندگانی کی کیا حقیقت ہے
اپنے بچوں کے واسطے گویا
باپ ہی بے مثال رحمت ہے
آج کا دن بہت مبارک ہے
ہر گھڑی، آج نیک ساعت ہے
باپ ایسا درخت ہے انجم
جس کے سائے میں خوب راحت ہے

پٹنہ (بھارت) سے فریدہ انجم کی والد گرامی کیلئے نظم

---

# دیوار پر والد کے ہاتھ کے نشان۔پوتے کی محبت

## میری بیوی چیخ اٹھی۔میں نے بھی والد کو ڈانٹ دیا

مرسلہ: نذر محمد، لورالائی

ابا جی بوڑھے ہو گئے تھے اور چلتے چلتے دیوار کا سہارا لیتے تھے۔ نتیجتاً دیواروں کا رنگ خراب ہونے لگ گیا، جہاں بھی وہ چھوتے تھے وہاں دیواروں پر ان کی انگلیوں کے نشانات چھپ جاتے تھے۔

میری بیوی کو جب پتہ چلا تو وہ اکثر گندی نظر آنے والی دیواروں کے بارے میں مجھ سے شکایت کرتی۔

ایک دن سر میں درد ہو رہا تھا تو ابا جی نے سر پر تیل کی مالش کی۔تو چلتے ہوئے دیواروں پر تیل کے داغ بن گئے۔

یہ دیکھ کر میری بیوی چیخ اٹھی۔اور میں نے بھی غصے میں اپنے والد کو ڈانٹ دیا اور ان سے بدتمیزی سے بات کی، انہیں مشورہ دیا کہ چلتے وقت دیواروں کو ہاتھ نہ لگائیں۔

وہ بہت غمگین نظر آئے۔مجھے اپنے رویے پر شرمندگی بھی محسوس ہوئی مگر ان سے کچھ نہ کہا۔

ابا جی نے چلتے ہوئے دیوار کو پکڑنا چھوڑ دیا۔اور ایک دن وہ گر پڑے اور بستر سے جا لگے جوان کے لئے بستر مرگ بن گیا اور کچھ ہی دنوں میں ہم سے رخصت ہو گئے۔ میں نے اپنے دل میں احساس جرم محسوس کیا اور میں ان کے تاثرات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا اور اس کے فوراً بعد اپنے آپ کو ان کی موت کے

لئے خود کو معاف نہیں کر پاتا ہوں۔
کچھ دیر بعد، ہم اپنے گھر کو پینٹ کروانا چاہتے تھے۔ جب پینٹر آئے تو میرا بیٹا، جو اپنے دادا سے پیار کرتا تھا، نے مصوروں کو دادا کے انگلیوں کے نشانات صاف کرنے اور ان علاقوں کو پینٹ کرنے کی اجازت نہیں دی۔
پینٹر بہت اچھے اور جدت پسند تھے۔ انہوں نے اسے یقین دلایا کہ وہ میرے والد کے فنگر پرنٹس/ ہینڈ پرنٹس کو نہیں ہٹائیں گے، بلکہ ان نشانات کے گرد ایک خوبصورت دائرہ بنائیں گے اور ایک منفرد ڈیزائن بنائیں گے۔
اس کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ پرنٹس ہمارے گھر کا حصہ بن گئے۔ ہمارے گھر آنے والے ہر فرد نے ہمارے منفرد ڈیزائن کی تعریف کی۔

**دادا سے پیار کرنے والے میرے بیٹے نے انگلیوں کے نشانات پر پینٹ کرنے نہیں دیا**

وقت کے ساتھ ساتھ میں بھی بوڑھا ہوتا گیا۔ اب مجھے چلنے کے لیے دیوار کے سہارے کی ضرورت تھی۔ ایک دن چلتے ہوئے مجھے یاد آئے اپنے والد سے میرے کہے ہوئے الفاظ، اور سہارے کے بغیر چلنے کی کوشش کی تاکید۔ میرے بیٹے نے یہ دیکھا اور فوراً میرے پاس آیا اور چلتے ہوئے مجھے دیواروں کا سہارا لینے کو کہا، اس خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہ میں سہارے کے بغیر گر سکتا ہوں، میں نے دیکھا کہ میرا بیٹا مجھے پکڑے ہوئے ہے۔ میری پوتی فوراً آگے آئی اور پیار سے میرا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ کر سہارا دیا۔ میں تقریباً خاموشی سے رونے لگا۔ اگر میں نے اپنے والد کے لیے بھی یہی کیا ہوتا تو وہ زیادہ دیر تک زندہ رہتے۔ میری پوتی نے مجھے ساتھ لیا اور صوفے پر بٹھایا۔ پھر اس نے مجھے دکھانے کے لیے اپنی ڈرائنگ بک نکالی۔
اس کی استانی نے اس کی ڈرائنگ کی تعریف کی تھی اور اس کو بہترین ریمارکس دیے تھے۔

**گھر والوں کو بتائیں بزرگ قیمتی ہیں دیواریں اور چیزیں نہیں**

خاکہ دیواروں پر میرے والد کے ہاتھ کے نشان کا تھا۔
اس کے ریمارکس تھے۔"کاش ہر بچہ بڑوں سے اسی طرح پیار کرے"
میں اپنے کمرے میں واپس آیا اور اپنے والد سے معافی مانگتے ہوئے رونے لگا، جواب نہیں تھے۔
ہم بھی وقت کے ساتھ بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ آیئے اپنے بڑوں کا خیال رکھیں اور اپنے بچوں کو بھی یہی سکھائیں۔
اپنے گھر والوں کو بھی بتائیں کہ یہ بزرگ قیمتی ہوتے ہیں دیواریں اور چیزیں نہیں۔ ❁

## ہر باپ عظیم۔لائق تعظیم

ماشاءاللہ۔ بہت تحریریں موصول ہو رہی ہیں۔ ہمارے پاس جو تحریریں موجود ہیں آئندہ اشاعتوں میں شامل ہوں گی۔ وہ حسب ذیل ہیں۔
شمس الحق میمن۔ ایک زندہ دل شخصیت۔ حزب اللہ میمن۔ میرے والد میرے استاد۔ ہنی رضا، کراچی۔ قاضی سراج الدین سرہندی۔ (قاضی جمیل اطہر، ایڈیٹر، روزنامہ جرأت لاہور) طویل یادیں ہیں۔ قسط وار شائع ہوں گی۔ آخری لمحے۔ آخری دن۔ علی عمران ممتاز۔ لندن سے آفتاب علی صاحب کی تحریر بھی ملی ہے۔ ان سے گزارش ہے کہ وہ اپنے والد محترم کے بارے میں تفصیل سے لکھیں۔ ثمر عباس لنگاہ کی تحریر دلکش ہے۔ مگر وہ باپ کے بارے میں ہے۔ ان سے بھی التجا ہے کہ اپنے والد کے بارے میں معلومات قلمبند کریں۔ انسان ہو کے بھی فرشتہ رہا نعیم۔ سینئر صحافی جدہ میں مقیم شاہد نعیم کا منظوم خراج عقیدت۔ قاری نور احمد خان زئی کو ان کے سعادتمند صاحبزادے ڈاکٹر مسرور احمد زئی نے یاد کیا ہے۔ محمد حسین پروگرام منیجر ریڈیو پاکستان حیدرآباد۔ نزہت جبین ضیا کراچی سے۔ نازیہ آصف۔ ہماری قلمی معاون گجرات سے۔ ممتاز عالمی شہرت یافتہ شاعر محسن بھوپالی کی صاحبزادی رکوانور۔ نامور ادیب اقتدار جاوید۔ مصنف شاہ ولی اللہ جنیدی۔ مصنف۔ نامور صحافی رباب عائشہ۔ علیم عمار وحید ابن حکیم عبدالوحید سلمانی۔ سیدہ عطیہ حسن عابدی، کراچی۔ حیدرآباد سے ڈاکٹر رضوانہ انصاری کی گرانقدر تحریروں قابل ذکر ہیں۔
ایک انتہائی دلچسپ مختلف خراج تحسین سے ماہنامہ 'اطراف' کی قلمی معاون جہاں آراء نے نوازا ہے۔ اپوا گورنمنٹ گرلز ہائی سیکنڈری اسکول کی گیارہویں جماعت کی طالبات بشریٰ داؤد۔ فضا نسیم۔ نور العین۔ نویرا نور الدین۔ نمرہ ستار۔ دہم کی انعم بتول۔ جامعہ کراچی کی افراح عمر۔ ثمرہ حیدر نے بہت پیارے پیارے لفظوں میں اپنے اپنے والد کو خراج تحسین پیش کیا۔ یہ سب آئندہ اشاعتوں میں۔

سقوط مشرقی پاکستان صرف ہماری تاریخ کا ہی نہیں تاریخ اسلام کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ اس کی پرتیں کھلتی رہیں گی۔ نئی نئی کہانیاں سامنے آئیں گی۔ سید ارتقا احمد زیدی کی یہ سلسلہ وار تجزیاتی کہانی بہت دلچسپی سے پڑھی جارہی ہے۔ کیونکہ اس میں عوامی سچائیاں منکشف ہورہی ہیں۔ اسلام آباد ٹیلی فون کی عمارت سے روتا ہوا ایک شخص 16 دسمبر 1971 کو باہر نکل رہا ہے کہ مشرقی پاکستان سے ٹیلی فون کا رابطہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے ہم نے مشرقی پاکستان کھودیا۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

قسط نمبر 8

# 16 دسمبر۔ جب ٹیلی فون سے مشرقی پاکستان کا رابطہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا

☆تحریر: سید ارتقا احمد زیدی

میجر احتشام نے بتایا کہ سب فوجیوں اور سویلین نے 12 دسمبر کی رات تقریباً جاگ کر گزاری انہیں ڈھاکہ سے احکامات ملے تھے کہ 13 دسمبر کو کھلنا سے ڈھاکے کی طرف کوچ کرنا ہے۔ رات بھر فوجیوں نے منصوبہ بندی میں گزارا کہ کسی طرح انہیں ڈھاکے کا دفاع کرنا ہے۔ کسی طریقے سے دشمن کو ڈھاکا کی حدود سے دور رکھنا ہے۔ یہ اطلاعات تو مل رہی تھیں کہ ہندوستانی فوج ڈھاکا کی طرف پیش قدمی کررہی ہے اور مکتی باہنی کی ایک بڑی تعداد بھی ان کے ساتھ ہے۔ لیکن پاکستانی افواج کا حوصلہ بلند تھا کہ پاکستانی فوج اپنے گولہ بارود سے کئی دن ہندوستانی افواج کا مقابلہ کرسکتی ہے اور اس دوران اقوام متحدہ میں دوست ممالک مل کر ایسی قرارداد ضرور منظور کرالیں گے جس سے فوری جنگ بندی کی راہ ہموار ہوجائے گی اور مشرقی پاکستان بچ جائے گا۔ لیکن جب کھلنا سے پاکستانی افواج اور سول اداروں کے ملازمین 14 دسمبر کی شام ڈھاکا پہنچے تو وہاں ایک حوصلہ شکن ماحول دیکھا۔ ہندوستانی فوج نے پاکستانی فوج کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ اور مکتی باہنی والے بھی ہندوستانی فوج کے ساتھ کھڑے تھے اور اسلحہ لہرا کر بنگالی زبان میں پاکستانی فوج اور سویلین کو دھمکیاں دے رہے تھے 15 دسمبر کا پورا دن گومگو کی حالت میں گزرا۔ اور پھر 16 دسمبر کی شام جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے سرنڈر کی دستاویز پر دستخط کردیے۔ اس کی تفصیل پچھلی قسطوں میں لکھی جاچکی ہے۔

16 دسمبر کی شام اسلام آباد میں بہت سوگوار تھی۔ ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی وژن کوئی خبریں نہیں دے رہے تھے اس لیے سب لوگ غیر ملکی ذرائع سے ملنے والی خبروں پر انحصار کررہے تھے اور انتظار کررہے تھے کہ کب وہ روح فرسا خبر آئے گی جب ہمارا مشرقی بازو ہم سے علیحدہ ہوجائے گا۔ میں اس وقت اسلام آباد میں سیکٹر F-6/4 میں رہتا تھا میرے گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے دوسرے سرے پر محکمہ ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کی عمارت تھی۔ وہاں پر عملہ سوگوار بیٹھا تھا کہ کب ٹیلی فون کی لائن منقطع ہوجائے۔ میں بوجھل

> بھارتی فوج اور مکتی باہنی ڈھاکے کی طرف پیش قدمی کررہی تھی

قدموں سے میدان کو عبور کرکے ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کی عمارت کے سامنے بے مقصد کھڑا تھا۔ اچانک ایک آدمی عمارت سے روتا ہوا نکلا اور میرے پاس سے یہ کہتا ہوا گزر گیا کہ ٹیلی فون سے مشرقی پاکستان کا رابطہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ ہم نے مشرقی پاکستان کھودیا۔ میں نے اسے روکا اور تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کی وہ رکا اپنے آنسو پونچھے اور بتایا کہ وہ ڈھاکا میں اپنے محکمہ کے عملے سے بات کررہا تھا۔ وہ اگرچہ سب کے سب بنگالی تھے لیکن بہت ہی افسردہ تھے اور ٹوٹی پھوٹی اُردو اور زیادہ تر انگلش میں اپنے جذبات کا اظہار کررہے تھے کہ جو کچھ بھی ہورہا تھا وہ ان کی خواہشات کے خلاف تھا۔ وہ متحدہ پاکستان کے حامی تھے۔ اور بنگلہ دیش کے قیام کے خلاف تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ شاید ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی فوجیوں کو ٹیلی فون اور ٹیلی گرام کی عمارت میں داخل ہوتا دیکھ رہا ہے۔ اس نے جذبات سے

رندھی ہوئی آواز مین کہا۔''میرے پاکستانی دوستو! ہمیشہ کے لیے خدا حافظ۔''اور پھر لائن کٹ گئی۔

دنیا کچھ بھی کہے۔ ہندوستان جو بھی پروپیگنڈہ کرے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مشرقی پاکستان کی ایک خاموش اکثریت پاکستان سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس کا ثبوت

**بھارتی فوجی ٹیلی فون کی عمارت میں داخل ہورہے تھے**

یہ ہے کہ وہاں کے عوام اب بھی پاکستان کے لیے محبت اور احترام کے جذبات رکھتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔

میں نے دومرتبہ2004اور 2005 میں بنگلہ دیش کا سرکاری دورہ کیا۔ اس وقت خالدہ ضیاء کی حکومت تھی۔ حالات بالکل مختلف تھے۔ بنگلہ دیش کے عوام پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ جس کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ پہلی مرتبہ فروری 2004 میں یورپین یونین کے زیراہتمام ڈبلیو ٹی اوWTO سے متعلق ایک سیمینار میں شرکت کے لیے بنگلہ دیش گیا۔ وہاں بنگلہ دیش میں اسٹیٹ بینک کے ایک ڈپٹی ڈائریکٹر مورشید ملت Mourshed Millat نے (جو اسلام آباد میں2003 میں آئی ایم ایف کے ایک سیمینار میں شرکت کرچکے تھے اور ان سے کافی دوستی ہوگئی تھی)۔ بڑی اچھی طرح مہمان نوازی کی۔ سیمینار کے پہلے ہی دن رات کو مورشید نے کھانے پر اپنے گھر مدعو کیا۔ اپنے والدین اور بیوی بچوں سے ملوایا۔ کھانے کے بعد کافی دیر تک ان کے والد پاکستان کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی جب انہوں نے پاکستان کی سیاسی صورت حال پر بڑا تفصیلی تجزیہ کیا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پاکستان کے بارے میں خبروں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ بنگلہ دیش کے بارے میں بات کرتے ہوئے انہوں نے بڑے کرب سے کہا ۔جس دن بنگلہ دیش بنا تھا اس دن انکے گھر میں کھانا نہیں بنا۔

**ایوب خان نے مجیب کے خلاف درست ایکشن لیا تھا**

اور وہ روئے تھے۔ انہوں نے پاکستان توڑنے کا ذمہ دار شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کو ٹھہرادیا۔ انہوں نے کہا کہ اگرتلہ سازش کیس میں شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف ایوب خان نے صحیح ایکشن لیا تھا۔ بعد میں یہ بات ثابت ہوگئی جب انڈیا نے مداخلت کرکے بنگلہ دیش بنوادیا۔ میں ان کی باتوں سے بے حد متاثر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ بنگلہ دیشی پاکستان کے بارے میں نیک خیالات رکھتے ہیں اور پاکستان سے محبت

سیاسی سرگرمیوں پر [illegible] لگا دی گئی

عوامی لیگ کو سیاسی جماعت کی حیثیت سے مکمل طور پر ممنوع قرار دے دیا گیا

شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھی پاکستان کے دشمن اور غدار ہیں

نوائے وقت

مشرقی پاکستان کی صورت حال پر قابو پانے کے لئے مارشل لاء کے احکام

کرتے ہیں۔ جب بھی ڈھاکا میں کسی بھی ٹورنامنٹ میں انڈیا پاکستان کا کرکٹ میچ ہوتا ہے۔ بنگلہ دیشی شائقین پاکستان کے پرچم اٹھاکر پاکستان کے حق میں نعرے لگاتے ہیں۔ اور پاکستانی ٹیم کی فتح کا جشن مناتے ہیں۔ میں ان کی باتیں خوشگوار حیرت اور کچھ بے یقینی سے سنتا رہا۔ لیکن اگلے چار روزہ قیام کے دوران جو واقعات رونما ہوئے ان سے اندازہ ہوا کہ مورشید کے والد نے جو بھی باتیں کی وہ درست تھیں۔

ڈنر کے بعد مورشید سائیکل رکشہ میں مجھے ہوٹل چھوڑنے آئے سڑک یکطرفہ ٹریفک کے لیے تھی۔ مورشید نے رکشہ ڈرائیور کو مخالف سمت سے سڑک میں داخل ہونے کے لیے کہا چونکہ تھوڑی سی دور بعد مین روڈ آجاتی تھی اور کافی فاصلہ طے کرنے کی بچت ہوجاتی تھی۔ رکشہ ڈرائیور نے کہا کہ مین روڈ پر سپاہی کھڑا ہوتا ہے وہ چالان کردے گا۔ مورشید نے کہا کہ وہ اس کا ذمہ ہے چالان نہیں ہوگا۔ چنانچہ رکشہ والے نے غلط سمت سے رکشہ سڑک میں داخل کردیا۔ مین روڈ پر سپاہی نے اشارے سے رکشے کو روکنے کے لیے کہا۔ مورشید نے سپاہی کے پاس جاکر بنگالی میں کچھ کہا۔ وہ مسکراتا ہوا رکشے کی طرف

**مشرقی پاکستان کی ایک خاموش اکثریت علیحدہ نہیں ہونا چاہتی تھی**

آیا اور مجھ سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ سپاہی نے چالان نہیں کیا اور ہم مین روڈ پر سفر کرکے ہوٹل پہنچ گئے۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے مورشید سے پوچھا کہ ٹریفک سپاہی نے چالان کیوں نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ جب سپاہی کو یہ بتایا کہ پاکستان سے مہمان آئے ہیں اور وہ انہیں ہوٹل چھوڑنے جارہا ہے تو اس نے کہا کہ اگر پاکستان سے مہمان آئے ہیں تو وہ اس کے بھی مہمان ہیں۔ (جاری ہے)

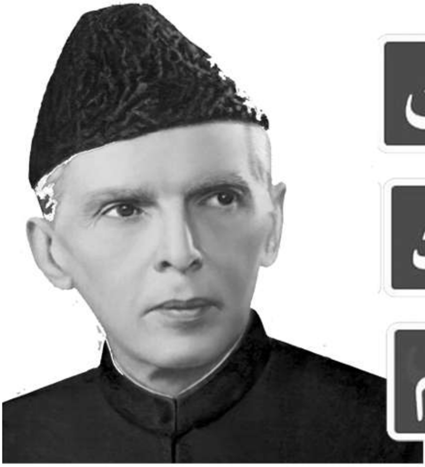

ایمان

اتحاد

تنظیم

"ڈاکٹر شیما ربانی۔ اُردو کی پروفیسر ہیں۔ کئی کتابوں کی مصنف۔ ان کے عظیم والد جسٹس ایس اے ربانی نے بھی انتہائی اہم کتابیں قوم کو جگانے کے لیے لکھیں۔ اپنی خودنوشت بھی۔ ڈاکٹر شیما ربانی نے اس مختصر سی تحریر میں آج کے بہت حساس۔ اور خود کش موضوع کی طرف توجہ دلائی ہے کہ سوشل میڈیا پر دانستہ نادانستہ اپنے بانیان کی تضحیک کر کے ہم اسی شاخ کو کاٹ رہے ہیں جس پر ہمارا آشیانہ ہے۔"

# بانیان پاکستان کے لیے سوشل میڈیا پر تضحیک کا لہجہ کیوں۔؟

تحریر: ڈاکٹر شیما ربانی، کراچی

تین مسئلے ایک گھڑونچی پر دھرے تھے جس میں ہر ایک پر الگ الگ لفظ تحریر تھا۔ اتحاد تنظیم اور یقین محکم۔ جس میں سے پہلا مٹکا آدھا ٹوٹا ہوا تھا جبکہ دوسرا مٹکا کئی ٹکڑوں پر بمشکل بچے کھچے پیندے کے اندر رکھا ہوا تھا اور تیسرے مٹکے کا تو گلا ہی غائب تھا۔ یہ مٹکے جس مکان کے صحن میں موجود تھے وہ اپنے مکین کی

## آفاقی اصولوں کی بجائے شخصی طاقت کا محور

منتشر زندگی کا پتہ دے رہے تھے۔ یہ تمثیل دراصل مشہور ڈرامہ ''تعلیم بالغان'' جس کے مصنف خواجہ معین الدین کے ایک منظر سے لی گئی ہے۔ یہ منظر آج کے دور میں بھی بہت حد تک من حیث القوم ہمارے حال کا پتہ دے رہا ہے۔ جب ملک ابھی وجود میں ہی آیا تھا تب سے اس کی بنیادوں میں موجود لہو اور قربانیوں کے لئے جو ایمان اور احترام دلوں میں موجود تھا، اُس پر ابتداء سے ہی مٹی ڈالی جانے لگی کہ بانیانِ مملکت کے لئے لوگوں کے دلوں میں شبہ اور شک پیدا کر دیا جائے اور ان کی بے لوثی، بے غرضی اور نیک نیتی وانتھک محنت جس نے مقصد کے حصول کے لئے ایمان جیسی طاقت کا روپ دھار کر عام مسلمانوں میں بجلی سی رو پیدا کر دی تھی، ان شخصیات پر سوال اٹھا دیا جائے اور انکو اپنی صفائی دینے کے لئے کچھ سمجھ میں ہی نہ آئے کہ وہ اپنی کھلی اور عملی زندگی کے علاوہ قوم کے سامنے کیا پیش کریں !!۔۔ جیسے نوابزادہ لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین اور بہت سے دیگر صاحبانِ عزم و ہمت۔

حقیقتاً یہ وہ درجہ اولیٰ کی جماعت تھی جس کو مملکت خداداد کے مستقبل کے لئے ضیا پاش ہونا چاہیئے تھا۔ آج عالم یہ ہے کہ عام نوجوان تک ان شخصیات پر سوشل میڈیا پر موجود جھوٹ سچ پر مبنی مواد کو سامنے رکھ کر سوال اٹھاتا ہے، وہ بھی تضحیک کے لہجے میں۔

جب قوم اپنی بنیاد پر سوال اٹھانے کی اجازت دے دے تو پھر ملک میں نظام کا بحران پیدا ہو جایا کرتا ہے اور ایسا ہی ہوا اور مملکت میں بھی نظام کا محور فرد کے مفادات بن گئے اور نظام انہی مقاصد کے تحت وضع کیے جانے لگے جب کوئی بھی

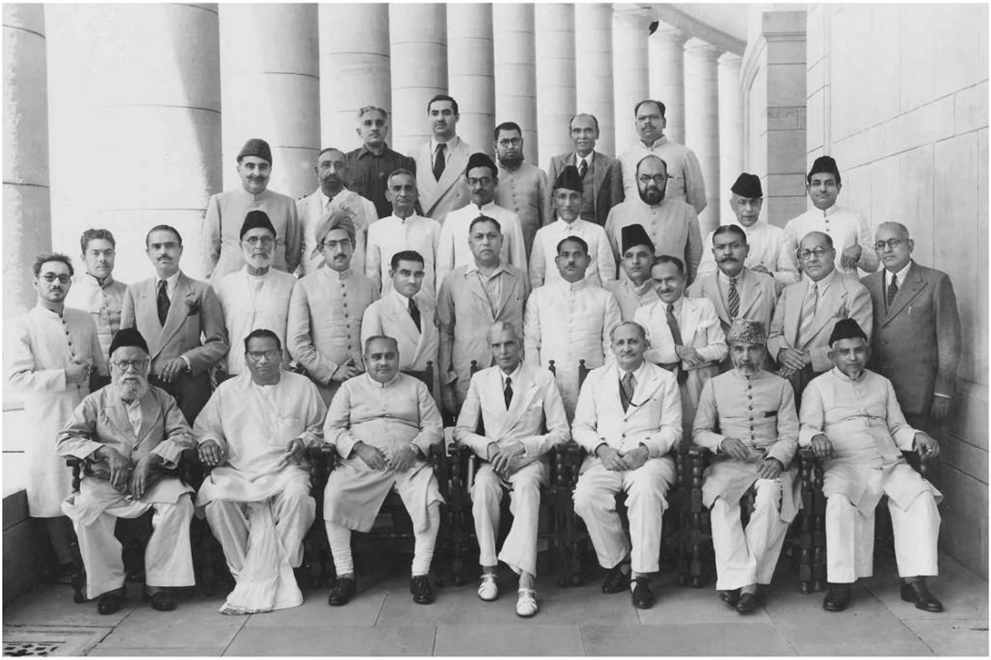

قوم جنگل کے واحد اصول کو اپنا لے جو کہ بقاء محض Principle of Survival ہوتا ہے۔ تب ایسی قوم کے لئے نیوسینس ویلیوز (Nuisance Value) اپنے دفاع کے لئے ضروری ہو جاتی ہیں یعنی جس کی لاٹھی اُس کی بھینس، یعنی معاشرے میں جس کے پاس یہ اختیار ہو گا کہ وہ دوسرے کو زیادہ نقصان پہنچا سکے وہی معاشرے کی رُو اور رخ کا تعین کر سکتا ہے اور ایسا معاشرہ اپنے اندر ہی موجود اس طبقے کی طاقت اور حکمرانی کے دعویٰ کو قبول کر لیتا ہے۔ ایسا ہی ہماری مملکت خداداد میں ہوا جس نے نظام کا محور آفاقی اصولوں سے تبدیل کر کے شخصی اور انفرادی طاقت کی جانب منتقل کر دیا۔ لہٰذا بانی مملکت کے دیئے ہوئے دوسرے اصول تنظیم کے پاؤں اکھڑنے لگے جس کا انجام معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان کشمکش اور ایک دوسرے پر شک وشبہ کی صورت میں سامنے آیا اور بالآخر قومی اتحاد کے آئینہ کو چکنا چور ہوتے دنیا نے دیکھا اور عظیم المیہ سقوط ڈھاکہ پیش آیا۔ قوم نے محض چند سال اس کے دکھ کو محسوس کیا مگر بہت جلد قوم کی توجہ اپنے ہی اندر موجود طبقوں کی کشمکش کی جانب ہو گئی اور ایک بار پھر ایمان کی بنیاد پر قوم کے سامنے ایک نعرہ لگا دیا گیا مگر اس نعرے کے پیچھے نیت کا فرق ہی معاشرہ کو پھر ملکی میڈیا آفاقی و دینی اصولوں کی اصل طاقت کے بجائے نئے نعرے کے محض خول کو قبول کرنے میں مدد دیتا

## تین مٹکے میٹھے پانی سے لبریز کیسے رکھے جاسکتے ہیں

ہے۔ اور آہستہ آہستہ قوم کا اعتماد اپنے ہی وجود پر کم ہونے لگا اور اس طرح بانی مملکت خداداد کے دیئے ہوئے اصول ''یقین محکم'' کو متزلزل کرنے کی بھرپور کوشش آگے بڑھائی جانے لگی جس میں سب سے اہم ہتھیار یہ رہا کہ قوم میں موجود کمزوریوں اور منفی خصوصیات کو خوب اجاگر کیا جائے، نئے ہزاریے کی ابتداء میں یہ کام اشاعتی اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ہونا شروع ہوا اور ملک کے نجی ٹی وی چینل مختلف نظریوں کے حامل لوگوں نے شروع کئے تو اس مقصد کو حاصل کرنا اور آگے بڑھانا قدرے آسان ہو گیا تھا۔ قوم کے دل اور ذہن میں اپنی ہی تضحیک کر کے اور اپنے ہی لئے منفی رویوں کو ابھار کر اپنے ہونے پر ہی شک پیدا کر دیا جائے تاکہ جس کے نتیجے میں قوم کے خود پر یقین میں کمی آتی جائے اور وہ یہ تک نہ سوچ پائیں کہ وہ اپنے مستقبل اور آئندہ نسلوں کے لئے بہتر مملکت، نظام اور اقدار دے کر جاسکے گی یا نہیں۔ اس وقت ضرورت اس امر کی محسوس ہوتی ہے کہ جو اصول بانی پاکستان نے بتائے تھے ان پر نئی نسل کا اعتماد قائم کرنے کے لئے فضاء پیدا کی جائے جس کا اصل مرکز ملک کی درسگاہیں اور علمی ادارے ہی بن سکتے ہیں۔ کیونکہ علم کا مطلب ہی جاننا ہوتا ہے اور اب نوجوانوں کو آفاقی وقومی اصولوں کے بارے میں جاننے اور سمجھنے میں مدد دینا ضروری لگتا ہے۔ تاکہ یہ تین مٹکے، قوم کے پختہ اتحاد، اعلیٰ تنظیم اور قومی عظمت پر یقین محکم کے میٹھے اور پُرسیر اب پانی سے ہمیشہ لبریز رہیں۔ ❁

# پاکستان آئی بینک سوسائٹی
# علاج کا دائرہ وسیع تر

پاکستان آئی بینک سوسائٹی اسپتال کے چیئرمین قاضی ساجد علی نے جرمن فورم BASF کی سربراہی سے ریٹائر ہو کر اب صرف خدمت خلق کو اپنا نصب العین بنالیا ہے۔ اسپتال صرف آنکھوں کے امراض اور خاص طور پر قرنیہ کی تبدیلی کے لیے مختص تھا۔ لیکن اب علاقے کے حالات دیکھ کر ڈائلیسز۔ منہ کے سرطان۔ چھاتی کے سرطان کے مفت علاج کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ کراچی کے ضلع وسطی میں یہ اسپتال امید کا مرکز بن گیا ہے۔ حال ہی میں منعقدہ ایک سیمینار کی رپورٹ ملاحظہ کیجئے۔

## امراض چشم کے ساتھ ساتھ ڈائیلسز۔ منہ کا سرطان۔ چھاتی کے سرطان کا علاج بھی مفت

تحریر: جہاں آراء

پاکستان آئی بینک سوسائٹی (PEBS) کا شمار پاکستان کے بڑے سماجی فلاحی اداروں اور ہسپتالوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان آئی بینک سوسائٹی کا قیام 1970 میں ابتدائی طور پر کراچی میں ایک سوشل ویلفیئر ایجنسی کے طور پر عمل میں لایا گیا تھا۔ لیکن آج یہ ادارہ ایک بڑے اور تمام تر جدید سہولتوں سے آراستہ ایک مکمل ہسپتال کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ PEBS میں باقاعدہ EYE Donation Movement چلائی جاتی ہے جس کے تحت ملکی اور غیر ملکی سطح پر آنکھوں کے عطیات وصول کر کے غریب اور مستحق افراد کو یہ آنکھیں مفت لگائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ایک مخیر حضرات سوسائٹی کو مالی امداد اور معاونت بھی فراہم کرتے ہیں۔ اور اب PEBS نے اپنی خدمت کا دائرہ بصارت سے بڑھا کر

### بریسٹ کینسر موروثی بھی۔ اور ماحول سے بھی

دیگر کئی ایک خطرناک امراض کی تشخیص اور ان کے مفت علاج تک پھیلا دیا ہے۔ جو لوگ آنکھوں کے علاج کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے PEBS کی جانب سے ان کے لئے مختلف علاقوں میں باقاعدگی سے مفت آئی کیمپ بھی لگائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آئی بینک سوسائٹی کے تحت آنکھوں کی بیماریوں اور ان سے بچاؤ کے بارے میں آگاہی پیدا کرنے کے لیے تعلیمی اداروں اور دیگر مقامات پر سیمینارز، لیکچرز کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے اور غریب اور مستحق افراد کے موتیا کے آپریشن بھی مفت کئے جاتے ہیں۔

ویسے تو پاکستان آئی بینک سوسائٹی کی نمایاں خدمات میں سب سے اہم مفت ڈائیلسز سینٹر کا قیام اور منہ کے سرطان کے مفت علاج کے لئے اورل کینسر سرجری یونٹ کا قیام ہے۔ لیکن حال ہی میں یہاں بریسٹ کینسر کی تشخیص اور علاج کے لئے ایک نئے یونٹ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اسی ضمن میں ہسپتال کی انتظامیہ کی جانب سے یکم جون 2024 کو ایک روزہ سیمینار بعنوان "بریسٹ کینسر آگاہی سیمینار" کا بھی انعقاد کیا گیا۔ اس سیمینار میں پاکستان آئی بینک سوسائٹی کی پبلک ریلیشن سیکریٹری نصرت جہاں صاحبہ نے خطبہ استقبالیہ دیا اور ہسپتال کا تعارف پیش کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر رابعہ کاشف صاحبہ نے آگاہی لیکچر دیا جبکہ نظامت کے فرائض مریم مرچنٹ نے انجام دیئے۔ اس سیمینار میں وفاقی اردو یونیورسٹی کی طالبات، ووکیشنل ٹریننگ سینٹر نارتھ کراچی کی طالبات، اکبر پبلک اسکول اور گرین لینڈ اسکول کی اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں ڈاکٹرز اور این جی او۔ والینٹرز نے شرکت کی۔

ڈاکٹر رابعہ کاشف نے بتایا کہ پاکستان سمیت دنیا بھر میں

### آٹھ میں سے ایک عورت چھاتی کے سرطان میں مبتلا

عورتوں کو ہونے والے کینسر میں اب بریسٹ کینسر سرِفہرست ہے۔ پاکستان میں ہر آٹھ میں سے ایک عورت اس مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے جو کہ نہایت ہی تشویش ناک صورتحال ہے۔ ڈاکٹر رابعہ نے کہا کہ، چھاتی کے سرطان پانچ اسٹیج ہوتی ہیں۔ صفر، پہلی یا دوسری اسٹیج پر بھی اگر اس بیماری کی تشخیص ہو جائے تو اس کا علاج ممکن ہے۔ لیکن اگر یہ مرض چوتھی یا پانچویں اسٹیج تک پہنچ جاتا

# پاکستان آئی بینک سوسائٹی۔علاج کا دائرہ وسیع تر

تو پھر اس کا علاج ممکن نہیں ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل تک خواتین میں چھاتی کے سرطان کی تشخیص عموما آخری اسٹیج پر ہوا کرتی تھی۔کیونکہ خواتین اس قسم کی بیماری کو بتانے میں شرم یا جھجک

**پلاسٹک کا استعمال بند۔**
**تازہ پھل اور سبزیاں زیادہ**

محسوس کرتی تھیں اور خاموشی سے اپنی تکلیف کو جھیلتی رہتی تھیں۔عموما گھروں میں بچیوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ اپنے جسم کے پرائیویٹ پارٹس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی چاہئے۔ یہ درست رویہ نہیں ہے۔یہی رویہ اکثر اوقات جان لیوا بیماریوں کا سبب بن جاتا ہے۔

اس مرض کی بروقت تشخیص اور روک تھام کے لئے ضروری ہے کہ اس کی علامات پر بات کی جائے۔خواتین کو چاہئے کہ وہ اپنے جسم کے مخصوص اعضا میں اگر کسی بھی قسم کی غیر معمولی تبدیلی محسوس کریں

**پاکستان آئی بینک سوسائٹی**
**اسپتال میں بریسٹ کینسر**
**سے آگاہی سیمینار کی رُوداد**

یعنی گلٹی کا بن جانا، سائز کا تبدیل ہونا،سوجن ہونا،جلد کی رنگت تبدیل ہوجانا یا پھر کسی بھی قسم کے مواد کا خارج ہونا وغیرہ۔تو ان علامات کو نظر انداز کرنے یا چھپانے کی بجائے فوراڈاکٹر سے رجوع کریں اور اپنا معائنہ کروائیں۔

ڈاکٹر رابعہ کاشف کا کہنا تھا کہ بریسٹ کینسر کی بروقت تشخیص کے لئے ضروری ہے کہ اٹھارہ سے چالیس سال کی عمر کی خواتین ہر تین یا چار ماہ بعد اپنی چھاتی کا مکمل معائنہ کریں۔ یہ معائنہ خواتین خود آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر،کرسکتی ہیں۔سیمینار میں طالبات کو اس معائنہ کا طریقہ بھی سکھایا گیا۔اس کے برعکس چالیس سال سے زائد عمر کی خواتین کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر دو یا تین سال بعد اپنی میموگرافی کروائیں۔

ڈاکٹر رابعہ کاشف نے بتایا کہ بریسٹ کینسر کا مرض موروثی

بھی ہو سکتا ہے اور یہ ہمارے ماحول سے بھی پھیل سکتا ہے۔ماحول سے مراد آلودگی ،دھواں اور کھانے پینے کے رجحانات وغیرہ ہیں۔ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں خواتین میں چھاتی کا کینسر بہت تیزی سے پھیلنے کی وجہ دراصل مغرب کے انداز زندگی کو اپنانا ہے۔فاسٹ فوڈ اور مائیکرو ویو، پلاسٹک کے برتن وغیرہ کا بے دریغ استعمال ہر طبقے میں پھیل چکا ہے۔لہذا ہمیں اپنا طرز زندگی بدلنا ہوگا۔اس کے لئے ضروری ہے کہ پلاسٹک کے استعمال سے دریغ کیا جائے۔تازہ پھل اور سبزیوں کا استعمال کریں۔گوشت کا استعمال بھی کم کریں حتی کہ مچھلی کے استعمال میں بھی احتیاط ضروری ہے۔لباس میں ہلکے رنگ اور کاٹن کے لباس کا استعمال کریں خاص کر انڈر گارمنٹس کاٹن کی استعمال کریں۔لہذا ہر ممکن سادہ طرز زندگی اپنائیں۔

ڈاکٹر رابعہ کاشف نے ایک خاتون کی کہانی بھی بتائی جو بریسٹ کینسر میں مبتلا تھی لیکن اپنا مرض بتانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی تھی جس کی وجہ سے مرض آخری اسٹیج تک پہنچ کر نا قابل علاج ہوگیا۔اور تشخیص کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہی وہ خاتون انتقال کرگئی۔

ڈاکٹر رابعہ کاشف نے کہا کہ اگرچہ چھاتی کے سرطان کا علاج عام طور پر سرجری سے شروع ہوتا ہے،لیکن کچھ حالات ایسے ہیں جن میں آپ کا ڈاکٹر پہلے کیموتھراپی کی سفارش کرسکتا ہے۔مثال کے طور پر،اگر آپ کو ایک بڑا ٹیومر یا گلٹی بن گئی ہے جس سے چھاتی کا سائز چھوٹا ہورہا ہے تو ایسی صورت میں کیموتھراپی ٹیومر کو اتنا سکیڑ سکتی ہے کہ اسے نکالنا ممکن ہوسکے۔بریسٹ کینسر کی تشخیص کے لیے میموگرافی سے سینے میں پیدا ہونے والی گلٹیوں کے بڑے ہونے سے پہلے ہی اس کی تشخیص کرلی جاتی ہے۔ ۞

اپنی آنکھوں کا عطیہ دینے کے لیے۔آئی بینک اسپتال میں اپنی زکوۃ اور عطیات کا حصہ ڈالنے کے لیے رابطہ نمبر۔ نصرت جہاں :0300-3569590

”نسیم انجم نامور افسانہ نگار۔ روزنامہ ایکسپریس کی کالم نویس۔ ان سے درخواست کی گئی تھی کہ شاپنگ کے موضوع پر اپنے تاثرات اور مشاہدات کا اظہار کریں۔ ان کی مبسوط تحریر مل گئی تھی۔ مگر کچھ صفحات اِدھر اُدھر ہوگئے اس لیے معذرت خواہ ہیں کہ جون کے شُمارے میں یہ اہم اور دلچسپ تحریر شامل نہ ہوسکی۔ پڑھئے اور کراچی میں شاپنگ کی لوٹ مار ملاحظہ کریں۔“

# جتنی زیادہ سجی سنوری۔ اتنی مہنگی

تحریر: نسیم انجم، کراچی

ماہنامہ 'اطراف' کے بانی و مدیر جناب محمود شام نے ہم خواتین کے لیے ایک بہت دلچسپ موضوع پر لکھنے کا حکم دیا ہے۔ اور ہم نے خوشی خوشی سرِ تسلیم خم کرلیا ہے گو کہ ماہ اپریل ہمارے لیے لکھنے، پڑھنے کے حوالے سے بے حد مصروفیات کا مہینہ تھا، مضامین، ناول، تقریب اجراء کے لیے خصوصی مضمون، تجزیہ و تبصرہ وغیرہ، وقت مقررہ پر مدیرانِ جرائد کو تحریریں ارسال کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، ہم بھی کب ہار ماننے والے تھے، ہمت مرداں مدد خدا، کے مصداق

**قیمت کم کروانے کی کوشش کبھی کبھی بار آور بھی ہوجاتی ہے**

حوصلہ بلند کیا اور آتش نمرود میں کود گئے۔

تو اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف کہ شاپنگ کرتے وقت ہم کن باتوں کا خیال رکھتے ہیں اور کہاں کہاں سے خریداری کرتے ہیں۔ سب سے پہلی اور اہم بات مقررہ نرخوں میں کمی کرانا ان دکانوں سے جہاں ممکن ہو۔

بعض دکاندار مناسب قیمت بتانا اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں لیکن اکثر خواتین جن میں ہمارا اپنا بھی شُمار ہوتا ہے اپنی فطرت اور عادت سے مجبور ہوکر قیمت کم ضرور کراتی ہیں' اس وقت تو ہماری غرض و غایت دوسری خواتین سے ہرگز نہیں ہے، ہمیں تو اپنی ہی روداد لکھنی ہے۔ تو صاحبو! ہم خصوصی مواقع پر مارکیٹ کا رخ کرتے ہیں جن میں عید، بقر عید، شادی، بیاہ یا پھر گرمی کے کپڑے خصوصاً لان، سردی کے لیے تو ہم نے کبھی گرم کپڑے نہیں خریدے، سوائے سوئیٹر یا شال کے چونکہ کراچی میں تو سردی اپنا مکھڑا دکھانے آتی ہے اور بہت جلد رخصت ہوجاتی ہے۔ اس قدر گرانی میں خریداری کوئی سی بھی ہو ہرگز آسان نہیں ہوتی ہے۔ گرمی کی بہ نسبت سردی میں اکثر گھرانوں میں اخراجات کم ہی ہوتے ہیں۔ غریب اپنی گدڑیوں میں گھس کر یا آگ جلا کر گزارہ کرلیتے ہیں جبکہ صاحب ثروت کے لیے ہر موسم کے علیحدہ مزے ہوتے ہیں۔

ارے بھئی عادتاً ہم پھر موضوع سے ہٹ گئے ہیں گویا مستقل مزاجی تو ہم سے نہ جانے کیوں خفا خفا سی رہتی ہے لیکن ہر معاملے میں نہیں۔ ہم بات کررہے تھے شاپنگ کی، تو جناب مارکیٹ میں داخل ہوتے ہی برینڈڈ کپڑوں پر ہماری نگاہ ٹک جاتی ہے ہوتے تو مہنگے ہیں لیکن ہوتے پائیدار ہیں کئی سال تک ساتھ نہیں چھوڑتے، سستا روئے بار بار اور مہنگا روئے ایک بار تو ایک ہی بار قلم نازک پر بھاری پتھر رکھ لیتے ہیں۔ ہمیں یہ بات تو اچھی طرح معلوم ہے کہ دکاندار کسی بھی قیمت پر پیسے کم نہیں کریں گے۔ پھر بھی کوشش کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے سو ہم انکسار اور تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے قیمت کم کرانے کی تگ و دو اس طرح کرتے ہیں جیسے دکاندار سے ادھار مانگ رہے ہوں۔

کیا کچھ اس کے دام کم ہوسکتے ہیں۔؟

دکاندار ہماری شکل بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے دیکھئے یہ ہم نے لکھ دیا ہے۔ Fixed Price۔ جی جی وہ تو صحیح ہے' زیادہ بحث کرنا ہماری عادت نہیں پھر عزت کا بھی مسئلہ ہے لہٰذا فوراً اپنی ہار مانتے ہوئے خرید لیتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ کوشش بار آور ہوجاتی ہے دکاندار رازداری سے کہتا ہے۔ بہن بس آپ کے لیے ہی سو، دو سو کی رعایت ہوجائے گی۔ ویسے ہم دام کم نہیں کرتے ہیں۔

ارے! آپ کیا ہمارے چاچا لگتے ہیں جو یہ رعایت دے رہے ہیں لیکن ہم یہ کہتے نہیں ہیں خاموشی اختیار کرکے خریداری پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس مہنگائی کے دَور میں بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی بھلی، یہ دو چار سو جو بچے ہیں کسی اور کام میں آجائیں گے۔

دکان سے تیزی سے نکلتے ہیں ایک فاتح کی طرح گویا ہم نے بھی سومناتھ کا قلعہ فتح کرلیا ہو۔

شاپنگ کرتے کرتے اس بات کا تجربہ ہمیں اچھی طرح ہوگیا ہے کہ جس قدر

دکانیں دلہن کی طرح سجی، سنوری اور برقی قمقموں سے جگمگا رہی ہوں گی وہاں اشیا کی چیزیں آسمان کو چھوتی نظر آتی ہیں ظاہر ہے انہیں ٹیکس کے ساتھ، بجلی کا بل اور خوبصورت و دیدہ زیب فرنیچر، غالیچے وغیرہ کی رقم درکار ہوتی ہے، سو وہ گاہک پر ہی بوجھ ڈال کر وصول کرتے ہیں اکثر اوقات ایسی دکانوں کا حال بھی ایسا ہی نظر آتا ہے۔

معمولی کپڑے کو مہنگا بیچنے کے فن سے اچھی طرح یہ دکاندار واقف ہوتے ہیں خوش اخلاقی کے ساتھ مختلف قسم کے تھان کھول کھول کر دکھاتے ہیں اس کام میں آدھا گھنٹہ کہیں نہیں جاتا ہے محنت کے عوض گاہک کو شیشے میں اتار لیتے ہیں اور وہ بیچارہ یہ سوچ کر کہ بیچارے نے اتنی محنت کی ہے چلو ایک دو جوڑے خریدنے میں حرج ہی کیا ہے کچھ گاہک سادہ مزاج اور خریداری کرنے کے فن سے واقف ہوتے ہیں لیکن بخدا ہمارا شُمار ان میں نہیں ہوتا ہے۔ مزاجاً تو ہم بھی سادہ ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ کوئی ہمیں بے وقوف بنالے، ہم ایسی دکانوں سے فوراً ہی اٹھ جاتے ہیں وہ لاکھ روکے، ہم یہ جا وہ جا۔ آج کل سخت مہنگائی کا دور ہے خریداری کرنا اتنا بھی آسان نہیں ہے بے چاری شوہروں کا جن کی تنخواہیں محدود ہیں وہ بہت مشکلات کا شکار ہیں دو دو نوکریاں اور اوور ٹائم کرتے ہیں' تب بھی پورا نہیں پڑتا ہے' اس کی خاص وجہ اکثر بیویوں کا پھوہڑ پن اور فضول خرچ ہونا ہے، وہ چادر دیکھ کر پیر ہرگز نہیں پھیلاتی ہیں بلکہ اپنے سہیلیوں اور پڑوسیوں کی حرص کرتے کرتے مزید آگے نکلنا چاہتی ہیں۔ قرض پر قیمتی سامان خرید لیتی ہیں اور یہ رویہ پورے

## کریڈٹ کارڈ بہت احتیاط سے استعمال کریں

گھر کا سکون برباد کرنے اور فاقہ کشی کی نوبت آنے تک ہی محدود نہیں رہتا ہے بلکہ خودکشی کے راستے پر لے جاتا ہے۔ ان کے برعکس ہماری جیسی بھی کفایت شعار اور سگھڑ خواتین بھی ہوتی ہیں جو محدود تنخواہ کو'لا محدود' ایک نپے تلے دائرے میں مقید رکھتی ہیں کہ یہ ہی اصول سب سے بہتر ہے ہم جب بھی شاپنگ کرتے ہیں سرخرو ہو کر لوٹتے ہیں۔ لیکن چند ماہ قبل کی بات ہے کلفٹن کے ایک مشہور شاپنگ مال میں اپنے بچوں کے ساتھ شاپنگ کرنے مختلف دکانوں پر چلے گئے اور ہم نے اپنا پسندیدہ ڈریس خریدنے ایک خوبصورت کپڑوں کی بوتیک میں داخل ہوئے دام پوچھے تو ہم حیران رہ گئے چونکہ چھ ہزار تک کا جوڑا ساڑھے تین ہزار کا بتایا گیا ہم نے اپنی تسلی کے لیے بار بار اُردو اور انگریزی ہندسوں میں دہرایا کہ واقعی ہم نے قیمت صحیح سنی ہے خاتون سیلر نے ہمیں اس بات کا اچھی طرح یقین دلایا کہ جی اتنی ہی قیمت ہے۔ بہرحال خوشی، خوشی شاپر سنبھالا، اب قیمت دینے کا مسئلہ درپیش تھا ہم نے انہیں اے ٹی ایم کارڈ دیا اور ہم دکان کی بقیہ کپڑوں کا جائزہ لیتے رہے مشین میں ہم نے نمبر فیڈ کیا جب رسید ہاتھ میں آئی تو انہوں نے چھبیس ہزار کی رقم کاٹی۔ اتنی دیر میں بچے بھی آ گئے بحث و مباحثہ کے بعد انہوں نے دوسرے دن ہماری رقم لوٹا دی اور ہم نے ان کا جوڑا ان کے منہ پر مارا تو جناب ایسا بھی ہوتا ہے بہت محتاط رہنے کی ضرورت

## محدود تنخواہوں والے شوہر شاپنگ سے عاجز

ہوتی ہے لاابالی پن نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ لیکن ایک بات ہمارے مشاہدے میں آئی کہ کلفٹن کی کچھ مارکیٹوں میں بہت سی اشیا مناسب داموں یا پھر سستی بھی ہیں، لوٹ مار ہرگز نہیں ہے۔ دوسری خواتین کی طرح ہمارا بھی مسئلہ آج تک برقرار ہے کہ میچنگ کی عادت ختم نہیں ہوئی حالانکہ وہ دن گزر گئے جب فیشن کرنے کا بھوت ہمارے سر پر سوار رہتا تھا، اب بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔

شاپنگ کے حوالے سے کئی دلچسپ واقعات کے ہم چشم دید گواہ ہیں، یہ بات سب کے علم میں ہے مطلب یہ کہ خواتین طارق روڈ کی لوٹ سیل سے واقف ہیں ایک بار ہمیں بھی اس ہی راستے سے گزرنا تھا جہاں عورتوں کا ایک جم غفیر تھا اور چیخنے چلانے کی آوازیں اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے اور چھینا جھپٹی کا منظر بھی سامنے تھا کچھ اپنا بچاؤ کرتی ہوئی مجمع سے نکل کر مختلف راستوں سے دوڑ رہی تھیں، ہماری چشم نے ایسا نظارہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لہٰذا جذبہ تجسس ہمیں بھی ان کے قریب لے گیا ہماری گناہگار آنکھیں کیا دیکھتی ہیں ایک سرخ رنگ کا کپڑا ایک خاتون اپنی بغل میں اس طرح دبائے ہوئے تھیں جس طرح بلی اپنے نوزائیدہ بچے کو ظالم سماج سے چھپانے کی کوشش کرتی ہے اس مظلوم عورت سے آٹھ دس عورتوں کا غول چھیننے کی کوشش میں اس طرح مصروف تھا جیسے ریسلنگ میں داؤ پیچ آزمائے جاتے ہیں کہ بس اپنے حریف پر قابو پانا ہے۔

ہم نے بھی رپورٹر کی طرح معلومات شروع کر دیں وہاں پر موجود ان خواتین نے بتایا جو پسپا ہو چکی تھیں اور زمین پر بیٹھ کر ہانپ رہی تھیں۔ ارے کیا بتائیں ہر ہفتے یہاں تو دھما چوکڑی ہوتی ہے لیکن کیوں۔؟ کیوں۔؟ ان میں سے ایک ایسے چراغ پا ہوئی کہ جیسے محترمہ ہمیں زندہ ہی نگل لیں گی۔ ارے ارے، آپ ناراض کیوں ہوتی ہیں سیل لگی ہے نا۔ اخبارات میں ہم نے خواتین کی بہادری کے واقعات سنے ہیں کسی کا دوپٹہ سر سے غائب تو کسی کے بال دوسری عورت کے ہاتھ میں اور اس صورت حال سے دکاندار کبھی ناراض تو کبھی مسکرا رہا ہوتا ہے۔ گویا ریفری کا کردار ادا کر رہا ہو۔

ابھی ہم یہ گفتگو کر ہی رہے تھے ایک آدھ آواز ہماری سماعت سے ٹکرائی آواز میں اتنا غضب تھا کہ ہمیں اپنا وجود ڈولتا نظر آیا۔ ارے تمہیں کس نے کہا ہے کہ ہمارے معاملے میں بولو، دیکھ نہیں رہی ہو حکومت نے کتنے ٹیکس لگا دیے ہیں عیش خود کرتے ہیں، غریبوں کو بھوکا مرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے، اتنی عورتیں آٹے کی قطار میں کچلی جاتی ہیں اور اسپتالوں کی لائنوں میں کچھ دھکم پیل میں کام میں آ جاتی ہیں اور بے شُمار جلا دی اور قتل کر دی جاتی ہیں اور ہم جیسی کئی کئی گھنٹے مار م کٹائی کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہیں' تیسری نے لقمہ دیا یہ جو سوٹ کا کپڑا ہے نا، بازار میں دو ہزار سے کم کا نہیں ہے اور سیل میں صرف پانچ سو، کیا کریں ہونے والی بہو کو اور کسی کو اپنی بیٹی کو عیدی بھیجنی ہے۔ اور اب بچیں تم جیسی، جو رکشے سے کود کر تماشا دیکھنے آ گئی ہو۔

اس سے پہلے کہ ہجوم ہم پر حملہ آور ہوتا ہم نے اپنی سواری کی طرف رخ کیا اور جھٹ سے سوار ہو گئے۔ ہماری سواری سیاہ تارکول کی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔

یہ تو تھا دکانوں سے خریداری کا معاملہ جہاں مکالمے کی شکل میں گفتگو کی جاتی ہے۔ لیکن آن لائن خریداری کا معاملہ مختلف ہے۔ فیس بک پر مختلف برانڈ کے سلے اور بغیر سلے کپڑے ساتھ میں جیولری، کراکری اور کچن کے استعمال کی چیزیں فروخت کی جاتی ہیں۔ اور ہم بھی اکثر وقت کی کمی کے باعث آن لائن شاپنگ شوق سے کرتے ہیں۔ چیزیں زیادہ تر اچھی اور پائیدار ہوتی ہیں، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نمبر دو مال فروخت کیا جاتا ہے۔

معیاری اور غیر معیاری دونوں ہی قسم کی چیزوں کے خریدار موجود ہیں

## لوٹ سیل۔ چھینا جھپٹی بہادر خواتین

چونکہ نیٹ پر اشیا کو ہاتھ لگا کر یا اصل صورت میں نہیں دیکھ سکتے ہیں اس وجہ سے کوالٹی کا اندازہ کم ہی ہوتا ہے ایسی چیزیں خریدنے اور نقصان کے بعد افسوس کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن پرنٹڈ کپڑوں یا جیولری میں دھوکہ نہیں کیا جاتا ہے۔ یہ تجربے کی بات ہے چونکہ کمپنیاں اپنی شہرت اور گاہک کے اعتماد کو ہرگز نقصان پہنچانے کے حق میں نہیں ہوتی ہیں۔

گاہک کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ایک تو وقت بچتا ہے دوسرا کرایہ اور ذاتی سواری کا پیٹرول، کرایہ اور پیٹرول دونوں ہی گاہک کے بجٹ اور گھریلو حالت پر اثر انداز ہوتا ہے، جب تنخواہ محدود ہو اور کمائی کا ذریعہ بھی کوئی نہ ہو تو ایک ایک پیسے کی بچت بہت ضروری ہوتی ہے، بس صاحب دکاندار اور گھر کی خواتین کی دانشمندی اور ذمہ داری کا ثبوت لازم و ملزوم ہے۔

بنیادی ضرورتیں پہلے اور خریداری شوق یا ضرورت کا درجہ ثانی پر رکھنا وقت کی ضرورت ہے تاکہ مہنگائی کے دَور میں بھی جینے کی آرزو تازہ دم رہے۔ ❁

اب 'اطراف' سلسلہ شروع کر رہا ہے۔ قوم کے گمنام ہیروز سے آپ کی ملاقات کا۔ سردی ہو یا گرمی۔ اخبار فروش ہر حالت میں اخبار قاری تک پہنچاتا ہے۔ حیدر آباد میں 'اطراف' کے بیورو چیف اور قوم کا درد رکھنے والے پروفیسر شاداب احمد صدیقی نے 40 سال سے اخبار فراہم کرنے والے محمد اخلاق صاحب سے سخت دھوپ میں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ضروری معلومات حاصل کی ہیں۔ صرف آپ کو باخبر کرنے کے لیے۔ اخبار فروشی دنیا بھر میں ایک حساس پیشہ تھا۔ جو سوشل میڈیا کی مقبولیت کی نذر ہو رہا ہے۔ محمد اخلاق جیسے پاکستانی کرپشن کے سمندر میں رزق حلال کے جزیرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر شاداب ایسے جزیروں کو تلاش کرتے ہیں۔ آپ کے ارد گرد بھی اگر ایسے رزق حلال والے لوگ ہوں تو ان سے گفتگو کر کے ہمیں بھجوائیے۔ یہ ایک عظیم قومی خدمت ہو گی۔

# انٹرنیٹ۔ زیادہ قیمت۔ خبریں کم۔ اخبار کی فروخت میں کمی

## حیدر آباد کے سینئر اخبار فروش محمد اخلاق صاحب سے پروفیسر شاداب احمد صدیقی کی خصوصی گفتگو

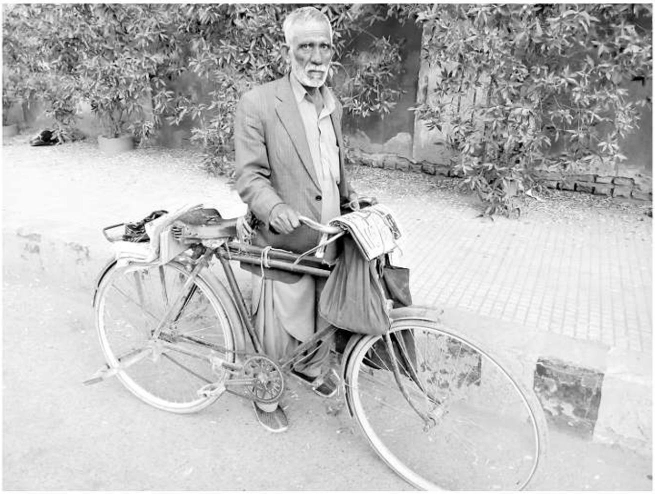

صحافت ریاست کا چوتھا اہم ستون ہے۔ صحافت سے مراد اہم ملکی اور بین الاقوامی خبروں اور معلومات کو جمع کرنا ان کا جائزہ لینا اور انہیں عوام تک پہنچانا، تاکہ لوگوں کو موجودہ

### میرے والد 1952 سے اخبارات قاری تک پہنچا رہے تھے

حالات اور مسائل سے مطمئن اور باخبر رکھا جائے شعبہ صحافت کا ایک اہم حصہ پرنٹ میڈیا یا اخبارات ہیں پرنٹ میڈیا کو معلومات کا ایک قابل اعتماد ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ پرنٹ میڈیا حالات و واقعات کا مستقل ریکارڈ فراہم کرتا ہے۔ جس سے قارئین مستفید ہوتے ہیں۔ موجودہ نامساعد حالات میں پرنٹ میڈیا اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ صحافی حضرات کے علاوہ ایک اہم گمنام کردار اور صحافت کا سپاہی جسے معاشرے اور اداروں نے فراموش کر دیا ہے۔ یہ قومی

### میں نے سب سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت کا ضمیمہ فروخت کیا

ہیرو عوام کی دہلیز پر باقاعدہ بلاناغہ پابندی سے اخبارات کی ترسیل کرتا ہے۔ ماہنامہ اطراف کے لیے میں جس گمنام کردار اور نظر انداز طبقے کو منظر عام پر لا رہا ہوں وہ اخبار فروش عرف عام میں اخباری ہاکر ہیں معاشرے میں اگر ایک معزز مقام نہ ملے تو اس میں حیرت کی بات نہیں لیکن یہ افراد ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیسے بغیر بھی اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک معزز نام محمد اخلاق صاحب اخبار فروش ہیں۔ آئیے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنے بارے میں بتائیے کہ

سوال نمبر:-آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے اور کہاں کی ہے؟

جواب: میری پیدائش 1959ء لطیف آباد حیدر آباد کی ہے۔ اس وقت میری عمر 65 سال ہے۔

سوال نمبر:-آپ کی تعلیم کتنی ہے؟

جواب: میں صرف پانچ جماعت پڑھا ہوا ہوں

سوال نمبر-آپ نے مزید تعلیم کیوں حاصل نہیں کی؟

جواب: گھر کے معاشی مسائل اچھے نہیں تھے۔ چھوٹی عمر میں ہی کام کرنا پڑا۔ والد سے پیسے مانگتے ہوئے شرم آتی تھی۔ بس مجھے یہ ہوتا تھا کہ میری جیب خالی نہیں رہے اور میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں۔ والد نے پڑھانے کی کوشش بھی کی۔

سوال: آپ نے اپنی معاشی زندگی کا آغاز کس کام سے کیا؟

جواب: میں نے اپنی معاشی زندگی کا آغاز چوڑی کی چوڑائی کے کام سے کیا۔
سوال نمبر: آپ نے اخبارات فروخت کرنے کے کام کی شروعات کس طرح کی اور کیوں؟
جواب: میرے والد 1952 سے اخبارات فروخت کر

**صبح سات بجے گھر سے نکلتا ہوں۔ شہر بھر میں اخبار بانٹ کر چھ بجے شام گھر پہنچتا ہوں**

رہے تھے لیکن 1979ء میں والد صاحب کا انتقال ہوگیا لہٰذا میں نے 20 سال کی عمر میں والد صاحب کے کام کو شروع کر دیا۔ اسی دوران ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی شہادت ہوگئی۔ میں نے شہید ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے ضمیمہ فروخت کرنے سے اس کام کی شروعات کی اور ضمیمہ فوری طور پر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔ اسی زمانے میں اخبار کے علاوہ ضمیمہ کی بھی بہت اہمیت ہوتی تھی اب تو کسی خاص مواقع پر بھی ضمیمہ نکلنا بند ہو گئے ہیں۔ ایک وقت تھا جب فوری طور پر ہزاروں کی تعداد میں ضمیمہ جاری ہوتا تھا۔ اب تو بریکنگ نیوز کا دور ہے۔ نوجوانوں کو تو ضمیمے کے بارے میں بھی معلوم نہیں ہوگا۔
سوال۔ آپ کسی وقت گھر سے نکلتے ہیں اور کون کون سے علاقوں میں جاتے ہیں؟
جواب: صبح سات بجے گھر سے نکلتا ہوں اور اخبار مارکیٹ

**سردی ہو یا گرمی۔ 40 سال سے اخبار کے عشق میں مبتلا ہوں**

ریلوے اسٹیشن کے پاس سے مختلف اردو، سندھی اور انگریزی اخبارات لیتا ہوں اور سب سے پہلے حیدر چوک گاڑی کھاتہ سے گزر کر پہلا اخبار کھوکھر محلہ میں دیتا ہوں۔ اس کے بعد صدر، بسنت ہال کے قریب گھروں اور فلیٹوں میں پھر بوہری بازار، تلک چاڑی، سرفراز چاڑی، ٹاور مارکیٹ، نور محمد ہائی اسکول کے ارد گرد دکانوں میں ہیرآباد، ڈاکٹر ریس پرویز گورنمنٹ میراں گرلز اسکول، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کالی موری کی لائبریری اور کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ، ہالا روڈ، گھمن آباد، قادر، بنگلوز تو لڑے

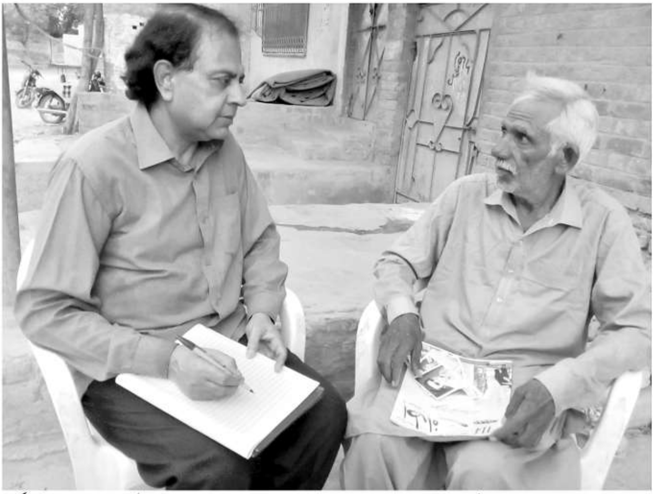

والے بابا، اسری یونیورسٹی، بائی پاس یہ اخبار فروخت کا آخری ٹھکانہ ہے۔ یہاں ایک بجے اللہ دتہ ٹائر والے کے پاس آرام کرتا ہوں اور کھانا کھا کر چار بجے واپس گھر کی طرف روانہ ہوجاتا ہوں اور چھ بجے گھر پہنچ جاتا ہوں۔ میں گھروں اور دکانوں پر اخبارات دیتا ہوں۔
سوال: آپ سائیکل پر اتنا طویل سفر طے کر کے رزق حلال کما رہے ہیں۔ آپ حیدرآباد کے آخری سرے تک جاتے ہیں آفرین ہے کیا آپ تھکتے نہیں ہیں؟
جواب: اللہ کی بہت مہربانی ہے اب تو عادت ہوگئی ہے۔ میں اب تو کام نہیں کرتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں چھٹی والے دن بوریت ہوتی ہے۔ اس کام سے عشق و جنون ہوگیا ہے۔ میں 40 سال سے یہ کام کر رہا ہوں ہمارا کام ہی ایسا ہے، ہمیں ہر صورت میں کرنا پڑتا ہے۔ چاہے طوفان ہو، آندھی ہو یا بارش، سردی ہو یا گرمی اخبار گھروں تک پہنچانا ضروری ہے۔ کچھ گھنٹے بھی دیر ہو جائے تو اخبار ردی بن جائے گا۔ یہ بہت ذمہ داری کا کام ہے۔
سوال: سائیکل پر اخبارات فروخت کرتے وقت آپ کو کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟
جواب: ہر قسم کے موسموں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر سائیکل پنکچر ہو جائے تو اس کا مکمل سامان بھی میرے پاس موجود ہوتا ہے اور میں خود ہی پنکچر لگا لیتا ہوں۔ ہر قسم کے مسئلے اور مشکل حالات سے میں نبرد آزما ہو جاتا ہوں۔ اگر کسی وجہ سے اخبار کی ترسیل کچھ دنوں کے لیے معطل ہو جائے تو پھر لوگ کسی اور ہاکر سے اخبار خریدنا شروع کر دیتے ہیں یا پھر اخبار ہی بند کر دیتے ہیں۔ اس کام میں مستقل مزاجی، صبر و استقامت، استقلال اور ثابت قدم رہنے کی ضرورت ہے۔ جو آنے والے دنوں میں کامیابی کی مسرتوں سے روشناس اور آپ کی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل میں یقینی طور پر آپ کے مددگار ثابت ہوگی۔
سوال: آپ کو ماہانہ کتنی آمدنی ہو جاتی ہے؟ کیا اس مہنگائی کے دور میں آپ کا گزارا ہو جاتا ہے؟
جواب: 30 دن کام کرتا ہوں جب 15 ہزار سے 20 ہزار

**سارا سفر سائیکل پر۔ پنکچر بھی خود لگا لیتا ہوں**

روپے ملتے ہیں، اور اگر چھٹی ہو جائے تو ماہانہ آمدنی میں فرق پڑتا ہے۔ لیکن میں چھٹی نہیں کرتا کیونکہ مہنگائی اور معاشی مسائل نے پریشان کیا ہوا ہے۔ ہماری لگی بندھی روزی ہے ہمارا گزارا اخبار کی فروخت اور کمیشن پر ہے۔ اگر اخبارات اچھی تعداد میں فروخت ہوں گے تو کمیشن صحیح مل جاتا ہے 40 روپے والے اخبار پر 16 روپے، 20 روپے والے اخبار پر 8 روپے، اخبار جہاں پر 25 روپے اور فیملی میگزین پر 25 روپے ملتے ہیں۔

سوال: روزانہ کتنے اخبارات فروخت ہوجاتے ہیں؟

جواب: اللہ کا شکر ہے، 80 سے 90 اخبارات روزانہ دیتا ہوں، کچھ اخبار راستے میں فروخت ہوجاتے ہیں۔

سوال۔ کیا اخبارات کی فروخت میں کمی واقع ہوئی ہے اور کیوں ہوئی ہے؟

جواب: جی ہاں بہت زیادہ کمی ہوئی ہے۔ انٹرنیٹ کی وجہ سے اخبارات کی فروخت میں خاصی کمی آئی ہے کیونکہ ای پیپرز انٹرنیٹ پر مفت دستیاب ہوتے ہیں۔ اخبار نہ بکنے کی وجہ ڈیجیٹل دور ہے، جس کی وجہ سے لوگوں نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ انٹرنیٹ واٹس اپ اور دیگر سوشل میڈیا فیس

**اخبار۔ رسالوں کی فروخت پر کمیشن سے گزارا**

بک پر ایک ایک سیکنڈ کی خبر آتی ہے جس سے لوگ فوری طور پر باخبر ہوجاتے ہیں۔ جو خبر اگلی صبح اخبار میں آتی ہے وہ ڈیجیٹل اور سوشل میڈیا پر لوگ پہلے ہی باخبر ہوتے ہیں۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ اخبارات کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ اخبارات میں خبریں کم اور اشتہارات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ نجی دفاتر نے بھی اخبار خریدنا چھوڑ دیا ہے لیکن سرکاری دفاتر میں ابھی بھی اخبارات کی فروخت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری سطح پر ان کو فنڈز ملتے ہیں ،لیکن اب سرکاری ادارے بھی فنڈز کی عدم فراہمی کا رونا روتے ہیں۔

سوال: اخبار خریدنے والوں میں کتنی عمر کے افراد شامل ہیں؟

جواب: بڑی عمر کے سینئر سٹیزن شامل ہیں۔ آج کل نئی نسل اخبارات کا مطالعہ نہیں کرتی ہے۔ یہ موبائیل میں مگن ہیں۔ کسی زمانے میں جنگ اخبار میں ٹارزن اور شہزادے کی کہانیاں شائع ہوتی تھیں۔ گھروں میں اخبار باقاعدگی سے روزانہ صبح کے وقت ہاکر ڈالتے تھے۔ بچے، نوجوان اور بڑے بھی ٹارزن کی کہانی بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ بزرگ کالمز اور خبروں سے باخبر اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ ناشتے کے وقت اخبار کا بے چینی سے انتظار قارئین کرتے تھے۔ ناشتے کے وقت گھر کے تمام افراد صبح کی سرخیوں پر تبصرہ کرتے تھے اور حالات حاضرہ سے واقف ہوتے تھے۔

سوال: کیا اخبار مالکان آپ لوگوں کی کسی بھی قسم کی مدد یا حوصلہ افزائی کرتے ہیں؟

جواب: آپ اخباری مالکان کی بات کر رہے ہیں۔ میں روزانہ پریس کلب کے سامنے سے گزرتا ہوں افسوس کے

**بزرگ اب بھی ناشتہ اخبار کے ساتھ ہی کرنے کے عادی**

ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج تک کسی صحافی اور پریس کلب کے ارکان نے خیریت نہیں دریافت کی اور نہ کبھی اہمیت دی۔ یہ تو آپ کا بڑا پن ہے کہ آپ نے پریس کلب کے سامنے مجھے مخاطب کیا اور میری تصاویر بنائیں اور مجھے یہ اعلیٰ اعزاز بخشا کہ آپ انٹرویو کرنے اتنی سخت گرمی میں تشریف لائے اور میری بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ میرا یہ انٹرویو تمام اخبار فروشوں کی ترجمانی ہے۔ ہمارا کوئی پرسان حال نہیں ہے اور نہ ہی امید کی کرن نظر آتی ہے۔ اپنی مدد آپ کے تحت زندگی گزر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ہے۔

سوال۔ سب سے زیادہ کون سے اخبارات فروخت ہوتے ہیں؟

جواب: قیمت کم ہونے کی وجہ سے جرات، ریاست اور امت اخبار زیادہ فروخت ہوتے ہیں۔ جنگ اخبار کی عوامی فروخت میں کمی کی وجہ لوگوں کا کہنا ہے کہ جنگ اخبار میں بہت زیادہ اشتہارات ہوتے ہیں۔

سوال: اس کام سے اب کتنے افراد وابستہ ہیں؟

جواب: اس کام میں مہنگائی کے تناسب سے بہت کم آمدنی ہے ۔100 سے 150 اخباری ہاکرز ہیں۔ کسی زمانے میں 400 سے 500 اخباری ہاکرز ہوتے تھے۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والے طلباء بھی صبح اخبار گھروں میں دیتے تھے اور اپنی تعلیم کا خرچ پورا کرتے تھے۔ اخبار دینے کے بعد اپنے تعلیمی اداروں میں چلے جاتے تھے۔ اب تو اخبارات کی فروخت میں کمی کی وجہ سے کافی اخبار فروشوں نے اس کام کو چھوڑ دیا ہے۔ پرانے اخبار کے قارئین میرے معاشی حالات اور میری مشکل دیکھ کر اخبار خریدتے ہیں۔ اس طرح میری

روزی روٹی چل رہی ہے۔ پرانے قارئین کی محبت ہے کہ اخبار خرید رہے ہیں۔

سوال: کیا کبھی اس کام سے مایوسی ہوئی اور چھوڑنے کا ارادہ کیا؟

جواب: جی بالکل کئی مرتبہ مایوسی ہوئی اور کام چھوڑنے کا ارادہ بھی کیا۔لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اس کام کے علاوہ اور کیا کروں گا ؟ اب تو اس کام کی عادت اور اس سے عشق ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کام آسان لگتا ہے۔ یہی اخبار میری روزی ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ پرنٹ میڈیا کی ساکھ گرنے کی وجہ سے اخبار فروش مایوسی کا شکار ہیں۔ اخبار فروشوں نے اخباری صنعت کو پروان چڑھایا اور اپنی زندگی کا زیادہ حصہ عوام اور قارئین کی خدمت کی ہے مہنگائی کے دور میں حکومت کے ذمہ دار محنت کش اخبار فروشوں کے حل طلب مسائل پر بھرپور توجہ دیں، حکومت سے امید ہے کہ وہ ہماری مایوسی کا خاتمہ کرے گی۔ اخبارات کی بقا کے لیے ترجیحی بنیادوں پر فوری طور پر مثبت اقدامات کیے جائیں۔

سوال: کیا آپ کو قارئین سے کوئی شکوہ شکایت ہے؟ اور کیا پیسوں کی ادائیگی بروقت ہو جاتی ہے؟

جواب: کوئی شکوہ شکایت نہیں ہے۔ وقت پر پیسوں کی ادائیگی ہو جاتی ہے اور تہواروں عید بقرعید پر خصوصی طور پر خیال کرتے ہیں۔ قارئین بہت اچھے با اخلاق ہیں۔

سوال: چھٹیاں کتنی ہوتی ہیں؟

جواب: سال میں صرف کسی بھی خاص تہواروں پر اگر اخبار شائع نہیں ہوتا تو پھر ہمیں چھٹی مل جاتی ہے ہماری چھٹی کا تعلق اخبار کی اشاعت سے ہے۔

سوال: ماہنامہ 'اطراف' کے توسط سے آپ اخباری مالکان ، اور حکومتی نمائندوں سے کیا اپیل کریں گے؟ ماہنامہ اطراف آپ کی آواز بنے گا۔

جواب: اخباری مالکان اور حکومتی نمائندوں سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ اخبار فروشوں کے معاشی حالات بہتر بنانے کے

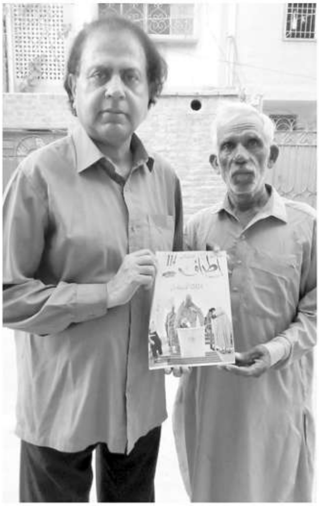

لیے بھرپور توجہ دیں اور ان کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ہنگامی بنیادوں پر اقدامات کرنے چاہئیں۔ سیاسی جماعتوں سے اپیل ہے کہ اخبار فروشوں کے مسائل کو ایوانوں تک پہنچایا جائے۔ موجودہ دور کے حالات کے پیش نظر اخبار فروشوں کو جدید سہولتوں سے آراستہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ ان کی مشکلات میں کمی آسکے۔ اخباری صنعت میں اخباری مالکان اور اخبار فروشوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قوم کی اخبارات سے دوری اور حکومتی عدم دلچسپی کی وجہ سے آج

## جنگ کی فروخت میں کمی۔ زیادہ اشتہارات

اخبار کے ادارے اور اخبار فروش دونوں شدید بحران کا شکار ہیں میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہوں کہ تمام سرکاری دفاتر، اسکولز اور یونیورسٹیوں کو اخبار خریدنے کا پابند کیا جائے تاکہ یہ صنعت بھی بحران سے نکل آئے، آنے والی نسل میں اخبار کے مطالعے کا شوق پیدا کیا جائے۔ قارئین اخبار خرید کر اخباری ہاکروں کی مدد کریں یہ مدد ہمارے معاشی مسائل میں مددگار ثابت ہوگی ہاکرز کی وجہ سے ہی اخباری صنعت موجود ہے۔ صحافت کو زندہ رکھنے میں اخبار فروشوں کا بہت اہم کردار ہے۔

سوال: ماہنامہ 'اطراف' اور محمود شام کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

## 'اطراف' پہلا رسالہ جو اخبار فروشوں کے مسائل اجاگر کر رہا ہے

جواب: محمود شام صاحب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کا انٹرویو شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ میرے اس انٹرویو سے تمام اخبار فروشوں کی حوصلہ افزائی ہوگی پہلی مرتبہ کسی بھی میگزین ماہنامہ اطراف میں اخبار فروشوں کے مسائل کو اجاگر کیا جا رہا ہے اور اخباری ہاکر کا تفصیلی انٹرویو شائع کیا جا رہا ہے۔ محمود شام صاحب صحافت کی دنیا کا بڑا نام ہے صحافت کے لیے آپ کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ ماہنامہ 'اطراف' ایک مکمل دلچسپ معلوماتی میگزین ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ماہنامہ 'اطراف' انشاء اللہ حیدرآباد میں بھی کامیاب میگزین ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ماہنامہ 'اطراف' کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے آمین۔ ۞

”پاکستان کی مختلف زبانوں پر عنقریب ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جارہا ہے۔ سب سے پہلے پشاور کی ’ہندکو‘۔ پر ایک انتہائی اہم تجزیاتی تحریر ملاحظہ کریں جو ماہر درس و تدریس ڈاکٹر محمد عادل کی تحقیق اور تخلیق کا مظہر ہے۔ اس کے لیے ہم ناصر علی سید صاحب کے بھی ممنون ہیں کہ یہ پُر مغز مضمون ان کے توسط سے میسر آیا ہے۔“

# ہندکو خیبر پختونخوا۔ پنجاب اور سندھ میں بھی

☆ڈاکٹر محمد عادل کی خصوصی تحریر

انسان کی عقل، دانش اور شعور کا اظہار زبان کا محتاج ہے۔ انسان کے خیالات کا دوسرے انسانوں تک ترسیل کا ذریعہ زبان ہے۔ انسان جہاں رہتا ہے وہاں اس کے ساتھ کچھ رسوم، روایات اور رواج پروان چڑھتے ہیں۔ جنہیں ہم من حیث المجموعہ ثقافت کا نام دیتے ہیں۔ ثقافت کی ترویج اور پھیلاؤ میں زبان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ تحریر کی صورت میں اور سینہ بہ سینہ یاداشتوں کے

**گل ارباب کا ہندکو سفر نامہ اکادمی ادبیات سے انعام یافتہ**

ذریعے ثقافت اور تاریخ کو محفوظ کیا جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں زبان اپنی اولین اہمیت کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو زبان نہ صرف ثقافتی رنگوں میں ایک رنگ ہے بلکہ ثقافت کی نگہبان بھی ہے۔ زبانوں کی اہمیت اور ان کی بقا کی اہمیت ساری دنیا مانتی ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ’’ہندکو‘‘ ہے۔ فی زمانہ یہ صوبہ خیبر پختونخواہ میں پشاور، ڈی آئی خان، کوہاٹ، ہزارہ، اکوڑہ خٹک، نوشہرہ، پبی اور ملحقہ علاقہ جات اور مردان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب اور سندھ کے کچھ علاقوں میں ہندکو مستعمل ہے اس کے علاوہ کشمیر میں بھی ہندکو کا ہی ایک خوبصورت لہجہ ’پہاڑی‘ مادری زبان کے طور پر جگمگا رہا ہے۔ کوئی بھی زبان نہ صرف ثقافت کا ایک حصہ یا بخرہ ہوتی ہے بلکہ یہ ثقافت کی نگہبان اور محافظ بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح ’’ہندکو‘ زبان بھی گندھارا تہذیب و تمدن کی نگہبان اور گندھاروی تہذیب کے خوبصورت رنگوں میں گندھی ہوئی ہے۔

صدیوں سے شہرِ پشاور ہندکو زبان کا مسکن رہا ہے اور ہندکو زبان و ثقافت پشاور میں پھلی پھولی ہے۔ ہندکو زبان و ادب کے فروغ کے لئے پشاور کی حد تک ہر دور میں کئی ایک ادبی اور ثقافتی تنظمیں قائم ہوئیں اور اپہنے اپنے حصے کا کام احسن طریقہ سے کیا پھر یہ 1993 کا سال تھا جب کچھ دل سوز نوجوانوں نے اپنی ماں بولی ہندکو زبان و ثقافت کی ترقی و ترویج کی غرض سے " گندھارا ہندکو بورڈ" قائم کیا۔ گندھارا ہندکو بورڈ نہ صرف صوبائی اور قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ہندکو زبان، ادب و ثقافت کی خدمات انجام دینے میں پیش پیش ہے۔ 2015 میں گندھارا ہندکو بورڈ پشاور نے حکومت خیبر پختونخوا کے ساتھ مل کر پبلک۔ پرائیویٹ پارٹنر شپ کے طور پر گندھارا ہندکو اکیڈمی پشاور کی بنیاد رکھی۔ گندھارا ہندکو اکیڈمی نے اپنے آغاز سے ہی ہندکو زبان، ادب و ثقافت کی ترویج کے لئے کئی قابل عمل اقدامات کئے یوں بھی اکیڈمی کے اغراض و مقاصد میں ہندکو زبان و ثقافت کے سلسلے میں تحقیق و ترویج کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ گندھارا ہندکوا کیڈمی کے تحت کتب و رسائل کے اشاعتی سلسلے نے ہندکو ادب کو کئی نئی جہتوں سے روشناس کروایا ہے۔

**2015 میں گندھارا ہندکو بورڈ سرکاری اور نجی شعبے کے تعاون سے**

اس اشاعتی نظام کے تحت بالخصوص ہندکو زبان اور بالعموم ملک بھر کی دوسری کئی زبانوں (اردو، پشتو، پنجابی، سندھی، کھوار، کوہستانی، سرائکی، براہوی اور گوجری وغیرہ) کے علاوہ انگریزی زبان میں ساڑھے پانچ سو (550) کتب اور درجنوں جرائد شائع کئے جا چکے ہیں۔ ان کتب میں لسانی تحقیقی کتب، ادبی (نثری و منظوم)، مذہبی، تراجم اور دیگر کئی اصناف شامل ہیں، کسی زبان کی لغت کی موجودگی اس زبان کے پراثر اور مضبوط ہونے کا بین ثبوت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں پہلے بین الاقوامی شہرت یافتہ لسانی محقق ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان کی 25000 الفاظ پر مشتمل ہندکو۔ اردو لغت شائع کی گئی۔ اس کے بعد دو جلدوں پر مشتمل ایک نئی لغت منظر عام پر آئی جس میں لگ بھگ ایک لاکھ الفاظ شامل ہیں۔ لغت میں اضافے کا سلسلہ جاری ہے اور اس میں متروک الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندکو زبان کے

ڈاکٹر محمد عادل پشاور سے تعلق رکھنے والے ایک ماہرِ درس وتدریس اور محقق ہندکووان ہیں۔آپ کا تعلق پشاور کے اعوان قبیلے سے ہے۔ گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری سکول نمبر 1 سٹی سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج پشاور سے کمپیوٹر سائنسز میں بی ایس سی کے بعد آپ نے یونیورسٹی آف پشاور سے ماسٹرز کیا اور پھر اقراء نیشنل یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنسز کے شعبہ میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔ آپ گزشتہ اٹھارہ برس سے کمپیوٹر سائنسز کے شعبہ میں درس وتدریس وابستہ ہیں۔

آپ ایک ٹھیٹھ پشاوری ہیں اور اپنی ماں بولی ہندکو سے دلی محبت اور جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ہندکو زبان وادب سے آپ کو بہت دل چسپی ہے۔اپنی مادری زبان سے محبت اور اس کی خدمت کے جذبے کے تحت ہی آپ نے گندھارا ہندکو اکیڈمی پشاور کے تعاون سے جدید ٹیکنالوجیز کو ہندکو زبان کی ترقی کے لئے استعمال میں لانے کی غرض سے کچھ منصوبوں کا آغاز کیا اور یوں ہندکو زبان وادب کو پہلی مرتبہ ڈیجیٹائز کرنے کا تاریخی اعزاز حاصل کیا۔ دورِ حاضر میں موبائل اور ایپس کے بڑھتے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے آپ نے متعدد اینڈرائڈ ایپس ڈیزائن کیں جن میں ’’ہندکو مہتلاں اینڈرائیڈ ایپ‘‘، ’’کڈز ہندکو لرننگ اینڈرائیڈ ایپ‘‘، ’’ہندکو۔اردو لغت اینڈرائڈ ایپ‘‘، ’’گنجینۂ سائیں اینڈرائڈ ایپ‘‘ اور ’’موضوعاتِ قرآن اینڈرائڈ ایپ‘‘ شامل ہیں۔

آپ لگ بھگ دو درجن سے زائد ہندکو، اردو اور انگریزی کتب کی پروفنگ بھی کر چکے ہیں۔تینوں زبانوں یعنی ہندکو، اردو اور انگریزی میں متعدد ڈاکومینٹریز بھی لکھ چکے ہیں اور اس کے علاوہ ہندکو اور اردو میں شاعری بھی کرتے ہیں۔آپ کے لکھے ہندکو گیت پشاور کے معروف گلوکار گا چکے ہیں۔

فلم بینی اور موسیقی سے شغف رکھتے ہیں اور فلم میکنگ کی باریکیوں پر نظر رکھتے ہیں۔اس سلسلے میں آپ متعدد فلمی تبصرے اور دیگر تحاریر کو صفحہ قرطاس کی زینت بنا چکے ہیں۔اردو زبان میں فلمی تبصروں کے مقابلے میں تین مرتبہ لگاتار پہلی پوزیشن حاصل کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد عادل ہندکو اور اردو زبان میں کالم نگاری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری سے بھی شغف رکھتے ہیں۔آپ تراجم کی اہمیت اور افادیت سے خوب واقف ہیں اس لئے بین الاقوامی ادب کو ہندکو اور ہندکو ادب کو بیرونی دنیا سے متعارف کروانے کی غرض سے مختلف کتابوں کے ترجمے انگریزی سے ہندکو اور ہندکو سے انگریزی میں کر رہے ہیں۔

---

مستعمل اور بھولے بسرے محاوروں کو بھی شامل کیا جا رہا ہے۔یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ’’ہندکو۔پشتو مترادف الفاظ‘‘ نامی لغت بھی شائع ہو چکی ہے جس میں تقریباً دس ہزار الفاظ شامل ہیں۔ ’’ہندکو مہتلاں‘‘ نامی ایک تحقیقی کتاب ہے جو کہ ہندکو زبان کے 2200 محاوروں پر مشتمل ہے۔ 2018 میں ہندکو زبان میں قرآن پاک کا منظوم ترجمہ شائع کیا گیا۔یہ ترجمہ ایبٹ آباد، ہزارہ سے تعلق رکھنے والے مرحوم عبدالغفور ملک نے کیا۔اگر تراجم کی ہی بات کی جائے تو راقم انگریزی زبان کے کلاسک ناول ڈیوڈ کاپر فیلڈ کا ترجمہ و تلخیص کر چکا ہے جو کہ اشاعتی مراحل میں ہے اس کے علاوہ پروفیسر ملک ناصر داوٗد پاؤلو کوہیلو کے مشہورِ زمانہ ناول الکیمسٹ کا ہندکو ترجمہ سپردِ قلم کر چکے ہیں۔

ہندکو زبان میں شائع ہونے والی کتب کو نہ صرف عوامی مقبولیت حاصل ہوتی ہے بلکہ انہیں ملک بھر کے نامور اور مستند ادارے بھی سراہتے رہتے ہیں جس کا ادراک ہمیں ان معتبر اداروں کی جانب سے ان کتب کو ملنے والے اعزازات اور ایوارڈز سے ہوتا ہے۔

گندھارا ہندکو اکیڈمی پشاور سے شائع شدہ کتب میں سے بیشتر کتب کئی ایوارڈز اپنے نام کر چکی ہیں، مثال کے طور پر محترمہ گُل ارباب کے لکھے ہندکو سفرنامہ "تتلی، تریل تے تریمت" کو اکادمی ادبیات پاکستان سے ایوارڈ اور نقد انعام ملنے کے ساتھ ساتھ پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے بھی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروفیسر ملک ناصر داود کی "ہندکو لوک کہانڑیاں" کو اباسین آرٹس کونسل کی طرف سے 2021 کے لئے رضا ہمدانی ایوارڈ سے نوازا گیا۔محترمہ فصیحہ ضیاء کی سیرت نبوی ﷺ پر ہندکو کتاب "خاتم النبیین" کو رائٹرز گلڈ کی طرف سے ایوارڈ دیا گیا۔ پروفیسر حسام حر کے ہندکو نعتیہ وحمدیہ شعری مجموعے "پنج قصیدے" کو پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے آغا محمد جوش ایوارڈ دیا گیا۔ سکندر حیات سکندر کے ہندکو شعری مجموعے "پھلکیھے چھاواں دے" کو اکیڈمی آف لیٹرز پاکستان کی جانب سے قومی ادبی ایوارڈ عطا کیا گیا۔ اسی طرح اکیڈمی آف لیٹرز کی

> **ہندکو میں انتہائی اعلیٰ معیاری تحقیقی تخلیقی کتب کی اشاعت**

جانب سے مرحوم نذیر بھٹی کے ہندکو ناول "شامِ الم"، سعید گیلانی کے ہندکو گیتوں کے مجموعے "پیپل وترے"، حسام حر کے ہندکو نعتیہ مجموعہ "حسنت جمیع خصالہ" اور آفتاب اقبال بانو کے ہندکو افسانوں کے مجموعے "پتھر دا جگر" بہترین کتب ایوارڈز کے ساتھ ساتھ نقد انعام بھی حاصل کر چکی ہیں۔اباسین آرٹس کونسل کی جانب سے شامِ الم، میرا شہرِ دلبر، سوچاں دی مندری، پھل پروتے، پھل کیکراں دے، ریگِ رواں، اور میری ہندکو کو انعامات وایوارڈز سے نوازا گیا۔ پاکستان رائٹرزِ گلڈ نے مرحوم ش شوکت کی کتاب "عین شین قاف" کو ایوارڈ سے نوازا۔اس کے علاوہ قومی سیرت ایوارڈز میں پروفیسر ملک ناصر داود کی "غزواتِ نبوی" کو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ہندکو زبان میں نہ صرف معیاری ادبی، ثقافتی، تاریخی و تحقیقی کتب تخلیق کی جا رہی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سہ ماہی اور شش ماہی بنیادوں پر کئی تحقیقی وادبی مجلوں کا اجراء بھی کیا جاتا ہے۔جن میں سے کچھ کا ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

ہندکو تحقیقی جریدے "ہندکو دی عدالت" اور "ہند آریائی قوس و قزح"

خواتین کے لئے ہندکو رسالہ "فاطمہ" (اس رسالے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں تمام تخلیقات ہندکووان خواتین کی ہی ہوتی ہیں)۔

بچوں کے لئے ہندکو میگزین "تارے"

ہزارہ کے لئے "سرگی دا تارا"

ہندکو ادبی شش ماہی "ہندکو ادب"

انگریزی زبان میں تحقیقی مقالوں پر مبنی

Pakistan Journal of Languages

سرائکی مُجلہ "گول رنگ"۔کھوار زبان میں ششماہی رسالہ "کھوار" اور کوہاٹ کے ہندکووان ادیبوں کے لئے مخصوص جریدہ "کوتل رنگ" وغیرہ شامل ہیں۔

خطہ پشاور کے باسی ہندکووان ہندکو زبان سے دلی محبت کرتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ اپنی مادری زبان میں لکھنے سے ہی ان کی ادبی و ثقافتی جڑیں مضبوط ہو سکتی ہیں اور ہندکو میں لکھی تخلیقات کو پڑھنے والے ان تحریروں میں اپنا پن محسوس کرتے ہیں۔ مجھے یہ اعتراف بھی کرنے دیں کہ ماضی میں ہندکو زبان وادب کی کتب کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی گئی اور ہزاروں سال قدیم زبان میں 1970 کی دہائی سے پہلے تک کتابوں کی باقاعدہ اشاعت کا کوئی سراغ نہیں ملتا البتہ کم کم انفرادی سطح پر اور زیادہ تر ہندکو اکیڈمی کے تحت گزشتہ چند برسوں میں ہی پانچ سو سے زائد کتب کی اشاعت و مقبولیت اس بات کی غماز ہے کہ ہندکووان ایک پڑھا لکھے اور

> **ہندکووان۔ کتاب کی محبت سے سرشار ہیں**

مہذب معاشرے میں سانس لے رہے ہیں، جو اپنی زبان اور شعر و ادب پر فخر کرتے ہیں جو کتابوں سے محبت کرتے ہیں اور لوگ بھلے سے اس صدی کو کتابوں سے عشق کی آخری صدی قرار دیتے رہیں مگر ہندکووان اس کلیہ سے اس لئے متفق نہیں ہیں کہ سر دست تو وہ کتاب سے محبت کی اولین سرشاریوں کی رم جھم میں بھیگنے کا لطف لے رہے ہیں بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ مرزا یاس یگانہ نے کہا ہے نا۔

لذت زندگی مبارک باد
کل کی کیا فکر ہرچہ بادا باد

❀❀❀

# حیدرآباد میں پکوان سینٹروں کی مقبولیت

”حیدرآباد میں 'اطراف' کے بیورو چیف پروفیسر شاداب احمد صدیقی۔ حیدرآباد کا گشت کرتے رہتے ہیں۔ دھن یہ ہے کہ 'اطراف' کے قارئین کو اس شہر کی زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کریں۔ تاکہ آپ میں سے کسی کا حیدرآباد آنا ہو تو آپ کو معلوم ہو کہ کونسا کھانا کہاں ملتا ہے۔ کہاں ٹھہرا جائے۔ کن قابل دید مقامات کی سیر کی جائے۔ ابھی آپ شاداب احمد صدیقی کے ساتھ فاسٹ فوڈ اور روایتی کھانوں کے مراکز کی سیر کو چلیں۔ پھر فیصلہ کریں۔ کوئی کھانا صحت کے لیے بہتر ہے۔ کونسا مضر۔“

# حیدرآباد۔ بریانی کے 11۔ مچھلی کے 5۔ نہاری کے 6۔ فاسٹ فوڈ کے 9 مراکز

تحریر: پروفیسر شاداب احمد صدیقی
بیورو چیف حیدرآباد

حیدرآباد اپنی قدیم تہذیب اور ثقافت کے باعث جانا جاتا ہے، اس کے پکوان بھی ذائقے کے اعتبار سے منفرد نوعیت کے ہیں۔ ان میں سے چند پکوان ایسے جو حیدرآباد کے شہری، اندرون سندھ اور کراچی کے شہری انتہائی ذوق وشوق سے کھاتے ہیں۔ تیزی سے بدلتی دنیا میں فاسٹ فوڈ کی مقبولیت یورپ اور امریکہ کے ساتھ دنیا بھر میں پھیل گئی ہے۔ خاص طور سے نوجوانوں میں فاسٹ فوڈ پسندیدہ غذا بن گئی ہے۔ آج کل ریسٹورنٹ میں کھانا کھانا فیشن بن گیا ہے۔ ہمارے نوجوان اپنے دوستوں کے ساتھ فاسٹ فوڈ کھا کر نہ صرف انجوائے کرتے ہیں بلکہ تصاویر بھی سوشل میڈیا، فیس بک، واٹس ایپ، انسٹاگرام پر اپ لوڈ کر کے دیگر نوجوانوں کو فاسٹ فوڈ کھانے پر اُکساتے ہیں۔ دوستوں اور احباب کے ملنے پر خوش ہوتے ہیں۔ اب ان نوجوانوں میں اسٹیٹس سمبل بن گیا ہے۔ اپنے دوستوں کو ٹریٹ دینا ہو، سالگرہ کی تقریب کا اہتمام ہو یا کوئی بھی تہوار عیدالفطر یا بقرعید، تو حیدرآباد کے شہری خاص طور پر نوجوان طبقہ فاسٹ فوڈ کو ترجیح دیتے ہیں اور اسے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک فاسٹ فوڈ کا ذائقہ منفرد ہوتا ہے۔ فری ہوم ڈلیوری کی وجہ سے بھی نوجوانوں میں فاسٹ فوڈ کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ خاص طور پر فوڈ پانڈا اور دیگر فوڈ سپلائی کی وجہ سے حیدرآباد کے شہری اور نوجوان طبقہ اپنے احباب اور دوستوں کی دعوت گھر بیٹھے ہیں کر لیتے ہیں۔ حیدرآباد کے شہری اور نوجوانوں کا ریسٹورنٹ پر بھی بہت رش نظر آتا ہے۔ پیزا، بریانی، نہاری، مچھلی، بار بی کیو حیدرآباد کے شہریوں کی مرغوب غذا ہے۔ صبح کے وقت حلوہ پوری کا ناشتہ معمول بن گیا ہے۔ اس سے غیر صحت مندانہ عادت کو فروغ مل رہا ہے۔ اس کے بڑھتے استعمال نے سماجی و معاشرتی زندگی کو مکمل تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ صبح کا ناشتا اور رات کا کھانا تاخیر سے کھانے کے باعث نوجوان نسل کی سماجی زندگی اب گھر اور خاندان کے افراد کی بجائے ہوٹلوں تک محدود ہوگئی ہے۔ حیدرآباد میں آج ہر طرف برگر پیزا ہاؤس نظر آتے ہیں۔ ان کھانوں کی خوشبو نوجوانوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ حیدرآباد میں چائے کے پیالہ ہوٹلوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں نوجوانوں کی بڑی تعداد دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتے ہیں اور رات دیر تک یہاں بیٹھتے ہیں فاسٹ فوڈ

## عیدالفطر۔ یا عیدالاضحیٰ۔ نوجوان فاسٹ فوڈ کے دلدادہ

اور ہوٹلوں کے غیر معیاری کھانوں سے موٹاپے اور دیگر بیماریوں میں نوجوان نسل مبتلا ہو رہی ہے۔ اگر اپنے آپ کو اسمارٹ دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے کھانا پینے کی عادات پر سختی سے کنٹرول کریں۔ فاسٹ فوڈ سے گریز کریں چند منٹوں کے آرام اور لذت کی خاطر صحت پر سمجھوتہ کرنا عقل مندی نہیں۔ طبی ماہرین بازار کے کھانوں سے پرہیز کا مشورہ دیتے ہیں، کیونکہ ان میں کیلوریز کا تناسب خاصا زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارے نوجوان نسل کولڈ ڈرنک کو دودھ اور برگر کو روٹی پر فوقیت

## پزا۔ بریانی۔ نہاری۔ مچھلی۔ بار بی کیو۔ پسندیدہ

دیتے ہیں۔ فاسٹ فوڈ کلچر ہمارے نوجوانوں کی صحت کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے۔ حیدرآباد میں ریسٹورنٹ کا کاروبار نفع بخش ہے اور ہر علاقہ محلہ میں کھانوں کے ہوٹل نظر آئیں گے حیدرآباد شہر کے جس ہوٹل

، مکان اور ٹھیلے پر دیکھیں گاہکوں کا رش ہی نظر آئے گا۔ شہر میں فاسٹ فوڈ کے نام پر ملنے والے چکن اور بیف برگرز، بن کباب، فرنچ فرائز، حلیم، چنا چاٹ، رولز اور دیگر اشیا شامل ہیں اکثر اوقات دفتروں اور دیگر اداروں میں کام کرنے والے افراد لنچ ٹائم میں بھی اسی طرح کے کھانے کھانا پسند کرتے ہیں۔ شہری حفظان صحت کے اصولوں کے خلاف تیار کئے گئے ان کھانوں کے مضر اثرات سے بالکل ناواقف ہیں۔ بازار کے کھانوں میں مضر صحت مصالحہ، غیر معیاری تیل و گھی، گوشت کو جلد گلانے کے لیے مختلف کیمیائی اجزاء انسانی صحت کو تباہ کر دیتے ہیں کیونکہ یہ چیزیں معیاری چیزوں سے کہیں سستے داموں مل جاتی ہیں۔ جبکہ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ ان کھانوں کو جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ اگر شہری ان اشیاء کی بناوٹ دیکھ لیں تو ان کا دل لرز جائے کہ کسی گندگی سے ان کو تیار کیا جاتا ہے۔ مشہور کہاوت ہے کہ جان ہے تو جہان ہے ورنہ دنیا ویران ہے، یعنی زندگی کے ہر پہلو میں کامیابی آپ کی اچھی جان صحت سے مشروط ہے۔ صحت مند انسان خوشگوار زندگی گزار سکتا ہے۔ بعض اوقات شہری وقت کی بچت کی وجہ سے بھی فاسٹ فوڈ خریدنا بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ایک ایسا کھانا ہے جو آپ راستے سے خرید کر کھاتے ہوئے اپنی منزل کی طرف چل پڑتے ہیں۔ کم بجٹ اور کم غذائیت والے اس کھانے کو ہر عمر کے لوگ پسند کرتے ہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ روائتی پکوان اب رفتہ رفتہ دم توڑتے جارہے ہیں۔ حیدرآباد میں سوئی گیس کا بحران شدت اختیار کر گیا ہے۔ شہری کھانا ہوٹلوں سے لینے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ روٹی، سالن خرید کر کھانا پڑ رہا ہے۔ ہوٹل مالکان نے بھی عوام کو انتظامی عدم دلچسپی کے باعث لوٹنا شروع کر دیا اور غیر معیاری اشیاء کا استعمال کر رہے ہیں۔ سوئی گیس کی غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ کے باعث گھروں میں کھانے کی روٹین بری طرح متاثر ہو چکی ہے۔ میں آپ کو حیدرآباد کے مشہور ریسٹورنٹس اور پکوانوں کے بارے میں بتاؤں گا۔

## حیدرآباد کی مشہور بریانی

حامد بریانی لطیف آباد نمبر 8 صدیق پلاز۔ حیدرآباد
الفجر بریانی لطیف آباد نمبر 7 حیدرآباد
اکرم بریانی لطیف آباد نمبر 11 حیدرآباد
برگر بریانی لطیف آباد نمبر 11 حیدرآباد
العزیز بریانی لطیف آباد نمبر 8 شاہین آرکیڈ
فیصل بریانی لطیف آباد نمبر 11
ناصر بریانی، لطیف آباد نمبر 8
شریف بریانی، وینس پلازہ حیدرآباد
شبیر بریانی، لجپت روڈ حیدرآباد

**ڈاکٹروں کی خبرداری کے باوجود فاسٹ فوڈ کا استعمال بڑھ رہا ہے**

سبحان اللہ بریانی اسٹیشن روڈ حیدرآباد
حذیفہ بریانی کارنر، آفندی ٹاؤن حیدرآباد

## فش ریسٹورنٹس

مقیم فش پوائنٹ ٹاور مارکیٹ میانی روڈ حیدرآباد
نعیم فش پوائنٹ چھوٹکی گٹی حیدرآباد
اکبر فش پوائنٹ فقیر کا پڑ حیدرآباد
عبداللہ فش رسالہ روڈ حیدرآباد
بریز فش پوائنٹ آٹو بھان روڈ

## نہاری

دہلی نہاری گاڑی کھاتہ حیدرآباد

**ناشتہ بھی صبح سویرے ریستورانوں پر ایک فیشن**

حاجی مزہ نہاری تکونی مسجد ہیرآباد اللہ والا چوک
اقبال حیدری ریسٹورنٹ رسالہ روڈ گول بلڈنگ حیدرآباد
المکہ نہاری یونٹ نمبر 7 لطیف آباد
منان کی نہاری یونٹ نمبر 7 لطیف آباد
قلندری نہاری نزد سیکنڈری بورڈ لطیف آباد نمبر 6
آٹو بھان روڈ پر بار بی کیو اینڈ فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ
میکڈونلڈ... دیسی ہٹ... حویلی... روئل تاج ہوٹل...
PK ریسٹورنٹ... ریدان ریسٹورنٹ، ہاؤس آف مندی
ڈومینوز پیزا... تندوری گرل... الرحیم ریسٹورنٹ لطیف آباد نمبر 2
روف ٹوپ ریسٹورنٹ

اس کے علاوہ انڈس ہوٹل ٹھنڈی سڑک، کے ایف سی ٹھنڈی سڑک، شالیمار ریسونٹ ٹھنڈی سڑک، جیم خانہ حیدرآباد ٹھنڈی سڑک، شمع تکہ لطیف آباد، شنواری ہوٹل نمبر 7 لطیف آباد، بروہی کڑاہی نمبر 6 لطیف آباد، اعجاز فرائی نمبر 7 لطیف آباد، عمر خان ہوٹل نمبر 7 لطیف آباد، حیدرآباد کا دلہن پراٹھا بے حد مشہور ہیں۔ کوزی حلیم تلک چاڑی، راوی حلیم فوجداری روڈ نزد سینٹ بوناوینچر اسکول، شبیر حلیم رسالہ روڈ وغیرہ شامل ہیں۔ اب تو حیدرآباد میں فوڈ اسٹریٹس نے بھی گھر سے باہر کھانے والوں کی حوصلہ افزائی کی اور صبح کا ناشتہ حلوہ پوری باہر ہوٹل پر جا کر کھانا فیشن بن گیا ہے۔ آج کی نئی نسل گھر کے کھانوں کی نسبت بازاری کھانوں کو بہت ترجیح دیتی ہے جس میں اب خواتین بھی شامل ہو گئی ہیں۔ باہر کے کھانوں میں مرچ مصالحوں کی زیادتی کی وجہ سے کھانے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ شاید یہی چیز خواتین اور حضرات کو ان کھانوں پر اکساتی ہے۔ اس مہنگائی کے دور میں بھی ہوٹلوں پر بے پناہ رش رہتا ہے۔ تمام جانی مسائل سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ باہر کے کھانوں کی بجائے صحت مند غذاؤں کے استعمال کو ترجیح دی جائے اور اپنی صحت کے ساتھ دشمنی نہ کی جائے۔ دالیں اور سبزیاں غذائیت سے بھرپور ہوتی ہیں انہیں اپنی زندگی میں لازمی شامل کریں۔ زندگی اللہ تعالیٰ کی خوبصورت نعمت ہے اس کی حفاظت کیجئے۔

پاکستانی ٹی وی ڈرامہ صنعت بھی اس وقت ایک طرف اربوں روپے میں کھیل رہی ہے۔ دوسری طرف نسلوں کی نسلیں خراب کررہی ہے۔ سب اخبارات کے اپنے تفریحی چینل ہیں۔ اس لیے کسی ورق پر تنقید نہیں ہوتی ہے۔ 'اطراف' یہ سماجی ذمہ داری بھی نبھانے کا آغاز کررہا ہے۔ کسی ایک قلمکار سے نہیں۔ سب ناظرین کو دعوت دی جائے گی کہ وہ ڈرامے دیکھیں اور اپنا درد بیان کریں ڈرامہ نگاروں۔ ڈرامہ سازوں اور چینلوں کو بھی اپنی رائے کا حق دیا جائے گا۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

# 'جنٹلمین' کراچی کے غنڈے اتنے پست معیار کے نہیں

**تحریر: سلیم عمران**

پاکستانی ڈراموں کی یکسانیت نے ناظرین کے ایک بڑے طبقے کو ان ڈراموں سے دور کردیا تھا اور اسی دوری کا جائزہ لینے کے بعد ایک نیا چینل

> **خلیل الرحمن قمر پر ڈراما سیریلز کے دروازے کیوں بند ہو رہے ہیں**

منظر عام پر آیا جس کے بارے میں اس نوع کی خبریں ایک مدت سے مل رہی تھیں کہ ایک ایسا چینل آنے والا ہے جس کے پیچھے ہاتھ تو وردی والو ں کا ہے (بقول عائشہ صدیقہ پرائیویٹ سیکٹر کے پاس کرنے کو بچا کیا ہے )لیکن تشہیری مہم یہ کہہ کر چلائی جارہی تھی کہ یہ ایک ایسا فیملی چینل ہوگا جسے دیکھ کر آپ کو پی ٹی وی کا سنہرا دور یاد آنے لگے گا۔ اسی دور کے ڈراموں کے عہد کو واپس لانے کوشش کی جائے گی جب ڈرامے دیکھنے کے لئے

> **پاکستانی ڈرامہ 20 سال سے ایک ہی جگہ کھڑا ہے**

شہروں کی سڑکیں ویران ہوجایا کرتی تھیں۔ ان غلغلوں کے درمیان جس بھی ٹی وی ڈراما لکھنے والے سے بات ہوتی تو وہ یہی بتایا کرتا کہ ان سے انتہائی مختلف کہانی کا تقاضا کیا جارہا ہے۔ (مختلف کہانی تو عہد حاضر میں ہم جنس پرستی کے کرداروں پر مشتمل سمجھی جاتی ہے) وضاحت مانگنے پر کہا جاتا کہ ایسی کہانی جو موجودہ پرائیویٹ سیکٹر کے چینلوں پر چلنے والے ڈراموں سے مختلف ہو۔ اب یہ کوئی نہیں بتاتا کہ مختلف کیا ہوتا ہے؟ چنانچہ سیانوں نے سوچا انتظار کرلیتے ہیں کہ چینل لانچ ہوگا تو پتا چل ہی جائے گا کہ مختلف کیا ہوتا ہے۔ (ویسے بھی جس طرح ہر ایک کی پسند مختلف ہوسکتی ہے اسی طرح ہر ایک کا "مختلف" بھی الگ ہوسکتا ہے۔) چینل سوشل میڈیا کی غیر معمولی تشہیر کے ساتھ منظر عام پر آیا جو ڈرامے پیش کئے گئے ان کے نام ہیں۔ جندو، ونڈر لینڈ، کابلی پلاؤ، ہنی مون، تمہارے حسن کے نام، ایک سو ایک طلاقیں، ورکنگ وہ مین، نوروزم ایڈیٹ، جیون نگر، 22 قدم۔ ان ڈراموں میں پی ٹی وی والا عہد تلاش کرنے والوں نے دن رات ایک کردیے مگر ایک عہد تو کجا ایک دن بھی ایسا نہیں آیا جس کا پی ٹی

## اوٹی ٹی کیا ہے؟

OTT۔ اوٹی ٹی "Over-the-Top"۔ انٹرنیٹ کے ذریعے وڈیو کہانیاں فراہم کرنے کی ٹیکنالوجی ہے۔ یہ بلا معاوضہ بھی میسر ہوتی ہے۔ اور کچھ ادائیگی سے بھی۔ اس سے پیسے بھی کمائے جارہے ہیں۔ بھارت اور اکثر دوسرے ملکوں میں بے شمار لوگ ڈرامے بنارہے ہیں۔ دکھارہے ہیں۔

وی کے عہد سے ذرا سا بھی تعلق سمجھا جاسکتا ہو۔ مختلف کے نام پر ایسے شاہکار تخلیق پیش کئے گئے کہ انھیں بین الاقوامی مقابلوں میں بھیج کر بھاری بے عزتی کمائی جاسکتی تھی۔ وہ بھی مفت میں۔ سوائے "کابلی پلاؤ"

> **اب کسی ڈرامے کے لیے سڑک ویران نہیں ہوتی**

کے گرین کے ناظرین کہتے ہیں کہ ان ڈراموں کو آنکھیں بند کرکے دیکھنے سے بھی دل کی دھڑکن کے تیز ہوکر رک جانے کا اندیشہ موجود رہتا تھا۔ چنانچہ گرین کے ارادوں اور مختلف خوابوں کا جلوس اتنی جلدی نکلا کہ آئے بھی وہ اور گئے بھی وہ۔

پھر یوں ہوا کہ گرین کی پالیسی ہی نہیں سارا سیٹ اپ ہی اوپر نیچے ہوگیا۔ لہٰذا اب ایسی خبریں تواتر سے ملنے لگیں کہ مذکورہ چینل نے دوسرے چینلز

> **گرین چینل بہت سنتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔**

کے کانٹینٹ اور دیگر محکموں کے افراد کو زیادہ دانہ ڈال کر اپنی چھتری پر بلا کر بٹھانا شروع کردیا ہے۔ کہتے ہیں یہاں بھی بول جیسا سیٹ اپ متعارف کرا گیا ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ پہلے سے چلتے ہوئے

# ٹی وی ڈراما مافیا

ناظرین کی گردن پر سوار چینلوں کے یکسانیت والے ڈراموں سے زیادہ بور کردینے والے، بار بار کے دوہرائے ہوئے موضوعات کی دوڑ میں ان سب ہی چینلز کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکلا جائے اور یوں ''مختلف'' کا جنازہ دھوم سے نکالنے کا سامان کیا گیا۔ اس کے بعد آتا ہے ''جنٹلمین''

آپ جانتے ہیں خلیل الرحمن قمر اپنے ڈراموں سے اتنے مقبول نہیں ہوئے جتنے وہ خواتین کے خلاف اپنے نظریات کے پرچار کرنے سے مشہور ہوچکے ہیں۔ ان کے ایسے ہی رجعت پسندانہ خیالات کی وجہ سے ماضی میں جیو ٹی وی ان سے چار ڈراما سیریلز کے معاہدے کرنے کے بعد ان معاہدوں کو منسوخ کرچکا ہے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں گرین چینل ان کے لئے ایک ایسی پناہ گاہ ثابت ہوا ہے جو کسی بھی ایسے انسان کے لئے غیر نعمت مترقبہ ہے جس کے اوپر سب ہی نامی گرامی چینلز کے دروازے بند ہوچکے ہوں۔ ساتھ ہی ہمایوں سعید جن کے لئے وہ تاریخ کا ایک مقبول ڈراما ''میرے پاس تم ہو'' لکھ چکے ہیں (یہ بات وہ تسلیم نہیں کرتے لیکن فلم دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اس ڈرامے کی کہانی (indecent proposal) انگریزی فلم جو 1993 میں ریلیز ہوئی تھی سے اس حد تک ماخوذ ہے کہ اسے چربہ کہانی بھی کہا جاسکتا

## برنس روڈ کے رومیو جیولیٹ کی 32 قسطیں 'برنس روڈ کی نیلوفر' سے بہت پیچھے رہ گئیں

ہے) تاہم ڈرامے کی مقبولیت نے ان کے اوپر لگنے والے تمام الزامات کو جیسے دھو ہی ڈالا۔ البتہ خواتین کے بارے میں ان کے معاندانہ رویوں اور بیانات کی وجہ سے انھیں شدید تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے اور یہ سلسلہ اب تک اس لئے قائم ہے کیونکہ خلیل گاہے گاہے اپنے ان ناپسندیدہ بیانات کا اعادہ کرتے رہتے ہیں۔

ان کے نظریات اور خیالات کے باوجود اگر کسی نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تو وہ ہیں ہمایوں سعید اور ندیم بیگ جو خلیل کے لکھے ہوئے بیشتر ڈراموں کے اداکار اور ہدایت کار ہوتے ہیں۔ خلیل کی لکھی ہوئی کئی فلموں کی ڈائریکشن بھی ندیم بیگ نے ہی انجام دی ہیں، ندیم بیگ ہمایوں سعید کے پروڈکشن ہاؤس سکس سگما اور نیکسٹ لیول میں پائے جاتے ہیں۔

''جنٹلمین'' بمبیا انداز کا ایک ایسا ڈراما ہے جسے کراچی کے تناظر میں پیش کیا جارہا ہے۔ کراچی والے اس ڈرامے پر بے پناہ ناراضگی سے تنقید کررہے ہیں ان کا خیال ہے کہ جس نوعیت کے مکالمے اور جیسے کردار ڈرامے میں دکھائے جارہے ہیں ان کا کراچی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی کراچی میں غنڈے اتنے پست معیار کے ہوتے ہیں۔ ایم کیو ایم کے بارے میں کراچی کے چھوٹے بچوں کو بھی معلوم ہے کہ وہ رنگین پلنگوں پر نہیں بیٹھا کرتے تھے نہ ہی ان کے گلے میں اتنے کنٹھ اور مالائیں ہوا کرتی تھیں۔ پہلا سین اس ڈرامے کا ایسا اوپری اور اوور سین تھا کہ اس کے بعد شاید ہی کسی ناظر کا مزید دیکھنے کو دل مانا ہو۔

دوسرے ایپی سوڈ کے ایک سین میں یمنیٰ زیدی ایک مکالمے میں کہتی ہیں ''سب کے آپسی تعلقات بڑھ جائیں گے مگر غنڈوں کا بال'' بانکا''

نہیں ہوگا۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ اگر ڈراما بھارت کے لئے بنایا تھا تو اسے پاکستان میں چلانے کی کیا ضرورت تھی اگر پاکستان میں چلانا تھا تو پھر اس کی زبان، لہجہ اور تلفظ تو ٹھیک کرلیتے۔ آجکل ان باتوں کو کوئی بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ جو چاہو سو کرو کون پوچھنے والا ہے۔ خلیل الرحمٰن قمر لاہور

## ٹی وی ڈرامے پر پاکستان کی اسلامی سوشل فلموں کا سایہ

میں رہتے ہیں اور اپنا ہر دوسرا بلکہ اکثر ڈرامے کراچی کے پس منظر میں لکھتے ہیں اس مقصد کی خاطر کراچی کے ان علاقوں اور کرداروں کا مشاہدہ کرنا تک ضروری نہیں سمجھتے جو ان کے ڈرامے میں خصوصیت سے پیش کئے گئے ہوتے ہیں۔ اسی لیے جنٹلمین کراچی کے پس منظر میں ہونے کے باوجود ممبئی اور پنجاب کا مشترکہ منظر نامہ معلوم ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں سنجے لیلا

بھنسالی کی ہیرا منڈی پر تو پاکستانیوں نے خوب بھڑاس نکالی جسے دیکھو سنجے لیلا کو فلم میکنگ سکھانے پر لگا ہوا تھا۔ ایسے لوگ اپنی طرف نہیں دیکھتے کہ خود کیا کررہے ہیں۔؟ ایک ناظر نے جسے سنجے کی ہیرا منڈی بے حد پسند آئی کا کہنا تھا کہ جنٹلمین جیسی غیر معیاری پروڈکٹ پر سب کی زبان خاموش ہے۔ تب ہی تو پاکستان میں ڈراموں اور فلموں کا برا حال ہے۔

غالباً یہ پہلا موقع ہے جب خلیل الرحمٰن قمر کے ڈرامے کو ہاُصم حسین نے ڈائریکٹ کیا ہے۔ ویسے تو ندیم بیگ بھی کوئی ایسے غیر معمولی

## او ٹی ٹی ادارے پاکستان میں کیوں قبول نہیں ہیں

ہدایت کار نہیں ہیں۔ لیکن اکثر وہ ہی خلیل کی فلموں اور ڈراموں کی ڈائریکشن دیتے رہے ہیں۔ ہاُصم نے تو جیسے جنٹلمین کے ذریعے خلیل کی پہلے سے موجود مقبولیت کو بھی ٹھکانے لگانے کا اہتمام کردیا ہے۔

پاکستان میں ٹی وی ڈراما انڈسٹری اس کے باجود کامیابیاں سمیٹتی نظر آتی ہے کہ یہاں ٹی وی ڈراما آج تک ساٹھ کی دھائی کی پاکستان کی اسلامی سوشل ڈراما فلم کے اثر سے باہر نہیں نکل سکا۔ جبکہ اس عہد کی فلمیں موجودہ عہد کے ڈراموں سے نہ صرف زیادہ معیاری ہوا کرتی تھیں بلکہ ان کا اثر بھی کہیں زیادہ ہوا کرتا تھا۔ ایسی کئی فلموں کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو نہ صرف غیر معمولی کامیابی سے ہمکنار ہوئیں بلکہ ان فلموں نے پاکستانی سماج پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ جن میں ایس سلیمان کی فلم ''آجکل اور نذر السلام کی فلم آئینہ'' قابل ذکر ہیں۔ موجودہ ڈراما انڈسٹری کی کامیابی کی دو وجوہات ہیں ایک یہ کہ پاکستان کی فلم انڈسٹری پوری طرح نابود ہوچکی ہے۔ اور دوسرے پاکستان میں جانے کونسی مصلحتوں کی وجہ سے او ٹی ٹی اداروں کو رسائی نہیں دی جارہی۔ وگرنہ ہندوستان میں تو انھی اداروں کی سیریز اور سیزنز کا ڈنکا بج رہا ہے۔

برنس روڈ کے رومیو جیولٹ اس عنوان سے اے آر وائی سے ایک ڈراما آرہا ہے۔ جس کا عنوان بھلے ہی شیکشپیئر کے لافانی کرداروں کے ناموں پر رکھا گیا ہے لیکن ہے یہ وہ ہی سوشل فیملی ڈراما۔ جس کے تصور سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ تازہ ایپی سوڈ دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے پاکستانی ڈراما گزشتہ بیس برس سے ایک ہی جگہ کھڑا ہوا ہے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا۔

شیکسپیئر جیسے عظیم اور دنیا کے سب سے بڑے ڈراما نویس کے کرداروں کے نام پر ڈرامے کا عنوان رکھ کر نوجوان ناظرین کو دھوکا دینے کی بھونڈی کوشش ہی کی گئی ہے ورنہ ڈراما تو وہ ہی ہے جو تمام چینلز سے آرہا ہے وہ بھی بیک وقت۔ میاں کے ہاتھوں ستائی ہوئی ایک لڑکی جو ڈرامے کے رومیو حمزہ سہیل (مشہور مزاحیہ اداکار سہیل احمد کے فرزند) کی غالباً بہن ہے۔ اس کا شوہر جب اسے واپس گھر لے جانے کے لئے آتا ہے تو وہ ایک تھپڑ اس کے منھ پر رسید کرتی ہے اور کہتی ہے اب کہو کوئی بات نہیں ہے ایک تھپڑ ہی تو ہے۔ تو میں تمہارے ساتھ ابھی کے ابھی چل پڑوں گی۔ رونے سے زیادہ ہنسی آتی ہے کہ پاکستانی ڈرامے کی حالت بالکل پاکستان کے معاشی اقتصادی حالات جیسی ہے جو یا تو کبھی بدلتے نہیں ہیں۔ یا پھر مزید خراب ہونے کی طرف گامزن رہتے ہیں۔

پریسا صدیقی کے لکھے ہوئے اس ڈرامے کو فجر رضا نے ڈائریکٹ کیا ہے۔ جبکہ اسے بنایا ہے بگ بینگ والوں نے۔ جو فہد مصطفی اور ان کے پارٹنر علی کاظمی کی کمپنی ہے۔ فصیح باری خان کے برنس روڈ کی نیلوفر کے بارے میں اگر آپ میں سے کسی کو یاد ہو تو وہ محض ایک ٹیلی فلم تھی لیکن آپ اس بات سے انکار نہیں کریں گے کہ برنس روڈ کے رومیو جیولیٹ کے بتیس 32 ویں ایپی سوڈ کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ ڈیڑھ گھنٹے کا ''برنس روڈ کی نیلوفر'' اس تیس اور چالیس گھنٹوں کے ڈرامے سے کہیں زیادہ معیاری ڈراما تھا!

اطراف لاؤنج

# پیامِ صبح

ہنستے مسکراتے
**انیق احمد**
صرف اپنوں کے ساتھ

انیق احمد نامور دانشور۔نقاد۔مقبول ترین پروگرام پیام صبح کے نقیب۔سابق وفاقی وزیر برائے مذہبی امور۔ شعروادب کے دلدادہ سے ملئے۔اہل خانہ کے ساتھ کچھ تصاویر۔مذہبی اموراور وسائل کے حوالے سے ان کا پروگرام متوازن اور ہر مسلک میں پسندیدہ۔دین کو سمجھنے میں ہمیشہ معاون۔ادبی دنیا پر بھی انکی گرفت ایسے ہی ہمہ گیر ہے۔

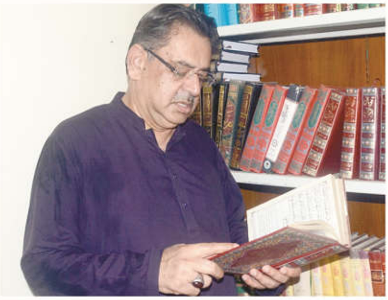

'اطراف' کا ایک مقبول سلسلہ دوبارہ شروع کیا جارہا ہے۔آپ بھی اپنی تصاویر اور تعارف بھیج سکتے ہیں۔0300-8210636

## ایک بڑے سائز کے قالین کی کہانی

ایک بڑے سائز کے قالین کی تصویر فیس بک پر دیکھی۔ 'اطراف' کی قلمی سرپرست جویریہ یاسمین نے بھی واٹس ایپ پر یہ تصویر آویزاں کیں۔ ہم نے ان سے گزارش کی کہ اس قالین کی کہانی سے قارئینِ 'اطراف' کو بھی آگاہ کریں۔ ہم ان کے ممنون ہیں کہ فوراً ہی ہماری فرمائش پوری ہوگئی۔ قالین بافوں کا عزم۔ اللّٰہ تعالیٰ اس صنعت کی وابستگان خاص طور پر افغان کارپٹ کو استقامت اور خوشحالی عطا کرے۔

# 42x72 فٹ سائز۔ 25 سے 30 فنکار

تحریر: جویریہ یاسمین، آزاد کشمیر

قالین بافی کشمیر کا قدیم فن ہے جس سے ہزاروں خاندانوں کا روزگار وابستہ رہا ہے اور کشمیری قالین دنیا بھر میں پسند کیے جاتے تھے

### کشمیر میں قالین باف خاندان۔ شدید معاشی مشکلات سے دوچار

لیکن کشمیر کی سیاسی صورت حال اور حکومتی عدم دلچسپی اور عدم سرپرستی کی وجہ سے یہ کام بہت سمٹ کر رہ گیا ہے اور قالین بافی کی صنعت سے وابستہ خاندان بے روزگاری اور شدید معاشی مشکلات کا شکار ہوگئے ہیں۔

اسی وجہ سے کشمیر کے کچھ اہل درد نے سوچا کہ کشمیر کی اس صنعت کو دوبارہ دنیا کی نظروں میں لانے کے لیے کچھ ایسا کام کیا جائے جس سے اس صنعت کو دوبارہ توانائی ملے۔

چنانچہ 2014 میں کچھ لوگوں نے قالین بافی کے لیے مشہور شاہ قادر اینڈ سنز کے مالک فیاض شاہ سے رابطہ کیا۔ ابتدائی ایک سال تو اس کی تیاری کے لیے سوچ بچار پر لگ گئے ابتدا میں 10 اور 15 فٹ کے قالینوں پر ڈیزائن تیار کیے گئے بالآخر ایک بڑے سائز کے قالین

### نمائش کے لیے درگاہ حضرت بل کے احاطے کا انتخاب

کے لیے ایرانی قالین کاشان کی طرز کا یہ ڈیزائن فائنل ہوا جسے شمالی کشمیر کے علاقہ کرال پور کے ایک گاؤں کنزر وائیلو کے دستکاروں نے تیار کیا۔

2015 میں اس کی تیاری کے لیے حبیب اللّٰہ شیخ کی گھر میں دومنزلہ کارخانہ (لوم) لگایا گیا جسے بٹ اسٹیل انڈسٹری نے تیار کیا بالآخر اس قالین کی تیاری شروع ہوئی جس کی لمبائی 72 فٹ اور چوڑائی 42 فٹ ہے۔ اس قالین کو تیار کرنے کے لیے ایک وقت میں 25 سے 30 فنکاروں نے کام کیا۔ ابتدا میں خیال تھا کہ چار سال میں یہ قالین تیار ہوجائے گا لیکن 2014 کے بدترین سیلاب اور پھر 2019 اور 2020 میں کورونا وبا کے کام کی رفتار کو انتہائی سست کر دیا بہرحال یہ شاہکار 2024 میں تیار ہوگیا۔

جس کی لمبائی 72 فٹ اور چوڑائی 42 فٹ ہے اس کا وزن 1685 کلوگرام ہے جس میں 30 کروڑ Knots استعمال ہوئی ہیں۔ اس قالین کو کھول کر بچھانے اور پھر لپیٹنے میں ایک وقت میں تیس افراد درکار ہیں۔ فیاض شاہ کے مطابق قالین کا میٹیریل انتہائی عمدہ اور معیاری ہے اور اس کو دھونے سے بھی اس کی کوالٹی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ اس قالین کو لوگوں کے سامنے کیسے لایا جائے سو اس کے لیے درگاہ حضرت بل کے وسیع احاطے کا انتخاب کیا گیا۔ جہاں اسے بچھایا گیا تو کشمیر کے علاوہ ہندوستان بھر سے لوگ اسے دیکھنے آئے اور سوشل میڈیا کے ذریعے دنیا بھر میں اس کا چرچا ہونے لگا۔

شاہ قادر اینڈ سنز کا کہنا ہے کہ یہ ایشیا کا سب سے بڑا ہاتھ سے بنا قالین ہے۔

### صنعت کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے بڑے سائز کے قالین کی تیاری

امید کی جارہی ہے کہ اس قالین کی تشہیر سے کشمیر کی قالین بافی کی صنعت کو ایک نئی اٹھان ملے گی اور قالین بافی سے وابستہ خاندانوں کے لیے روزگار کے وافر مواقع پیدا ہوں گے۔

# ’اطراف‘ نے مختصر وقت میں معاشرے میں باوقار مقام حاصل کرلیا

## عورت کے مقام اور حقوق سے متعلق مضامین کا انتخاب ”الجھی زلفیں“ قابل قدر کتاب

## شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی صاحبزادی اور ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کی صدر بیگم سعدیہ راشد کا مکتوب

سعدیہ راشد
SADIA RASHID
*President*
Hamdard Foundation Pakistan

Hamdard Foundation Pakistan
Head Office
16th Floor, Bahria Town Tower, Tariq Road
Karachi, Pakistan.
Phone Office: (+92-21) 38244000, Ext. 1610
e-mail: chairperson@hamdard.com.pk

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حوالہ نمبر: ذ.ت/۲۰۲۴

یکم رمضان المبارک ۱۴۴۵ ہجری

12/مارچ 2024 عیسوی

جناب محترم محمود شام صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ،

میں آپ کی حد درجہ ممنون ہوں کہ آپ میری اس قدر عزت افزائی فرماتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں جتنی بھی تھوڑی بہت خدمت کی توفیق اور صلاحیت ملی ہے، وہ صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا ہے۔ اسی مہربان اور کریم ذات نے آپ کو دلِ دردمند، قلم کے ذریعے اظہار کی بہترین صلاحیتوں، سخت محنت اور مستقل مزاجی جیسے اوصاف سے نوازا ہے۔ اردو صحافت میں آپ کا نام از حد وقعت اور احترام کی علامت ہے۔ آپ کی ادبی اور صحافیانہ خدمات کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس فہرست میں آپ کا جریدہ ”اطراف“ نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ اپنی مختصر سی عمر میں اس جریدے نے قابلِ قدر، بامقصد اور سنجیدہ خدمات انجام دی ہیں اور معاشرے میں باوقار مقام حاصل کرلیا ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ عورت کے مقام اور حقوق سے متعلق ”اطراف“ میں شائع ہونے والی تحریروں کا ایک انتخاب ”الجھی زلفیں“ کے عنوان سے شائع کردیا۔ یہ خصوصی شمارہ وطنِ عزیز میں خواتین سے ہونے والی زیادتیوں اور انہیں درپیش نامساعد حالات کی جانب مؤثر انداز میں متوجہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، یہ پاکستان کی متعدد خواتین کی جدوجہد اور بیش قدر خدمات کے حوالے سے ثابت کرتا ہے کہ ہماری خواتین ناروا حالات کا کس حوصلے اور صبر کے ساتھ مقابلہ کررہی ہیں۔

اس خصوصی شمارے کی ایک کاپی آپ نے ازراہِ عنایت مجھے ارسال فرمائی۔ اس پر میں متشکر ہوں۔ آپ نے اس شمارے میں میرے بارے میں بھی چند کلمات تحریر فرمائے ہیں۔ اس عزت افزائی کے لیے بھی اظہارِ امتنان کے ساتھ ساتھ آپ کے لیے دعاگو ہوں کہ عظیم مقاصد کے لیے آپ کی پُرخلوص جدوجہد میں ربِ کریم اپنی تائید و نصرت عطا فرمائے اور آپ کی مساعی کو شرفِ قبولیت بخشے۔

بہ احترامات زاوار

مخلص

(سعدیہ راشد)

گرامی خدمت جناب محترم محمود شام صاحب
ماہنامہ ”اطراف“ A-262، بلاک 3،
گلشن اقبال، کراچی۔ 0300-8210636

فخرِ پاکستان کرن اشتیاق

# بازوؤں ٹانگوں سے محروم کرن اشتیاق گریجویٹ ہوگئیں

## ’اطراف‘ نے مارچ 2020 میں قارئین سے اس باہمت خاتون کو متعارف کرایا تھا

## فرید کالج ملتان کے اساتذہ بھی لائق صد تحسین

اطراف رپورٹ

افراتفری اور مایوسیوں کے دنوں میں رحیم یار خان سے ملحقہ چک 125 کی کرن اشتیاق نے اپنی بلند ہمتی استقامت سے اہل پاکستان کو ایک لازوال خوشی فراہم کی ہے۔علم سے اس کی لگن لائق صد تحسین ہے کہ اس نے اسکول کی تعلیم مکمل کی ۔ پھر انٹر کیا۔ اور اب ماشاء اللہ وہ گریجویٹ ہوگئی ہیں ۔ ان کے والدین ۔ اساتذہ ۔ بھائی بہنیں سب پر ہمیں فخر ہونا چاہئے ۔ وہ پیدا ہی ہوئی تھیں بازوؤں اور ٹانگوں کے بغیر۔ ان کے والدین کو ڈاکٹروں نے بھی مشورہ دیا تھا کہ اس مسئلے کی پرورش نہ کریں ۔مگر والدین کو اللہ تعالیٰ کے اس گرانقدر تحفے سے محبت تھی ۔ ہمیں پتہ چلا تو ہم نے انہیں مبارکباد دی ۔ اور ان سے ان عظیم اساتذہ کے نام پوچھے خواجہ فرید کالج ملتان سے کرن اشتیاق نے بی ایس انگلش کیا ہے پرنسپل خالد محمود ہیں ۔ شعبے کے سربراہ ارشد بیگ ۔ اساتذہ میں فخر ہیں ۔ رمیش ہیں ۔ شعیب ہیں اور ارشد چوہان ۔ ان تمام اساتذہ کو بھی اپنی اس کوشش پر بہت مسرت ہے ۔ ملاحظہ کیجئے ۔ ان کے پر مسرت چہرے ۔ اور فخر پاکستان کرن اشتیاق کو۔ ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی کرن اشتیاق کو کامیابیاں عطا کرے ۔

# کراچی پورٹ ٹرسٹ اسٹاف کالج میں
# عالمی صورت حال پر سید مشاہد حسین کا خطاب

کراچی پورٹ ٹرسٹ کے چیئرمین سید ین رضا زیدی نے کے پی ٹی اسٹاف کالج میں سینئر۔ صحافی۔ ایڈیٹر۔ دانشور۔ بین الاقوامی انجمنوں کے عہدیدار۔ پاک چین دوستی کے معماروں میں سے ایک سید مشاہد حسین سید کے خطاب کا اہتمام کیا۔ جہاں کراچی پورٹ ٹرسٹ کے تمام اعلیٰ افسران نے بڑے انہماک سے نہ صرف تقریر کو سنا۔ بعد میں بہت ہی حساس موضوعات پر سوالات بھی کیے۔

اس موقع پر انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اینڈ ہسٹاریکل ریسرچ کے زیر اہتمام شائع ہونے والی جناب رمضان بلوچ کی اہم تصنیف 'ایک لاپتہ شہر کا سراغ' کی تقریب پذیرائی کا انعقاد بھی ہوا۔ جس سے ڈاکٹر سید جعفر احمد۔ محمود شام نے بھی خطاب کیا۔ رمضان بلوچ نے چیئرمین کے پی ٹی کا شکریہ ادا کیا کہ کراچی شہر سے متعلقہ اس کتاب کی پذیرائی کا اہتمام کراچی کے ایک اہم ادارے کے پی ٹی کے اعلیٰ افسران کی محفل میں کیا۔ اس موقع کی چند تصاویر۔

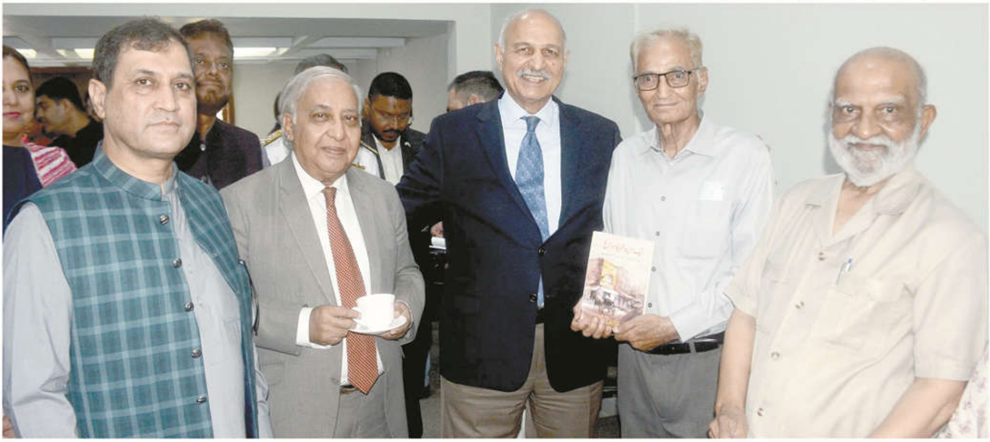

Q & A – Session
• Please Raise your hand.
• Stand up and Introduce Yourself.
• Ask relevant question only
• Please don't ask Question for Question.

## تذکرہ کتابوں کا

خان ظفر افغانی ۔’اطراف‘ کے ’چھٹیاں نمبر‘ کے لیے ان کتابوں کا تذکرہ کررہے ہیں۔ جن میں ملکی اور غیر ملکی سیاحتوں کی رُوداد بہت شگفتہ اور شیریں انداز میں قلمبند کی گئی ہے۔ ’تذکرہ کتابوں کا‘ ’اطراف‘ کا ایک مستقل اور بہت مقبول سلسلہ ہے۔ ماشاء اللہ اچھی اور معیاری کتابیں اتنی تعداد میں موصول ہورہی ہیں کہ اب تذکرے میں کچھ تاخیر بھی ہوجاتی ہے۔ اس کے لیے ہم پیشگی معذرت بھی کرتے ہیں مگر خان ظفر افغانی کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بغور مطالعے کے بعد ہی اس کا تذکرہ عام فہم زبان میں کیا جائے۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

# ’’میں ہوں جہاں گرد‘‘ فرخ سہیل گوئندی کا سفرنامہ

’اطراف‘ کا زیرِنظر شُمارہ جولائی‘ سیر و سیاحت کو خصوصی طور پر اپنا موضوع بنائے ہوئے ہے۔ اس خصوصیت کے پیشِ نظر ہم اس وقت ان کتابوں کو زیرتذکرہ لا رہے ہیں جو سیر و سیاحت کا بیان لیے ہوئے ہیں یہ کتابیں ان کتابوں میں سے چنی گئی ہیں جو شام جی کو خصوصی طور پر ارسال کی جاتی ہیں یا ’اطراف‘ کو تذکرے کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔

’’میں ہوں جہاں گرد‘‘ فرخ سہیل گوئندی کی بھاری بھرکم، دیدہ زیب سرورق سے سجی، 786 صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب ہے جو ایران، ترکی اور بلغاریہ کے طویل سفر کو خود میں سموئے ہوئے ہے۔ یہ داستانِ سفر ہے جو لاہور سے یورپ تک برّی رستوں پر آگے بڑھتے ہوئے ان مقامات، بستیوں، شہروں، ثقافت و تاریخ کی جو ’’جہاں گرد‘‘ کے مشاہدے و تجربے پہ مبنی ہے۔

فرخ سہیل گوئندی نے یہ سفر 1983 میں کیا۔ اس وقت کے ایران، ترکی اور بلغاریہ اب بہت بدلے ہوئے ممالک ہیں۔ آج جو اس داستان سفر کو پڑھے گا تو اسے معلومات کا خزانہ ملے گا، اس وقت کا نظامِ حکومت، سرکاری اہلکاروں کا رویہ، سماجی حالات جاننے کا موقع ملے گا۔ ’’جہاں گرد‘‘ پیرایۂ بیاں نہایت دلچسپ، پُرلطف ہے کہ قاری متجسس و مشتاق رہتا ہے کہ اب کیا دیکھنے، جاننے کو ملے گا!

فرخ سہیل ان تین ممالک میں جس قصبے، مقام، شہر سے گزرے ہیں اس کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے، اس ملک کے ماضی اور حال کا ذکر کیا ہے، وہاں کی تہذیب کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ جس شہر میں گئے وہاں کے تاریخی و ثقافتی مقامات، بازاروں، مزارات، اپنی قیام گاہوں، سفر کے دوران ملنے والے افراد کا بیان اس طرح کیا ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا پڑھنے والا بھی ’’جہاں گرد‘‘ کے ساتھ ساتھ ہے۔

اس ضخیم کتاب کی قیمت ہے 1380 روپے۔ اس کی اشاعت کا اہتمام کیا ریما عبداللہ گوئندی نے، سرورق تیار کیا ہے مصباح سرفراز نے۔ ناشر ہے ’’جمہوری پبلی کیشنز (2۔ ایوان تجارت روڈ۔ لاہور)‘‘۔

# ’’کوہِ قاف کی چوٹیاں‘‘ بشیر سدّوزئی کا سفرنامۂ آذربائیجان

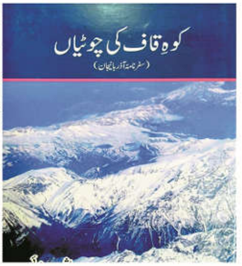


بشیر سدّوزئی، کراچی شہر کے سماجی حلقے کی جانی پہچانی شخصیت ہیں، معروف لکھاری ہیں۔ بلدیہ کراچی سے طویل وابستگی رہی ہے، کراچی آرٹس کونسل میں بہت فعال ہیں۔ زیرتذکرہ کتاب سے پہلے اُن کی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کے نام یہ ہیں:

پونچھ: جہاں سَروں کی فصل کٹی، کشمیر کے مجاہد، زلزلے سے پہلے اور بعد، برہان وانی شہید، تقدیرِ کشمیر، بلدیہ کراچی، سال بہ سال 1844 تا 1979۔

زیرتذکرہ کتاب بشیر سدّوزئی کا ’’سفرنامۂ آذربائیجان‘‘ ہے جو 212 صفحات پہ مشتمل ہے۔ اس کی قیمت ہے 800 روپے، اسے شائع کیا ہے ’’فرید پبلشرز (12۔ مبارک محل، اُردو بازار، کراچی) نے۔

تعارفی سطریں ملاحظہ ہوں ’’یہ سطور لکھتے وقت میں آذربائیجان کے پہاڑی سلسلے قفقاز میں ہوں جسے عرفِ عام میں کوہ قاف کہا جاتا ہے۔ جی ہاں۔ یہ وہی کوہ قاف ہے جسے صوفی شاعر میاں محمد بخش نے ’داستان سیف الملوک‘ میں نمایاں

کیا ہے۔ میں اچانک یہاں نہیں پہنچا۔ میں نے پورا پروگرام ترتیب دیا تھا اور میرے ساتھ کئی اور ہم سفر بھی ہیں۔
سر دست ہم آپ کو اپنے ساتھ آذربائیجان لے چلتے ہیں تاکہ ہجوم اور نعرے بازی کے ماحول سے کچھ دیر کے لیے آپ بھی جسمانی نہ سہی ذہنی طور پر ہمارے ساتھ کھلی فضا میں باہر نکلیں۔''
کراچی سے براستہ دبئی، باکو ایئرپورٹ پہنچنا، پھر آذربائیجان کی مختلف مقامات کی سَیر، ساتھ ہی تاریخ کا سفر، ثقافتی پس منظر۔ یہ سارا بیان دلچسپ، معلوماتی ہے۔ وہاں کا طرزِ زندگی، رسوم و رواج، کاروبار، تفریحی سرگرمیاں' یہ سب پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے گویا ہم بھی سفر میں ہیں۔ سفر نامہ نگار جہاں جہاں جا رہے ہیں وہاں کا بیان اس طرح کیا ہے کہ جزئیات کو بھی نظر میں رکھا ہے۔ اندازِ بیان پُر لطف ہے اور قاری کو کہیں کوفت نہیں ہوتی۔ آذربائیجان کے بارے میں معلومات کا خزانہ اس سفر نامے میں موجود ہے۔
کتاب کے ابتدائی صفحات پر رونق حیات و خالد معین صاحبان کی آراء درج کی گئی ہیں۔

## ''گ سے گڑیاج سے جاپانی'' ڈاکٹر محمد کامران کا سفر نامۂ جاپان

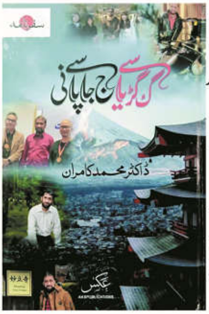


''میرا یہ سفر دراصل تلاش ذات کا سفر ہے، جس میں، میں نے جذبوں کی رنگی مٹی میں اپنا آپ گوندھ کر پیش کر دیا ہے۔ 'گ سے گڑیاج سے جاپانی' میری روح کے کینوس پر اترنے والے دھنک رنگوں کی داستان ہے۔ میرے ان خوابوں کا بیان ہے جو میں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھے۔ ان لمحوں کا گوشوارہ ہے جو میں نے جاپان میں بسر کیے۔ مجموعی طور پر مجھے تین بار جاپان جانے کا موقع ملا۔ پہلی بار مسافر تنہا تھا اس لیے سفر نامہ 'گ سے گڑیاج سے جاپانی' منصہ شہود پر آ گیا۔ مگر دوسری بار اور تیسری بار اہلیہ صائمہ کامران ہمراہ تھیں، اس لیے صرف 'سفر' کیا اور سفر کی یادداشتوں کے حوالے سے راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔''
زیر تذکرہ سفر نامے کے بارے میں سفر نامہ نگار کی تعارفی تحریر سے چند سطریں بطور اقتباس ہم نے یہاں پیش کر دی ہیں۔ ڈاکٹر محمد کامران کے سفر نامے کو خود میں سموئے یہ کتاب 168 صفحات پہ مشتمل ہے جسے ''عکس پبلی کیشنز'' (گراؤنڈ فلور، مین چیمبرز۔3، ٹیمپل روڈ، لاہور) نے شائع کیا ہے اور قیمت ہے ہزار روپے۔
کتاب کے ابتدائی ڈھائی صفحات، پروفیسر صابر لودھی کی رائے پہ مشتمل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''یہ ڈاکٹر محمد کامران کے مختصر سفر کی لذیذ داستان ہے۔ یہ ایک ایسا منفرد سفر نامہ ہے جس میں سفر نامہ کی جملہ خصوصیات موجود ہیں۔ مزید برآں اس کے شاعرانہ اسلوب کی دل نشینی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس سفر نامے کی بنیادی خوبی تو جاپان کے شہروں، بازاروں، تعلیمی اداروں اور شبستانوں سے اپنے قارئین کو متعارف کرانا ہے۔ اہم مراکز، تعلیمی اداروں، ہوٹل، بازار، شاپنگ مال کی تصویریں اپنے لفظوں سے کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ جاپانیوں کی تہذیب و تمدن، ان کا مزاج، ان کے مشاغل، ان کے سوچنے کے انداز کا مطالعہ، ڈاکٹر کامران نے بڑی باریک بینی سے کیا ہے۔''
ڈاکٹر محمد کامران نے لاہور سے بنکاک اور وہاں سے ٹوکیو پہنچنے کے بعد، جن مقامات کی سَیر کی، جو اُن کے مشاہدے میں آیا اُس کا بیان دلچسپ اور لطیف انداز سے کیا ہے۔ اشعار کو بھی اپنے بیان میں خوب صورت انداز سے ٹانکا ہے۔ سفر نامے پڑھنے کا لطف یہی ہے کہ گھر بیٹھے سفر کر لیا جاتا ہے۔ تو کیوں نا ڈاکٹر کامران کے توسط سے یہ سفر کیا جائے!

## ''استنبول میں آٹھ دن'' سید عزیز الرحمٰن کا سفر نامہ

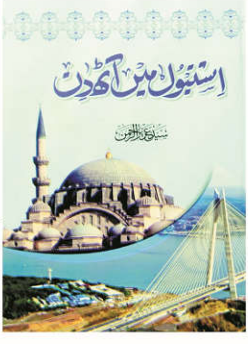


سید عزیز الرحمٰن نے ترکی کے شہر استنبول میں آٹھ دن گزارے۔ اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ''یہ سفر کیسے شروع ہوا، اس کے ہم راہی کون کون تھے، سفر میں کتنے پڑاؤ آئے، دوران سفر کہاں کہاں جانے کا موقع ملا، سفر میں کیا کچھ دیکھا، کہاں کہاں گھومے، کیا کھایا، کیا پیا۔ یہ سب اسی سفر نامے کا حصہ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ کسی سفر نامے کے بنیادی اجزاء یہی ہوتے ہیں۔ ہم نے یہاں یہ کوشش بھی کہاں کی ہے کہ جن تاریخی مقامات سے گزر ہو، وہاں کی کچھ تفصیلات اور ان مقامات کی کچھ تاریخ بھی درج کر دی جائے، لیکن اس سفر نامے کا اسلوب ایسا رکھا گیا ہے کہ معلومات سفر نامے کی روانی کو بوجھل کرنے کا سبب نہ بن سکیں، اس لیے معلومات کو معلومات کی حد تک رکھا گیا ہے اور سفر نامے کو اپنی اسی حیثیت میں برقرار رکھنے کی کوشش بھی کی گئی ہے تاکہ یہ سفر نامہ سفر نامہ ہی رہے، تاریخ کی کتاب نہ بن سکے۔
یہ سفر نامہ ہمارے کسی بھی بیرون ملک سفر کا دوسرا سفر نامہ ہے، اس سے قبل 'حرمین کرونا کے بعد' کے عنوان سے ہم 2022 میں اپنے سفرِ حرمین کی رُوداد قلم بند کر چکے ہیں (جو کتابی شکل میں چھپ چکی ہے)۔''
اپنے سفر نامے کے آخری صفحات پر عزیز الرحمٰن نے ''ترکی میں ہم نے کیا دیکھا'' کے عنوان سے اپنے تاثرات درج کیے ہیں۔
زیر تذکرہ کتاب 224 صفحات پہ مشتمل ہے۔ اس کی قیمت درج نہیں۔ تقسیم کار کے طور ''زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز'' (ناظم آباد نمبر 4۔ کراچی) کا نام کتاب پر درج ہے۔

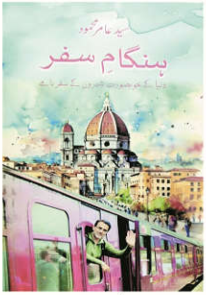


# ”ہنگامِ سفر“ سید عامر محمود کے سفرنامے

سید عامر محمود ’غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ‘ کے ایگزیکٹوڈائریکٹر ہیں۔حکومت پاکستان نے تعلیم سے محروم طبقات کی ترقی و بہتری کی خاطر ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں ”تمغۂ امتیاز“ سے نوازا ہے۔

زیرتذکرہ کتاب کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ ”سفر سے متعلق یہ تحریریں بنیادی طور پر فیس بک کے لیے لکھی گئی تھیں۔ میں سفرنامہ لکھنے کی نیت سے ان جگہوں پر نہیں گیا اور نہ ہی تفصیلی نوٹس لینے کی کوئی ضرورت محسوس کی۔ اس لیے یادداشت میں جو تصویر بنی وہ آپ کے سامنے پیش کردی ہے۔کوشش یہ تھی کہ تحریر مختصر ہو، شہر کی اجمالی تصویر الفاظ میں قارئین کے سامنے رکھ دی جائے۔“

کتاب کے ابتدائی صفحات پر خالد مسعود خان اور فرخ سہیل کے آراء درج ہیں۔مختلف ممالک کے تقریباً 18 شہروں کے حوالے سے اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔کسی شہر کے بارے میں تین صفحات ہیں تو کسی کے بارے میں آٹھ صفحات ہیں۔ 174 صفحات پہ مشتمل اس کتاب کی قیمت 900 روپے ہے۔اسے ”جمہوری پبلی کیشنز“ (2۔ایوانِ تجارت روڈ، لاہور) نے شائع کیا ہے۔

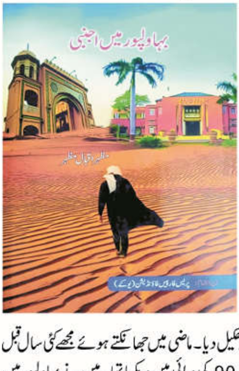


# ”بہاولپور میں اجنبی“ مظہر اقبال مظفر کا سفرنامہ

اس کتاب کا ذکر ہم، ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی (افسانہ وناول نگار، مدیر ’دیدبان، نئی دہلی) کی رائے سے منتخبہ سطروں سے کریں گے:

”سفرنامہ وہ بیانیہ ہے جسے باذوق مسافر سفر کے دوران یا منزل پر پہنچ کر اپنے تجربات اور مشاہدات کی مدد سے تحریر کا جامہ پہناتا ہے اور راہ میں پیش آنے والے اپنے تحیّر، استعجاب اور اضطراب کو اس طرح سے قلم بند کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے نہ صرف مع تفصیل تصویر آجاتی ہے بلکہ اس مقام سے متعلق تمام معلومات مع تفصیل اس کے علم اور آگہی میں اضافہ کردیتے ہیں۔وقت کے ساتھ یہ روایت اتنی مضبوط ہوئی کہ فکشن میں بھی اس کے اثرات دکھتے ہیں۔اس پس منظر میں مظہر اقبال مظہر کی ’بہاولپور میں اجنبی‘ سوانح کا رنگ لیے ہوئے سفرنامہ، اُردو ادب میں ایک نیا اضافہ ہے۔ یہ سفرنامہ قابلِ ستائش اور بہت سے مابعد سفرنامہ نگاروں کے لیے لائقِ رشک ہے۔“

راولاکوٹ آزاد کشمیر سے معروف مصنّف و معلم جاوید خان کا کہنا ہے کہ ”بہاولپور کے سفر میں مصنّف اپنے وطن کو ساتھ لیے پھرتا ہے۔“

مظہر اقبال مظہر 2011 میں برطانیہ منتقل ہوگئے۔وہ اپنی اس کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ”لاک ڈاؤن کی طویل بندشوں اور پابندیوں نے مجھے ماضی میں دھکیل دیا۔ ماضی میں جھانکتے ہوئے مجھے کئی سال قبل بہاولپور میں گزرے ہوئے دن یاد آئے تو اس حوالے سے ایک تاثراتی تحریر لکھنا شروع کردی۔ آج کا بہاولپور اس بہاولپور سے بہت آگے نکل چکا ہے جو میں نے 90 کی دہائی میں دیکھا تھا۔ میں نے بہاولپور میں گزرے شب و روز کو یادوں کے سہارے کریدنا شروع کیا تو جہاں کئی مقامات، واقعات اور شخصیات سے جڑی تفصیلات کو آج بھی بالکل تروتازہ پایا وہیں کچھ چیزوں کا نقشہ بالکل مبہم اور غیر واضح تھا۔اسی لیے ممکن ہے کچھ مشہور جگہوں، تاریخی مقامات اور راستوں کی تفصیلات لکھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔جس کے لیے میں پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔“

”بہاولپور میں اجنبی“ کے صفحات ہیں 119۔ قیمت ہے 500 روپے۔اسے شائع کیا ہے ”پریس فار پیس فاؤنڈیشن“ (برطانیا) نے۔کتاب کا سرورق سید ابرار گردیزی نے بنایا ہے۔

بہاولپور کی سیر میں شہرگردی براستہ فرید گیٹ، اندرون بہاولپور، سرائیکی زبان کی جلترنگ، مرکزی لائبریری اور میوزیم، جامع مسجد الصادق، چوک فوارہ، بہاول وکٹوریہ اسپتال اور میڈیکل کالج، بہاولپور کا تہذیبی ورثہ، جامعہ اسلامیہ اور دیگر مقامات کا احوال ہے۔پھر صفحہ 86 سے صفحہ 199 تک، مظہر اقبال مظہر نے اپنے دو افسانے ’دل مندر، ایک بوند پانی‘ بھی کتاب میں شامل کیے ہیں۔

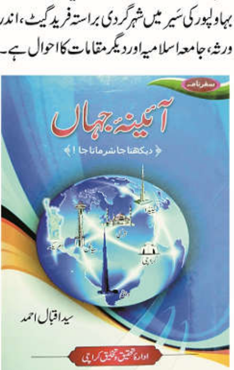


# ”آئینہ جہاں“
## سید اقبال احمد کا سفرنامہ

سید اقبال احمد، آرکیٹیکچر ہیں، جز وقتی صحافت بھی کی ہے۔ کے ڈی اے ٹاؤن پلاننگ اور سعودی عرب میں کئی اداروں سے وابستگی رہی ہے۔ زیرتذکرہ کتاب ”آئینہ جہاں“ میں انہوں نے استنبول، قونیہ، سیاٹیل امریکا، ٹورنٹو، شکاگو اور دبئی کے اپنے سفر کا بیان کیا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ ”یہ عام سفرنامہ نہیں ہے جس میں صرف شخصی واقعات اور فرضی، رومانوی داستان طرازی کی گئی ہو۔ بلکہ مسافر جہاں جہاں بھی گیا ہے اس علاقے اور شہروں کی پوری تاریخ، زمانہ ماضی سے لے کر زمانہ حال تک تحقیقی انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس سفرنامہ کا مقصد صرف سیر وتفریح ہی نہیں بلکہ اس کے پیچھے چھپے اس درد وغم کی تصویر کشی بھی تھا جو رہ رہ کر سینے میں اٹھتا ہے اور اپنی شدت کا احساس دلاتا رہتا ہے۔“

یہ کتاب 156 صفحات پہ مشتمل ہے۔ اور قیمت ہے 500 روپے۔ ”ادارۂ تحقیق وتخلیق“ (C-87/1 یونٹ۔G-2۔ بلاک 14۔ گلستان جوہر۔ کراچی) کے زیر اہتمام اس کتاب کا ناشر ہے ”گرافکس اِن“ (اُردو بازار۔ کراچی)

---

# ”زندگی تمہی سے ہے“ نادیہ سحر کا شعری مجموعہ

تمہیں خبر ہی نہیں تم مرے لیے کیا ہو
گھٹن شدید ہے اور تم ہوا کا جھونکا ہو

فائدہ ہے یہی بچھڑنے کا
پھر بچھڑنے کا ڈر نہیں رہتا

قربان کر دیے سبھی دل کے معاملات
بیٹی نے اپنے باپ کی دستار دیکھ کر

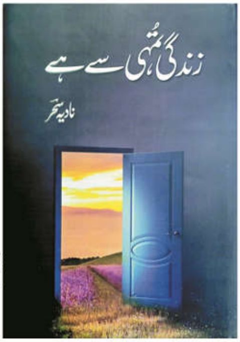

قارئینِ کرام! آپ نے اشعار ملاحظہ کیے۔ نادیہ سحر کا پہلا شعری مجموعہ اس وقت زیر تذکرہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوا۔ 176 صفحات پہ مشتمل ہے۔ اس میں دُعا، نعت، سلام حسینؓ، چار نظمیں اور پچھتر غزلیں ہیں۔

کتاب کے پس ورق پر معروف شاعر سلیم کوثر نے نادیہ سحر کی شاعری کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”نادیہ سحر ایک خوب صورت خیالوں کی شعری بُنت کرتی ہوئی شاعرہ ہے۔ وہ اپنی روشن زندگی کے بے بہا موسموں کی شعری وارفتگی میں بیان کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ نادیہ سحر کے مجموعۂ کلام میں ایک نئی دنیا کے موسم کی خوشبو کا سراغ ملتا ہے جو اس شاعرہ کے لیے دعاؤں سے سرشتہ ایک یقین سے جا ملتا ہے کہ یہی ہنرمندی شاعری کا آبرو مندانہ رجحان ہے۔“

اک بھرم تھا سو وہ بھی ٹوٹ گیا
کیا ملا تجھ کو آزمانے میں

جو تم نے کیا اس طرح ہونا تو نہیں تھا
دل میرا مری جان کھلونا تو نہیں تھا

معروف شاعر فرحت عباس شاہ کا کہنا ہے کہ ”نادیہ سحر کی شاعری درد کی کوکھ سے نکلا ہوا ایسا نغمہ ہے جو دلوں کو چھونے اور احساس کو تمازت بخشنے کی طاقت رکھتا ہے۔ شاعری نادیہ کا شوق نہیں اس کی ضرورت اور اس کے دُکھ کا علاج ہے۔ اس کی شاعری کسی بھی طرح کی بناوٹ اور تصنع سے پاک ہے۔ زیر نظر شعری مجموعہ ہماری معاصر شاعری میں ایک پاکیزہ اضافہ ہے۔“

اپنی شاعری کے حوالے سے نادیہ سحر کہتی ہیں کہ ”میں نے زندگی کو جیسے دیکھا، جیسے سمجھا، جیسے جانا اور جو میرے ساتھ اس کی نسبت ہے، اس سے پیدا ہونے والے تعلق سے میرے اندر جن جذبوں نے جنم لیا، اس کے نتیجے میں آپ کے سامنے ہے۔ شاعری میری روح کے آنگن میں کھلنے والا وہ دریچہ ہے جو مجھے زندگی کا احساس دلاتا ہے۔ اس دریچے کے باہر ایک نئی دنیا ہے جہاں دور دور تک پھولوں کے ساتھ کرب کے کانٹے بھی آگے بڑھ کر میرا دامن تھام لیا کرتے ہیں۔ ان راہوں پر چلتے چلتے میں بہت دور نکل جایا کرتی ہوں، جو مجھے کسی اور ہی دنیا میں لے جاتی ہیں۔ جہاں صرف میں اور میرے لفظ ہوتے ہیں۔“

ہواؤ اُن سے ملاقات ہو تو کہہ دینا
بچھڑ کے تم سے کوئی دل نڈھال رہتا ہے

میرے کس کام کا وہ پچھتاوا
جو مرے بعد تجھ کو ہونا ہے

ہجر، دکھ، درد، تڑپ لیے اشعار بہت پاکیزگی سے کہے گئے ہیں۔ نفاست و نزاکت ان اشعار کا خاصہ ہے جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ اسے کتابی شکل دی ہے ”علم وعرفان پبلشرز“ (الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار۔ لاہور) نے اور قیمت مقرر کی ہے 700 روپے۔

سارا کلام تو یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا لیکن چلتے چلتے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

اُنا کی بات نہیں، دُکھ ہے اور گہرا ہے
ترے سلوک نے پتھر بنا دیا ہے مجھے

آئینے اور دل کے ربط سحر
بد سلوکی سے ٹوٹ جاتے ہیں

# بن احسان گرین سٹی کی طرف سے ماہنامہ 'اطراف' کے مستقل خریداروں کے لیے خصوصی رعائتی پیشکش

ماہنامہ 'اطراف' کے مستقل خریداروں کے لیے خوشخبری کہ کراچی کے قریب سپر ہائی وے پر واقع اس پُر فضا نئی بستی میں پلاٹ کی خریداری پر ابتدائی ادائیگی اور قسطوں میں خصوصی رعایت دی جائے گی۔ 'اطراف' کے قلمی معاونین کی ایک بڑی تعداد نے سپر ہائی وے پر اس زیر تعمیر بستی کا دورہ کیا۔

بن احسان گرین سٹی کے چیئرمین جناب فیصل احسان نے اپنے دفتر گلستانِ جوہر میں اپنے اس ہرے بھرے منصوبے کی تفصیلات سے 'اطراف' کے حلقۂ تحریر کو آگاہ کیا

'اطراف' کے خریداروں کے لیے خصوصی منصوبے کی تفصیلات۔ اور اس دورے کی رُوداد ان قلمکاروں کے قلم سے 'اطراف' اگست کے شمارے میں ملاحظہ کریں۔ تفصیلات کے لیے۔ واٹس ایپ: 0300-8210636

BUKHARI
CORPORATE • HOLIDAYS • MICE
"EXPLORING THE WORLD WITH BUKHARI HOLIDAYS, WHERE ADVENTURE AWAITS"
lets travel
WITH US WE OFFER :
DOMESTIC INTERNATIONAL - CRUISE - RAIL TOUR PACKAGES
Costa Smeralda
+92 300 020 2757 - 58
+92 300 020 2761 - 62
UAN +92 21 111 552 111
BUKHARIHOLIDAYS.PK
bukhari holidays

# کراچی ووکیشنل ٹریننگ سینٹر

PCP، STEVTA اور NAVTTC سے تصدیق شدہ۔

کے وی ٹی سی خصوصی افراد کے لئے کھیلوں کے جامع پروگرام، مختلف تھراپیز، تعلیمی پروگرام اور پیشہ ورانہ تربیت کے ذریعے ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا ہے جو بالآخر ان مستفید افراد کو روزگار کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اب تک بے شمار سابق خصوصی طلباء مختلف شعبوں وصنعتوں میں برسرروزگار ہیں۔

کے وی ٹی سی تمام خدمات بلامعاوضہ فراہم کرتا ہے

**Account For Donations**
Title: Karachi Vocational Training Centre
Bank: Bank Al-Habib Limited
Acc.#: 5003-0071-001600-01-5
IBAN: PK23 BAHL 5003 0071 0016 0001

**Account For Zakat**
Title: Karachi Vocational Training Centre
Bank: Bank Al-Habib Limited
Acc.#: 5003-0069-001600-01-1
IBAN: PK32 BAHL 5003 0069 0016 0001

خصوصی افراد کو
قابل بنانے میں
ہمارا ساتھ دیں

پلاٹ 10 کمرشل ایونیو، نزد امام بارگاہ، فیز 4 ڈی ایچ اے، کراچی۔ فون: 021-35382204

AL MASHWAN TRAVEL AND TOURS
From anywhere to anywhere
in the World
We are just a phone call away
021-34545100
0300 8220435
PLAN YOUR UMRAH NOW
JOURNEY OF THE HEART
PACKAGE INCLUDES
VISA | AIR TICKET | ACCOMODATION | GUIDES | GROUND
TRANSPORT | HISTORICAL SITES TOUR IN MAKKAH MUKARRAMA & MADINAH MUNAWARA
More information call / Whatsapp
+92 0300 8220406
+92 0300 8220407
BOOK NOW
almashwan
Address:
Plot No136 Muslim Colony, Shahrah-e-Faisal Rd, near FTC Building, Block B Sindhi Muslim CHS (SMCHS), karachi, Sindh 75350.

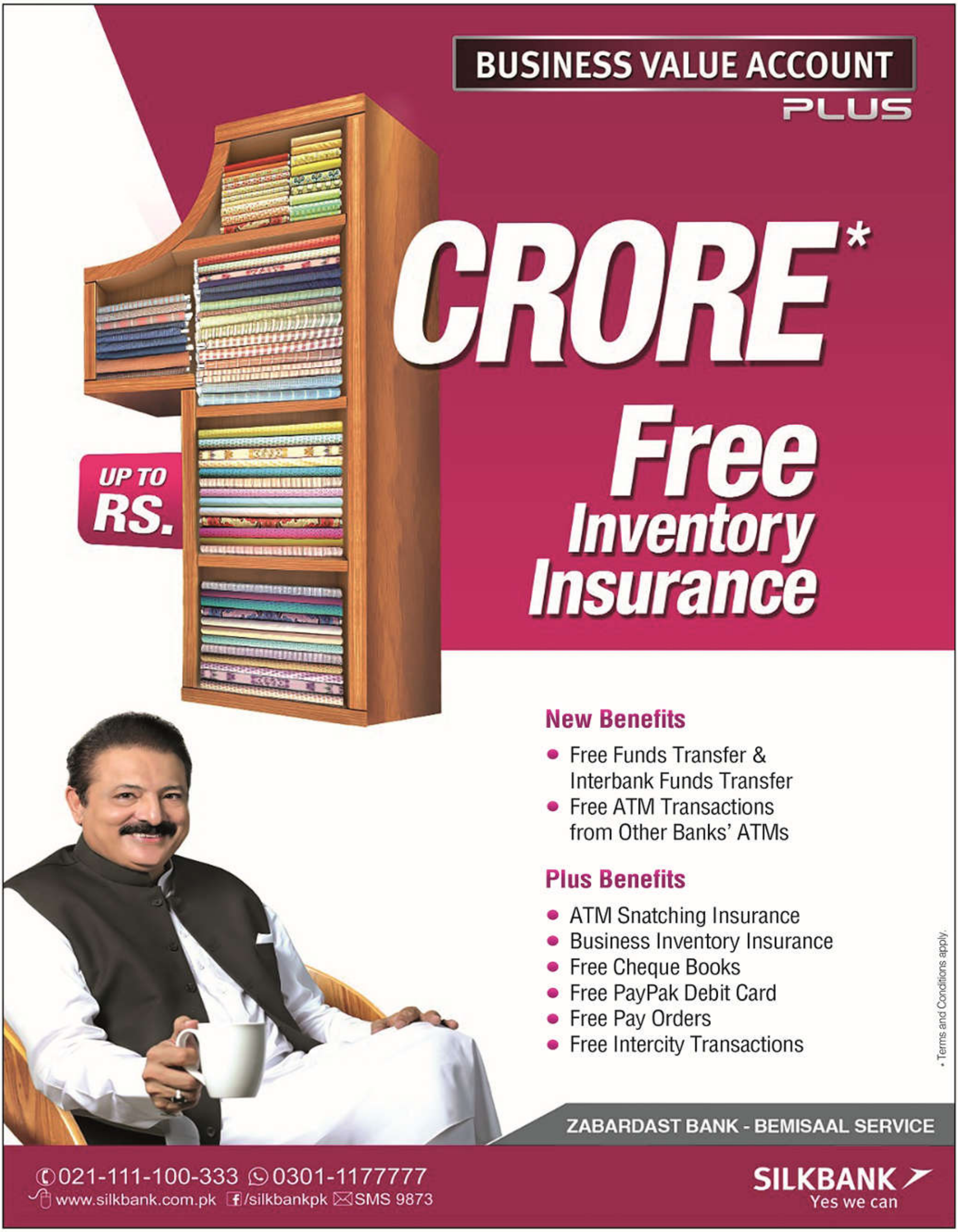
BUSINESS VALUE ACCOUNT
PLUS
UP TO RS. 1 CRORE*
Free Inventory Insurance
New Benefits
• Free Funds Transfer & Interbank Funds Transfer
• Free ATM Transactions from Other Banks' ATMs
Plus Benefits
• ATM Snatching Insurance
• Business Inventory Insurance
• Free Cheque Books
• Free PayPak Debit Card
• Free Pay Orders
• Free Intercity Transactions
* Terms and Conditions apply.
ZABARDAST BANK - BEMISAAL SERVICE
021-111-100-333 0301-1177777
www.silkbank.com.pk /silkbankpk SMS 9873
SILKBANK
Yes we can

Bridging Extremes
Monthly "ATRAAF" Karachi
July 2024
Regd No. MC - 1398 ☎ 0300-8210636 ✉ www.Atraafmagazine.com

BIN AHSAN
Builders & Developers

# BIN AHSAN GREEN CITY PHASE-I

PROJECT OF BIN AHSAN BUILDERS AND DEVELOPERS

اعتماد کی دنیا میں بڑا نام بن احسان

بن احسان گرین سٹی میں ترقیاتی کاموں کا آغاز ہو چکا ہے، 120 گز کے پلاٹ پر خصوصی رعایت
کے لیے رابطہ کریں اور آج ہی اپنا پلاٹ بک کرائیں۔ اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ بنائیں۔

A PIECE OF LAND
THAT EVERYONE CAN AFFORD !

MEMBER OF: abad

Universal Account Number : 03-111-155-530

www.binahsanbuildersanddevelopers.com

HEAD OFFICE LOCATION : OFFICE # 59,60 1ST FLOOR JABL-E-REHMAT TOWER ,GULISTAN-E-JAUHAR BLOCK 16A